تذکرۃ المحدثین

جلد اوّل

مُرتّبہ

مولوی ضیاءُ الدین اصلاحی

نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد
لاہور - راولپنڈی - ملتان - کراچی - سکھر - پشاور - کوئٹہ

DATA ENTER

جملہ حقوق محفوظ

یہ کتاب نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان نے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے پاکستان کے لئے جملہ حقوق حاصل کر کے شائع کی۔

طبع : اوّل ۱۹۸۹ء۔

کوڈ نمبر : ڈی ایم آر پی / ۱۱۹۴۔

این بی ایف اشاعت ۱۹۸۹ء

مطبع : شکیل پرنٹنگ پریس

فاطمہ منزل۔ آرام باغ۔ کراچی

فہرست اسماء

تذکرۃ المحدثین

جلد اوّل

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
عرض ناشر	ج	امام سعید بن منصورؒ	٦٧
مقدمہ از جناب مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم دارالمصنفین	٥	امام محمد بن صباح دولابیؒ	٧١
		امام یحییٰ بن عبدالحمید حمانیؒ	٧٣
امام مالکؒ	١٠	امام مسدد بن مسرہدؒ	٧٧
امام ابوداؤد طیالسیؒ	٣٢	امام نعیم بن حماد خزاعیؒ	٨٠
امام عبدالرزاقؒ بن ہمام	٥٠	امام عبداللہ بن محمد جعفیؒ	٨٣
امام اسدؒ بن موسیٰ	٥٥	امام ابوبکر بن ابی شیبہؒ	٨٥
امام عبیداللہ بن	٥٨	امام اسحاق بن راہویہؒ	٩٠
امام عبداللہ بن زبیر حمیدی	٦٢	امام احمد بن حنبلؒ	١٠١

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
امام محمد بن یحییٰ عدنیؒ	۱۵۰	امام حارث بن ابی اسامہؒ	۲۹۶
امام عبد بن حمیدؒ	۱۵۳	امام احمد بن ابی عاصم النبیلؒ	۳۰۱
امام اسحاق بن بہلولؒ	۱۵۶	امام ابوبکر بزارؒ	۳۰۵
امام عبداللہ دارمیؒ	۱۵۹	امام ابومسلم کشیؒ	۳۰۹
امام بخاریؒ	۱۷۰	امام محمد بن نصر مروزیؒ	۳۱۳
امام ابومسعود رازیؒ	۱۹۰	امام ابومحمد بن جارودؒ	۳۱۹
امام مسلم	۱۹۴	امام ابوعبدالرحمٰن نسائیؒ	۳۲۱
امام ابن ماجہؒ	۲۲۰	امام ابویعلیٰ موصلیؒ	۳۲۸
امام ابوداؤد سجستانیؒ	۲۳۶	امام ابن خزیمہؒ	۳۴۲
امام بقی بن مخلدؒ	۲۶۶	امام ابوعوانہ اسفرائنیؒ	۳۵۳
امام ترمذیؒ	۲۷۳	امام ابوجعفر طحاویؒ	۳۵۸

عرضِ ناشر

یہ امر یقیناً قارئین کرام اور عوام الناس کے لئے باعثِ مسرت و شادمانی ہوگا کہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد (پاکستان) نے دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (بھارت) سے ان کی مشہور و معروف شائع کردہ ایک سو سولہ کتابوں کے حقوق طباعت و اشاعت، پاکستان کے لئے حاصل کر لئے ہیں۔ تحریری معاہدہ کے مطابق، پاکستان میں صرف نیشنل بک فاؤنڈیشن ہی ایک ایسا قومی ادارہ ہے جو ان کتب کو شائع کرنے کا قانونی حق رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام کتابیں جو کسی اور فرد یا ادارہ نے طبع کی ہوں اور فروخت کر رہا ہو یا کر رہے ہوں، ان کی حیثیت جعلی ایڈیشن کی ہے۔ ایسے افراد یا اداروں کے خلاف قانونی کارروائی حسب ضابطہ عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

زیر نظر کتاب، تاریخ تدوینِ حدیث کے موضوع پہ اُردو زبان میں لکھی جانے والی مستند کتاب ہے جس کا مطالعہ طلبہ تاریخ تدوینِ حدیث اور عام مسلمانوں کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے اسلاف نے مکمل طور پر چھان بین کرنے کے بعد اصل احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجتمع و مرتب کیا۔ انہیں جن احادیث کی صحت کے بارے میں ذرہ برابر بھی شک ہو جاتا، اس کی مکمل تحقیق کرتے۔ شک رفع ہونے کی صورت میں نقل و روایت کرتے، بصورت دیگر جھوٹی اور گھڑی ہوئی حدیث کو نہ صرف نقل کرتے بلکہ اس کے غلط ہونے کی تشہیر بھی کرتے تاکہ عام لوگ بھی جھوٹی حدیثوں کی نقل اور روایت

سے پرہیز کریں۔ ہمارے اسلاف کے متقی و مدین علمائے احادیث کی انتھک کاوشوں کا یہ ثمرہ ہے کہ آج ہزاروں صحیح احادیث کتابی شکل میں، ہم تک مکمل صحت کے ساتھ پہنچ گئی ہیں جن پر ہم عمل کر کے دنیا و آخرت کی فلاح حاصل کر سکتے ہیں۔

ہمیں قوی امید ہے کہ مذہبی حلقے اور عام مسلمان، ہماری اس اشاعت کو پسند کریں گے۔

محمد محسن
ناظم اعلیٰ

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

کلام مجید اگرچہ ایک واضح اور کھلی ہوئی کتاب ہے، اس میں کوئی غموض وخفا نہیں ہے لیکن اس میں اسلام کی تعلیمات کی پوری تفصیل اور تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے بہت سے احکام مجمل یا کلیات کی شکل میں ہیں جن کی وضاحت وتشریح اور کلیات سے جزئیات کی تفریع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے فرمائی۔ آپ کا کام محض کلام الٰہی کو لوگوں تک پہنچا دینا نہیں تھا، بلکہ اس کی تبیین وتشریح بھی تھی۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔

(النحل۔ ۶)

اور ہم نے تمہاری طرف نصیحت (قرآن مجید) اتاری تاکہ لوگوں کے لئے جو اتارا گیا ہے اس کو ان سے کھول کر بیان کرو، شاید وہ اس پر غور وفکر کریں۔

ایک دوسری آیت میں ہے،

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔

(نحل۔ ۸)

اور ہم نے تم پر اس لئے کتاب اتاری ہے کہ تم ان کے لئے ان چیزوں کی وضاحت کرو جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور اس کو ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت ورحمت بنا کر اتارا۔

یہ تبیین وتشریح آپ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اس فہم یا ملکۂ نبوت کی رہنمائی سے کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ

Marfat.com

نے آپ میں ودیعت کیا تھا۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ۔ (نساء - ١٦)	اور ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ تم لوگوں کے درمیان جس طرح تم کو خدا نے سمجھایا ہے اس طرح فیصلہ کرو۔

اس "اراءت" سے مراد فہم نبوت ہے اس آیت میں اگرچہ صرف فیصلہ کا ذکر ہے، لیکن اس میں آپ کے تمام احکام داخل ہیں، اس لئے کہ آپ جو تعلیم اور جو حکم بھی دیں گے وہ ایک طرح کا فیصلہ ہی ہوگا۔

آپ جو کچھ بھی کہتے تھے یا جو حکم بھی دیتے تھے وہ درحقیقت ایک قسم کی وحی ہوتی تھی جس کو اصطلاح میں وحی خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (نجم - ١)	رسول اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔

اس لئے آپ کے تمام احکام واجب التعمیل ہیں، اس فہم نبوت اور وحی سے مستنبط احکام کو قرآن مجید نے حکمت سے تعبیر کیا ہے۔

وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا۔ (نساء - ١٧)	اور تم پر کتاب و حکمت اتاری اور تم کو وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے، اور یہ تم پر خدا کا بڑا فضل تھا۔

مسلمانوں پر خدا نے یہ احسان جتایا ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ۔ (بقرہ - ٢٩)	اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم پر کتاب و حکمت اتاری جس کے ذریعے وہ تم کو نصیحت کرتا ہے۔

دوسری آیت میں ہے:۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا	وہی اللہ ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی

Marfat.com

مِنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (جمعہ - ۱)

میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے، اور اس سے پہلے وہ گمراہی میں مبتلا تھے۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ صرف آیات قرآنی کی تلاوت وتبلیغ نہیں بلکہ مسلمانوں کی تعلیم وتزکیہ بھی تھا، اور آپ ان کو کتاب اللہ کے ساتھ حکمت کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ یہ حکمت اگرچہ قرآن مجید اور وحی خفی سے ماخوذ ہے، مگر اس سے الگ چیز ہے، اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال ہیں، اس لئے کتاب کے ساتھ وہ بھی مسلمانوں کے لئے واجب العمل ہے، آپ کی ذات اور آپ کا ہر قول وفعل مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل تھا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب - ۳)

لوگو تمہارے لئے رسول کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

اس لئے قرآن مجید میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول کی اطاعت کی بھی تاکید ہے، اور بہت سی آیات میں اطیعوا اللّٰہ کے ساتھ ساتھ اطیعوا الرّسول کا بھی حکم ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (آل عمران - ۱۴)

اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (محمد - ۴)

مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔ (مائدہ - ۱۲)

اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ڈرو پھر اگر تم روگردانی کروگے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف پوری تبلیغ ہے۔ (یعنی اس کو منوانے کی ذمہ داری

اس پر نہیں ہے)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ (انفال - ۲)

اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو، حالانکہ تم سنتے ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ اطاعت نام ہے کسی حکم کی تعمیل یا کسی عمل کی تقلید کا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دیں اس کی تعمیل اور جس چیز پر عمل کریں اس پر عمل کیا جائے، اسی کا نام حدیث وسنت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت رسول کے اتباع پر موقوف ہے، اور اس کا صلہ بندوں سے اللہ کی محبت اور مغفرت ہے۔

قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (آل عمران - ۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

رسول کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے اور رسول کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ[1]

- جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔

اطاعت کے ان احکام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ تمام اقوال وافعال داخل ہیں جو آپ نے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں ارشاد فرمائے یا ان پر عمل کیا، اس لئے کتاب اللہ کے بعد ان کی حیثیت بھی قانون کی ہے اور وہ مسلمانوں کے لئے کتاب اللہ ہی کی طرح واجب العمل ہیں۔ کلام مجید میں ارشاد ہے۔

---

[1] مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامیر فی غیر المعصیۃ وتحریمہا فی المعصیۃ [2] مسلم ج ۲ کتاب الفضائل باب توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

Marfat.com

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (احزاب۔ ۵)	اور کسی مسلمان مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ان کے کسی معاملہ میں فیصلہ کر دے تو اس میں اس کو چوں وچرا کا اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں ہے۔

"امر" میں آپ کے تمام احکام داخل ہیں۔ جس کی وضاحت احادیث سے ہوتی ہے مسلم میں ہے۔

ما نهيتكم عنه فاجتنبوه وما امرتكم به فافعلوه۔	میں جس چیز سے تم کو منع کر دوں اس سے رک جاؤ اور جس چیز کا حکم دوں اس کو اختیار کرو۔

ایک دوسری حدیث میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ہے۔

"وہ زمانہ قریب ہے کہ کسی آدمی سے جب وہ اپنے پُرتکلف تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا ہوگا، میری کوئی حدیث بیان کی جائے گی تو وہ کہے گا کہ ہمارے درمیان اللہ عزوجل کی کتاب موجود ہے ہم اس میں جو چیز حلال پائیں گے اس کو حلال سمجھیں گے اور جو چیز حرام پائیں گے اس کو حرام سمجھیں گے۔ ایسے لوگوں کو آگاہ ہونا چاہیئے کہ جس کو اللہ کے رسول نے حرام کیا ہے وہ بھی خدا کی حرام کی ہوئی چیز کی طرح حرام ہے۔" (سنن ابن ماجہ)

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے اقوال واعمال مسلمانوں کے لئے واجب العمل ہیں۔ اور جس طرح قرآن مجید کے اوامر ونواہی کا ماننا ان کے لئے ضروری ہے، اسی طرح رسول کے اوامر ونواہی کا بھی، اسی کا نام حدیث وسنت ہے، قول رسول کا نام حدیث ہے اور عمل متواتر کا سنت اور کلام مجید کے بعد اسی حدیث وسنت کا درجہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "تركت فيكم الثقلين كتاب الله وسنتي" میں نے تمہارے لئے دو بھاری چیزیں چھوڑی ہیں کتاب اللہ اور اپنی سنت، بلکہ اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت پر بھی عمل کا حکم دیا ہے "عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين" جن کی زندگی اتباع سنت کا نمونہ تھی۔

درحقیقت اسلام کی پوری عمارت قرآن مجید اور احادیث نبوی پر قائم ہے، وہ کلام مجید کی تفسیر بھی ہے اس کے اجمال کی تفصیل بھی، اس کے کلی احکام سے جزئیات کی تفریع بھی اور اسلام کے قرن اوّل کی تاریخ بھی، اس کے بغیر اسلام کی تعلیم اور اس کی ابتدائی تاریخ کے بہت سے اوراق سادہ رہ جاتے ہیں، اسلام کے ارکان اربعہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی احکام بھی نہیں معلوم ہو سکتے ہیں، اور نہ اس کو حدیث کی مدد کے بغیر ادا کیا جا سکتا ہے۔ ان کے صرف کلی احکام قرآن مجید میں ہیں، اس کی تفصیل حدیث و سنت سے معلوم ہوتی ہے، یہی حال اکثر اوامر و نواہی اور حلال و حرام کا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، اسلام کا ظہور، اس کی تبلیغ، اس راہ کی صعوبتیں، غزوات، اسلام کا غلبہ و اقتدار، حکومت الٰہیہ کا قیام، اس کا نظام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کی سیرت معلوم کرنے کا ذریعہ صرف حدیث ہے، اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو اسلام کی بہت سی تعلیمات اور تاریخ اسلام کے بہت سے گوشے مخفی رہ جائیں گے، اس لئے احادیث نبویؐ اسلام اور اسلامی تاریخ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں اور اس پر ان کی عمارت قائم ہے، اس لئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی روایت و اشاعت کا حکم دیا ہے اور مبلغ حدیث کے لئے دعا فرمائی ہے۔

نضر الله امرءا سمع منا حديثا فحفظه حتى يبلغه فرب حامل فقه الى من هو افقه منه و رب حامل فقه ليس بفقيه۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے ہم سے ایک حدیث سُنی، اس کو محفوظ رکھا اور اس کو دوسروں تک پہنچایا، کیونکہ بسا اوقات علم کا حامل اس کو ایسے شخص تک پہنچاتا ہے جو اس سے زیادہ سمجھدار ہوتا ہے اور وہ خود سمجھدار نہیں ہوتا۔)

(ابو داؤد جلد دوم کتاب العلم باب فضل نشر العلم)

(آپ نے حدیثوں کی کتابت کا بھی حکم دیا ہے، بعض لوگوں کے لئے حدیثیں لکھوائی ہیں،)

"حدثوا عنی ولا حرج" "اکتبوا لابی شاہ" حجۃ الوداع میں آپ نے جو خطبہ دیا تھا، جو اسلام کے بہت سے

Marfat.com

اساسی احکام پر مشتمل ہے، اس کو دوسروں تک پہنچانے کا عام حکم دیا تھا، چنانچہ حدیث کی ان تمام کتابوں میں جن میں اس خطبہ کا ذکر ہے۔ آپ کا ارشاد ہے[1] فلیبلغ الشاھد الغائب بھی ہے یعنی جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ اُن لوگوں تک ان احکام کو پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں، اسی کا نام روایت حدیث ہے۔

اس لئے عہد رسالت سے لے کر بعد کے ہر دور میں حدیث نبوی کی نقل و روایت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ حدیثیں پوری دنیائے اسلام میں بکھری ہوئی تھیں، محدثین کرام کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس زمانے میں جب کہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں۔ اور سفر ہم معنی سقر سمجھا جاتا تھا، اور نہ نشر و اشاعت کے موجودہ سامان تھے، تعلیم بھی محدود تھی، دنیائے اسلام کا چپہ چپہ چھان کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال یعنی حدیث سنت کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع و مرتب کیا، ان کے رد و قبول اور صحت و سقم کو جانچنے اور رواۃ کی جرح و تعدیل کے اصول بنائے، اصول حدیث کا مستقل فن ایجاد کیا۔ ہزاروں راویان حدیث کے حالات نہایت صحت و تحقیق کے ساتھ قلمبند کئے جو مسلمانوں کا بڑا قابلِ فخر کارنامہ ہے۔

اس لئے صاحب تصنیف محدثین کے حالات میں ایک کتاب کی تالیف عرصہ سے دارالمصنفین کے پیش نظر تھی، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالمصنفین کے قیام سے پہلے ہی امام بخاری اور امام مالک کے حالات الندوہ میں لکھ چکے تھے، امام مالک کے حالات بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیئے۔ مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم نے امام مسلم کے حالات اور راقم نے امام ترمذی کے حالات لکھے تھے، سید صاحب کی خواہش تھی کہ اس سلسلہ کو مکمل کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ مگر اس وقت یہ کام نہ ہو سکا۔ اب اس زمانہ میں جب کہ موجودہ دور کے مجتہدین، حدیث سے آزادی کے لئے اس کے پورے ذخیرہ کو مشکوک و ناقابل اعتبار قرار دینے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں، محدثین کرام کے حالات کو شائع کرنے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انہوں نے کس جانکاہ محنت سے اور کتنی تحقیق و احتیاط کے ساتھ حدیثوں کو جمع و مرتب کیا اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق و صحت کے مادی و عقلی معیار کے اعتبار سے بھی دنیا کا کوئی علمی ذخیرہ حدیث کی کتابوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

یہ کتاب دو جلدوں میں ہوگی، پہلی جلد میں امام زہری سے لے کر امام طحاوی تک یعنی دوسری صدی ہجری

1. اس قسم کے اور بھی ارشادات حدیث کی کتابوں میں ہیں ہم نے صرف مثالاً ایک نقل کئے ہیں۔

سے لے کر چوتھی صدی کے شروع تک (جو تدوین حدیث کا سب سے اہم دور ہے) کے محدثین اور ان کی تصانیف کے حالات ہیں (دوسری جلد میں اس کے بعد کے محدثین کے حالات ہوں گے۔)

اس حصہ میں امام بخاریؒ کے حالات سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلم کے ہیں، امام مالکؒ کے حالات حیات امام مالکؒ کی تلخیص ہے، امام مسلمؒ کے حالات مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم کے اور امام ترمذیؒ کے راقم کے تحریر کردہ ہیں، باقی محدثین کے حالات مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی نے لکھے ہیں، اس طرح یہ کتاب صاحب تصنیف محدثین کرام کا تذکرہ بھی ہے، تدوین حدیث کی تاریخ بھی، اور حدیث کی موجودہ کتابوں پر نقد و تبصرہ بھی، اللہ تعالیٰ اس کو نافع بنائے۔

معین الدین احمد ندوی
دار المصنفین اعظم گڑھ
۱۵ مارچ ۱۹۶۸ء

Marfat.com

امام مالکؒ

(المتوفی ۱۷۹ھ، ۷۹۵ء)

نام ونسب وولادت مالک نام، ابوعبداللہ کنیت، امام دارالہجرۃ لقب تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے۔
مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمر بن حارث بن غیمان بن جثیل بن عمرو ابن حارث ذی اصبح۔

امام مالک خالص عرب خاندان سے تھے جو جاہلیت اور اسلام دونوں میں معزز تھا، بزرگوں کا وطن یمن تھا مگر اسلام کے بعد مدینۃ النبیؐ میں سکونت اختیار کرلی تھی، نسباً یمن کے آخری خاندانِ شاہی یعنی حمیر کی شاخ "اصبح" سے تعلق رکھتے تھے، امام کے مورث اعلیٰ حارث اس خاندان کے شیخ تھے، اسی لئے ذی اصبح کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ کے خاندان میں سب سے پہلے آپ کے پر دادا ابوعامر عہد نبوی میں مشرف بہ اسلام ہوئے،

امام مالک کے دادا مالک بن ابی عامر جلیل القدر تابعی اور صحاح کے رواۃ میں داخل ہیں، حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کو یک گونہ اختصاص تھا، چنانچہ جن سربکف جواں مردوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کی لاش کو دشمنوں کے نرغہ سے اٹھاکر دفن کرنے کی خطرناک خدمت انجام دی تھی اُن میں سے ایک یہ بھی تھے، فن روایتِ حدیث میں ان کو حضرت عمرؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، عقیل بن ابی طالب، ابوہریرہؓ، ام المومنین حضرت عائشہؓ، و دیگر صحابہ کبار رضی اللہ عنہم سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ مدینہ کے مشہور فقیہہ سلیمان بن یسار اور خود مالک کے بیٹوں نے اور

لہ کتاب الانساب سمعانی۔

دوسروں نے مالک سے حدیث روایت کی ہے. موطا میں بھی ان کی روایات ہیں۔ امام نسائی نے ان کی توثیق کی ہے. ۱۸۰ھ میں وفات پائی۔

مالک بن ابی عامر کے تین بیٹے تھے، انس امام مالک کے والد بزرگوار، ربیع اور ابو سہیل نافع، ابو سہیل نافع ایک بلند پایہ محدث تھے، ثقات تابعین اور ارکانِ حدیث میں ان کا شمار ہے، امام مالک نے موطا میں ان سے روایت کی ہے۔

امام کے عم محترم ربیع اور والد ماجد انس بھی اپنے خاندان کی علمی وراثت سے محروم نہ تھے تاہم اس فن میں کوئی مخصوص پایہ نہیں رکھتے تھے اور نہ موطا میں امام نے ان سے کوئی روایت کی ہے[1]۔

امام مالک کی صحیح تاریخ ولادت ۹۳ھ ہے، کیونکہ یہ تاریخ امام کے شاگرد خاص یحییٰ ابن بکیر سے سند کے ساتھ مروی ہے، جو مدتوں امام کی صحبت میں رہے ہیں[2]۔

تعلیم و تربیت امام نے ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم کی آغوش میں پایا، خود ان کا گھر اور گھر سے باہر پورا شہر علماء اور فضلاء کا مخزن تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سینکڑوں صحابہ دور دراز مقامات میں نکل گئے تھے لیکن معدن سونا نکلنے کے بعد بھی معدن ہے، تمام اکابر صحابہ جو علوم شریعت کے امین اور قرآن و سنت کے خزینہ دار تھے اسی مقدس شہر میں سکونت پذیر تھے، عہد نبویؐ اور اس کے بعد بھی چوبیس پچیس برس تک پوری حکومت اسلامیہ کا یہ مرکز تھا، یہیں سے احکام و فتاوی فقہائے صحابہ کی مجلس میں طے ہو کر تمام دنیائے اسلام میں پھیلتے تھے۔

مدینہ کے فقہائے صحابہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور حضرت عائشہؓ جو اسرارِ شریعت کے راز دان تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ جن سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و سنن کا متبع اور واقف کار کوئی دوسرا نہ تھا، حضرت ابن عباسؓ جو حبر الامۃ تھے، حضرت ابوہریرہؓ جن سے بڑھ کر حدیث کا کوئی دوسرا راوی نہیں، حضرت زید بن ثابتؓ جو کاتب وحی تھے، ان سب کی درسگاہیں اسی شہر میں تھیں۔

---

[1] تزیین الممالک، ابن خلکان ج ۲۔ اسعاف المبطاء برجال الموطا۔ تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱۔ کتاب الانساب سمعانی

[2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔

Marfat.com

تابعین مدینہ | تلامذۂ صحابہ میں سے جن کو اصطلاح میں تابعین کہتے ہیں، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیرؓ، نافع، عبداللہ بن دینار، سالم بن عبداللہ، خارجہ بن زید، سعید بن مسیب، ہشام بن عروہ، محمد بن منکدر، عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود، محمد بن مسلم بن شہاب زہری، عامر بن عبداللہ، جعفر صادق، ربیعہ رامی، ابوسہیل نافع بن مالک اور سلیمان بن یسار وغیرہ وہ بزرگان اسلام ہیں جن کے فضل وکمال کے آغوش میں اسلام کے علم دین نے نشوونما پائی ہے، اسی مدینۃ النبیؐ کے لعل وگہر تھے۔

فقہائے سبعہ | ان میں سے ابوبکر بن حارث (م ۹۴ھ) خارجہ بن زید (م ۹۹ھ) قاسم بن محمد (م ۱۰۱ھ) سعید بن مسیب (م ۱۰۱ھ) عبیداللہ بن عتبہ (م ۱۰۲ھ) سالم بن عبداللہ (م ۱۰۶ھ) سلیمان بن یسار (م ۱۰۷ھ) مدینہ کے فقہائے سبعہ کہلاتے ہیں۔ صحابہ کے بعد تمام فتاوی، مسائل اور مقدمات وقضایا انہی کے فیصلہ سے طے پاتے تھے۔ ان کی مجلس اجتماعی اس عہد کی سب سے بڑی عدالت العالیہ تھی۔ فقہ مدینہ جس کا ذکر آگے آئے گا ان ہی فقہائے سبعہ کی علمی مجلسوں کے نتائج بحث ہیں۔

شیوخ مالک | امام مالک نے جب آنکھ کھولی تو مدینہ باغ دبہار تھا، چند کے سوا تمام بزرگوار درس وافتاء میں مشغول تھے، امام نے ان میں سے اکثر سے استفادہ کیا اور اس طرح مدینہ کا جو علم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا وہ ایک سینہ میں مجتمع ہوگیا اسی لئے امام دارالہجرۃ آپ کا لقب ہوا۔ امام کے شیوخ کی یوں تعداد تو بہت ہے، اسماء الرجال کی کتابوں میں ہے کہ روی عن خلق کثیر یعنی انہوں نے بہت سے لوگوں سے روایتیں کی ہیں۔

امام کے شیوخ اعزہ | خود امام کا گھر علم حدیث کا مرجع تھا، آپ کے دادا، چچا اور والد محدث تھے، امام کے دادا جو ثقات رواۃ میں ہیں امام کے ہوش تک زندہ تھے لیکن ان سے بلاواسطہ امام نے فیض حاصل نہیں کیا۔ ابوسہیل نافع امام کے ایک چچا روایت وحدیث کے شیخ تھے، امام زہری وغیرہ کے استاذ ہیں، امام نے بھی ان سے حدیثیں سیکھی ہیں، آپ کے والد انس اور دوسرے چچا ربیع دونوں اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، لیکن ان سے کوئی روایت امام نے مؤطا میں نقل نہیں کی ہے۔

امام نے غالباً لڑکپن سے طلب علم شروع کی، خود ان کی زبانی مروی ہے میں نافع کے پاس آتا تھا

تو ایک کم سن لڑکا تھا، میرے ساتھ ایک غلام ہوتا تھا، نافع اتر کر آتے تھے تو مجھ سے حدیث بیان کرتے تھے۔[۱]

اس وقت تک تعلیم کا نصاب نہایت سادہ تھا یعنی قرآن مجید، حدیث اور فقہ۔

امام مالک نے قرآن مجید کی قرأت و سند مدینہ کے امام القراء ابورویم نافع بن عبدالرحمٰن متوفی ۱۶۹ھ سے حاصل کی[۲]۔ جن کی قرأت پر آج تمام دنیائے اسلام کی قرأت کی بنیاد ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم ہمیشہ مسلمانوں میں لڑکپن میں ہوتی ہے، عجب نہیں کہ اس کا بھی زمانہ ہو۔

علم حدیث علم حدیث کی تعلیم بھی بچپن ہی سے شروع ہوئی جیسا کہ گذشتہ روایت سے ثابت ہوتا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام کے سب سے پہلے شیخ الحدیث حضرت نافع ہیں یا ممکن ہے آپ کے چچا ابوسہیل ہوں لیکن یہ محض قیاس ہے اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔

نافع نافع حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام اور حدیث و روایت میں ان کے شاگرد تھے، حضرت نافع نے کامل تیس سال حضرت ابن عمرؓ کی خدمت کی ہے، ان کے علاوہ اور متعدد صحابہ حضرت عائشہؓ، ام سلمہؓ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ وغیرہ سے بھی روایت کی ہے، امام اوزاعی، امام زہری، ایوب سختیانی ابن جریج، امام مالک جیسے آئمہ حدیث ان سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ نافع کی جلالت قدر کا اس سے اندازہ ہوگا کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؓ نے جو خود مجتہد و ناقد فن تھے، نافع کو اہل مصر کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا، ۱۱۷ھ میں نافع نے وفات پائی[۳]۔

نافع جب تک زندہ رہے امام مالک ان کے حلقۂ درس سے استفادہ کرتے رہے، وہ ان سے پوچھتے تھے کہ "ان مسائل میں حضرت ابن عمرؓ نے کیا فرمایا ہے"؛ نافع ان کے اقوال بیان کرتے تھے، شاگرد کو استاد کے علم و فضل پر اتنا عزور تھا کہ فرماتے ہیں کہ "جب میں ابن عمرؓ کی حدیث نافع کی زبان سے سن لیتا ہوں تو پھر اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ کسی اور سے بھی اس کی تائید سنوں"۔ شاگرد واستاد کے شرف و قبول کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ روایت مالک عن نافع عن ابن عمرؓ کو دنیا سلسلۃ الذہب یعنی "طلائی زنجیر" کہہ کر پکارتی ہے[۴]۔

نافع کے علاوہ امام نے مدینہ کے دوسرے شیوخ کبار سے بھی حدیث سیکھی، جن میں ممتاز نام یہ ہیں، محمد بن

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ۔ [۲] ترجمہ نافع [۳] ابن خلکان جلد ۲ و ج ۳ [۴] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ [۵] ابن خلکان ۔ ج ۳ ۔

شہاب زہری، جعفر صادق بن محمد، محمد بن منکدر، محمد بن یحییٰ انصاری، ابو حازم، یحییٰ بن سعید

شیوخ کی تعداد امام مالک نے مؤطا میں جن شیوخ سے روایت کی ہے ان کی مجموعی تعداد شاہ ولی اللہ صاحب نے مسوی کے مقدمہ میں پچھتر بتائی ہے لیکن اسعاف المبطاء برجال المؤطا سے میری تحقیق کے مطابق شیوخ کی تعداد چورانوے ہے۔ لیکن یہ تعداد مؤطا کی احادیث و آثار کی ہے ورنہ اصل میں امام مالک کی احادیث صحیحہ و غیر صحیحہ کی تعداد دس ہزار ہے، اس لحاظ سے اگر شیوخ کی تلاش کی جائے تو موجودہ تعداد سے بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ امام مسلم نے امام مالک کے شیوخ کے حال میں ایک مستقل کتاب لکھی تھی لیکن اب وہ ناپید ہے۔

غیر مدنی شیوخ امام مالک کے اساتذہ میں بعض غیر مدنی شیوخ کے نام بھی ملتے ہیں شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک ایسے چھ اشخاص ہیں، جیسا کہ مقدمہ مسوی میں لکھا ہے، لیکن درحقیقت نو شخص ہیں، ایک شام کے ابراہیم بن ابی عبلہ مقدسی، دو مکہ معظمہ کے محمد بن مسلم ابوالزبیر کی اور حمید بن قیس اعرج کی، دو خراسان کے عطاء بن ابی مسلم خراسانی اور زیادہ بن سعد خراسانی، دو جزیرہ کے عبدالکریم بن مالک جزری اور زید بن انیسہ جزری، اور دو بصرہ کے ایوب سختیانی بصری اور حمید بن [illegible] حمید الطویل بصری، امام نے ان ممالک کا کبھی سفر نہیں کیا اس لئے ان بزرگوں سے اخذ و استفادہ کا موقع مدینہ ہی میں ملا ہوگا، کیونکہ حج و زیارت کی غرض سے اکثر بزرگان علم کا سال میں ایک بار اور کبھی کبھی کئی کئی بار مدینہ میں آنا ہوتا تھا۔

علم فقہ امام مالک نے فقہ کی تعلیم گو نافع وغیرہ شیوخ سے بھی پائی لیکن ابو عثمان ربیعۃ الرائی سے خاص طور سے اس کی تحصیل کی۔ ربیعہ مدینہ کے کبار تابعین میں تھے۔ حضرت انسؓ وغیرہ صحابہ کرام کے دامن تربیت میں تعلیم پائی تھی، امام مالک، یحییٰ انصاری، شعبہ، اوزاعی، حسن بصری، لیث مصری وغیرہم جو اس طبقہ کے اکابر رجال و اعیان علم ہیں ان کے شاگرد ہیں۔ ربیعہ کے ساتھ امام مالک کا اختصاص اس درجہ تھا کہ تاریخ و رجال میں شیخ مالک ان کے نام کا جزو ہو گیا ہے۔ ربیعہ اجتہاد و استنباط و تفریع و رائے میں اس قدر معروف تھے کہ رائی ان کا لقب ہو گیا۔ امام ابن حنبل ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن شیبہ کا قول ہے کہ وہ ثقہ ثبت اور مدینہ کے مفتیوں میں سے ایک تھے۔ خطیب نے لکھا ہے کہ وہ فقیہ، عالم اور فقہ و حدیث دونوں کے حافظ تھے۔

ربیعہ رائی خاص مسجد نبوی میں درس دیتے تھے، قرن اول کا مدینہ جو سینکڑوں محدثین و فقہاء کا مخزن تھا
اس میں فتویٰ دینا ایک خاص لیاقت و قابلیت کا کام تھا، ربیعہ رائی اس وصف سے متصف اور ان اکابر فقہائے
محدثین میں تھے جن کو مدینۃ الرسول کے مفتی ہونے کی سعادت حاصل تھی، دولت عباسیہ کے پہلے فرماں روا سفاح
نے قاضی دارالخلافہ کا عہدہ ان کے سپرد کیا، حکومت عباسیہ کا پہلا پایہ تخت انبار تھا یہیں ۱۳۶ھ میں
انہوں نے وفات پائی۔

امام مالک کے شیوخ و اساتذہ کی یہ تعداد اس زمانہ کے کثرتِ شیوخ کے مذاق کے لحاظ سے نہایت کم
ہے، اور عجب نہیں کہ اس پر ان لوگوں کو جو تعداد کو افضلیت کا معیار جانتے ہیں تعجب ہو، لیکن درحقیقت اس
میں بھی امام مالک کے لئے ایک مزیت خاص مضمر ہے۔

امام مالک کا انتخاب شیوخ صحابہ کے بعد تابعین کا دور شروع ہوا، یہ دور ثانی یا قرن
ثانی گو عمومیت اور اکثریت کے لحاظ سے خیر و برکت کا عہد اور صدق و طہارت کا دور تھا، تاہم زمانہ کا کوئی
دور کبھی ایسا نہیں گزرا ہے اور نہ گزر سکتا ہے، جب مجمع انسانی فاسد عنصر سے بالکل خالی ہو زمانہ کے خیر و
شر ہونے کا فیصلہ صرف نسبتہً ہو سکتا ہے، صحابہ کا قرن اوّل اپنے ماقبل و مابعد کی نسبت سے خیر القرون تھا
تاہم وہ ماعز اور زن مخزومیہ وغیرہ کے وجود سے خالی نہ تھا، گو یہ ہستیاں بھی قرون مابعد کے اخیار و ابرار سے
شرف صحبت، قوتِ ایمان، اعترافِ قصور و خشیتِ الٰہی اور توبہ و ندامت میں بدرجہا بہتر تھیں عفی اللہ عنہم
صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ بھی اپنے مابعد کے لحاظ سے برکات کا مجمع اور کمالات کا منبع تھا، تاہم
وہ انسانی طبقات کے جو اقسام ہیں اُن سے یکسر پاک بھی نہ تھا، بہتیرے لوگ قصداً جھوٹ بولتے تھے بہتیرے
اپنے غایت زہد و سادہ دلی سے ہر بولنے والے کو سچا سمجھ کر بلا تامل اس کی بات نقل کرتے تھے، اس طرح ثانیاً
کذب بیانی میں مبتلا ہو جاتے تھے، سینکڑوں غیر فقیہ راوی ایسے تھے جو اپنی روایات کا خود محمل و مفہوم نہیں
سمجھتے تھے، کچھ ایسے تھے جو فن کی عدم مہارت کے سبب سے جید و ردی میں تمیز نہیں کر سکتے تھے لیکن
چونکہ اس زمانہ کی آب و ہوا میں روایت حدیث اور اشاعت قول نبوی کا مذاق پھیلا ہوا تھا، اور یہی
عزو شرف کا ذریعہ تھا، اس لئے اہل فضل اور مستحقین علم کے پہلو بہ پہلو نا اہل اور غیر مستحقین بھی اپنی مسند

Marfat.com

بھاتے پھرتے تھے، باہر کے ناواقف آفاقی جن میں زیادہ تر عراقی تھے، ہر چمکدار چیز کو سیم خالص سمجھ کر اور ہر ڈھیر سے بلا تمیز ایک خروارہ اٹھاتے پھرتے تھے اور اس بارِ گراں کے ساتھ جب گھر لوٹتے تھے تو اپنے کو سب سے بڑے ڈھیر کا مالک سمجھ کر خوش ہوتے تھے۔

امام مالک کا مدینہ وطن تھا، بچپن سے علماء میں تربیت پائی، ایک ایک صاحب حدیث سے برسوں ملاقاتیں رہیں، ہر ایک سرمایہ دار کی متاع کے ایک ایک ذرہ سے واقف تھے اور یہ غیر ممکن ہے کہ نااہلوں کی نااہلیت خود اپنے ارباب وطن سے مخفی رہے۔

خصوصیات شیوخ مالک

امام مالک نے صرف ان ہی اساتذہ فن سے استفادہ کیا، جو اہلیت و استحقاق کے مسند نشین تھے۔ اور صرف ان شیوخ کے حلقۂ درس میں بیٹھے، جو صدق و طہارت میں معروف اور حفظ و فقہ میں ممتاز تھے، امام ممدوح ہمیشہ تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ میں کبھی کسی غیر فقیہ، سفیہ، کی مجلس میں نہیں بیٹھا۔ امام ابن حنبل فرماتے ہیں کہ "یہ مخصوص نعمت تھی جو صرف امام مالک کے حصہ میں آئی"۔ امام صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "اس صحن مسجد (نبوی) میں ان ستونوں کے پاس میں نے ستر شیوخ کو پایا جو قال اللہ قال الرسول کہا کرتے تھے لیکن ان میں سے ایک کے پاس بھی میں نہیں بیٹھا"۔ کبھی فرماتے "مدینہ میں بیسیوں اشخاص تھے جن سے لوگ حدیث سیکھتے تھے لیکن میں نے کبھی ان سے اخذ علم نہیں کیا، یہ چند قسم کے لوگ تھے، بعض نادانستہ جھوٹ بولتے تھے، بعض مغز سخن سے ناواقف تھے، بعض پورے جاہل تھے۔ ابن وہب جو امام صاحب کے نامور شاگرد ہیں نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب نے فرمایا کہ "مدینہ میں ایسے لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا مانگی جاتی تو ان کی برکت سے آسمان سے پانی برس پڑتا"۔ اور بہت سی احادیث اور مسائل کی ان کو سماعت بھی حاصل تھی لیکن میں نے ان سے استفادہ نہیں کیا کیونکہ وہ صرف متقی اور زاہد تھے اور حدیث و روایت اور فتویٰ کا کام صرف زہد و اتقا اور سادگی سے نہیں چل سکتا، اس کے لئے اتقاء و پرہیزگاری کے ساتھ علم و فہم اور پختگی کی حاجت ہے، وہ یہ جانتا ہو کہ اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے اور کل قیامت کے دن یہ معاملہ کہاں تک پہنچے گا، جس زہد کے ساتھ پختگی و دانائی نہ ہو وہ اس راہ میں مفید نہیں اور نہ وہ حجت ہے اور نہ ایسے لوگوں سے اخذ علم کرنا چاہئے"۔ امام مالک کے جاننے اسماعیل بن ابی

اویس روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں مالک کو کہتے سنا ہے کہ "یہ علم حدیث دین ہے پہلے دیکھ لو کہ کس سے حاصل کرتے ہو۔ میں نے ان ستونوں کے پاس ستر آدمیوں کو قال رسول اللہ قال رسول اللہ کہتے سُنا لیکن میں نے ان سے ایک حرف نہیں سیکھا، حالانکہ ان میں سے ہر شخص ایسا تھا کہ اگر خزانہ بھی ان کے سپرد کیا جاتا تو ان کی ایمان داری اور دیانت کے شیشہ میں بال نہ آتا، لیکن وہ اس فن کے آدمی نہ تھے۔" مطرف بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے امام کی زبان سے ان کا قول سُنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "میں نے اس شہر میں بہت سے نیک و صالح لوگوں کو پایا لیکن ان سے میں نے حدیث نہیں سُنی" لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ "جو وہ کہتے تھے وہ سمجھتے نہ تھے[1]"

امام صاحب نے اہلِ عراق سے کیوں روایت نہیں کی

امام کے شیوخ میں کوئی عراقی نہیں ہے۔ ابو مصعب جو امام کے شاگرد اور مشہور محدث ہیں، بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اہلِ عراق سے کیوں روایت نہیں کی؟ جواب میں فرمایا کہ "کیا میں ایسے لوگوں سے روایت کروں جن کو میں نے دیکھا ہے کہ یہاں آکر ان لوگوں سے حدیث سیکھتے ہیں جن پر وثوق نہیں کیا جاسکتا۔" ابو مصعب کا بیان ہے کہ "میں نے کہا کہ وہ اپنے شہر میں بھی ایسے ہی لوگوں سے روایت کرتے ہیں۔" اس قسم کا ایک سوال ایک بار امام مالک سے شعیب بن حرب نے کیا کہ آپ لوگ اہلِ عراق سے کیوں نہیں روایت کرتے، امام صاحب نے کیا معقول جواب دیا، فرمایا کہ ہمارے بزرگوں نے ان کے بزرگوں سے روایت نہیں کی اس لئے ہمارے پچھلوں نے بھی ان کے پچھلوں سے روایت نہیں کی۔[2]"

امام مالک جب کسی غیر مدنی شیخ سے اخذِ حدیث کرنا چاہتے تھے تو پہلے اس کو پوری طرح جانچ لیتے تھے۔ امام کا کوئی شیخ اگر عراقی کہا جاسکتا ہے تو وہ بصرہ کے ایوب سختیانی مشہور تابعی المتوفی ۱۳۱ھ ہیں جن کی نسبت ابن سعد کہتے ہیں "کان حجۃ ثقۃ ثبتا فی الحدیث جامعا کثیر العلم" اور جن کو شعبہ نے سید الفقہاء کا خطاب دیا ہے اور جن کا نام رجال میں احد الائمۃ الاعلام کے وصف کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ مکہ میں حج کے موقع پر ان کو دو سال میں نے دیکھا لیکن ان

---

[1] مقدمہ اسعاف۔ [2] ایضاً۔

سے کوئی حدیث نہیں لکھی، تیسرے سال دیکھا کہ وہ صحن زمزم میں بیٹھے ہیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لیا جاتا تو وہ اتنا روتے کہ مجھ کو رحم آتا تھا، جب یہ حال دیکھا تو ان کی حدیث لکھی[1]۔

اپنے دادا اور بعض فقہائے سبعہ سے کیوں نہیں روایت کی امام جب سن رشد کو پہنچے اُس وقت آپ کے دادا مالک بن ابی عامر زندہ تھے، ان کی وفات کے وقت امام کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی، فقہائے سبعہ میں سے سالم بن عبداللہ نے ۱۰۶ھ میں وفات پائی، جب کہ امام کی عمر سولہ برس کی تھی، سلیمان بن یسار نے ۱۰۷ھ میں انتقال کیا، اس وقت امام سترہ سال کے تھے تاہم امام صاحب نے ان بزرگوں سے بلا واسطہ کوئی روایت نہیں کی، اس کا سبب انہوں نے خود بیان فرمادیا ہے کہ "مدینہ میں بعض ایسے لوگوں کا زمانہ میں نے پایا ہے جو سو اور ایک سو پانچ برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے لیکن ایسے بوڑھوں کی روایت نہیں لی جاتی ہے اور اگر کوئی لے تو، عیب شمار کیا جائے گا" اور یہ بالکل سچ ہے کیونکہ عمر کی طوالت کا حفظ و عقل کے ضعف پر جو اثر پڑتا ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔

امام مالک کے اس احتیاط و تمیز و نقد کا یہ اثر تھا کہ امام مالک جس شیخ سے روایت کرتے تھے وہ ثقاہت و عدالت و حفظ میں نشان سمجھا جاتا تھا، یحییٰ بن معین جو مصرین فن حدیث کے امام ہیں فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ امام کے آگے کیا ہیں؟ ہم لوگ تو ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں، جب کسی شیخ کا نام آتا ہے تو دیکھتے ہیں کہ امام مالک نے اس سے لیا ہے یا نہیں، اگر نہیں لیا ہے تو چھوڑ دیتے ہیں" امام احمد بن حنبل سے کسی نے ایک راوی کی نسبت پوچھا انہوں نے فرمایا کہ "میرے نزدیک وہ اچھا ہے کیونکہ امام مالک نے اس سے روایت کی ہے[2]"۔

اساتذہ آپ کے معترف تھے امام مالک فطرتاً قوی الحافظہ تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ کوئی چیز میرے خزانہ دماغ میں آکر پھر نہ نکلتی[3] اور خود دوسروں کو بھی اس کا اعتراف تھا، ابو قلابہ کہتے ہیں کان مالک احفظ اھل زمانہ[4]۔ ایک بار استاد ربیعہ کی معیت میں امام زہری کی مجلس میں حاضر ہوئے، امام زہری نے اس دن چالیس سے زیادہ حدیثوں کا املا کرایا۔ دوسرے دن پھر مجلس

---

[1] مقدمہ اسعاف [2] ان تمام اقوال کے لئے دیکھئے مقدمہ اسعاف [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ [4] تزئین الممالک۔

منعقد ہوئی تو امام مالک اپنے استاد کے ساتھ پھر حاضر ہوئے، امام زہری نے کہا کتاب لاؤ میں اس سے حدیث بیان کروں، کل جو میں نے بیان کیا تھا اس سے تم کو کیا فائدہ ہوا، ربیعہ نے کہا اس مجلس میں ایک شخص ہے جو کل کی تمام حدیثیں زبانی سنا دے گا، زہری نے پوچھا وہ کون ہے؟ ربیعہ نے کہا ابن ابی عامر! زہری نے سنانے کا اشارہ کیا، امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس حدیثیں سنا دیں، زہری نے تعجب سے کہا میرا خیال تھا کہ یہ حدیثیں میرے سوا کسی کو یاد نہیں ہیں[1]

شوق علم اور فراغ قلب بہت کم مجتمع ہوئے ہیں، امام مالک کے فقر کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ چھت کی کڑیاں فروخت کر کے ضرورتیں پوری کیں لیکن دست طلب علم کو تاہ نہیں کیا[2] اسی لئے آپ فرماتے تھے کہ "اس علم میں کسی شخص کو اس وقت تک کمال حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مبتلائے فقر نہ ہوا اور اس پر بھی طلب علم کو ترجیح دے[3]، امام مالک طلب علم کے لئے بجز موسم حج کے مدینہ سے باہر نہیں نکلے، مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کو طلب علم کے لئے محنت نہیں اٹھانی پڑی، ابن سعد نے امام مالک سے بیک واسطہ روایت کی ہے کہ نافع سے حدیث سیکھنے کا وقت ٹھیک دوپہر کو مقرر تھا، دوپہر کی دھوپ میں بلا سایہ شہر سے باہر بقیع میں جاتا تھا، جہاں ان کا مسکن تھا، مدینہ کے ایک فقیہ ابن ہرمز تھے، ان کے گھر صبح کو آتا تھا تو رات کو جاتا تھا[4]

مجلس درس اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امام مالک کی لیاقت واستحقاق کا اعتراف عام طور سے کیا جا رہا تھا اور امام کے شیوخ کی موجودگی میں امام کے مستفیدین کا الگ حلقہ قائم ہو چکا تھا[5] شیخ الفقہ ربیعہ متوفی ۱۳۶ھ زندہ تھے کہ امام مالک فقہ و فتویٰ کے مرجع بن گئے[6] اور ربیعہ کی وفات کے بعد تو متفقہ طور سے فقہ ورای واجتہاد کے امام تسلیم کر لئے گئے۔ ابن لہیعہ نے جو مصر کے ایک شیخ حدیث ہیں، شیخ مدینہ، ابو الاسود نعیم بن عروہ بن زبیر سے پوچھا کہ "ربیعہ کے بعد مدینہ میں فقہ واجتہاد کا امام کون ہے"؟ انہوں نے جواب دیا کہ نوجوان اصبحی[7] یعنی مالک بن انس اصبحی

---

[1] تزیین الممالک [2] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ [3] تزیین و تقلا عن الحلیۃ لابی نعیم [4] طبقات ابن سعد [5] تزیین الممالک۔ [6] ابن خلکان ج ۲ [7] تزیین الممالک۔

Marfat.com

مجلسِ مالک | فن حدیث میں امام صاحب کے خاص شیخ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے غلام نافع تھے، حضرت ابن عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ساٹھ برس تک حدیث و فقہ و فتویٰ و ارشاد کے مرکز رہے ہیں۔ حضرت نافع کامل تیس برس تک سفر و حضر اور خلوت و جلوت میں ہمیشہ حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ رہے اور ان کے بعد ان کی مجلسِ درس میں ان کے جانشین ہوئے، ۱۱۷ھ میں وفات پائی، امام مالک کم از کم بارہ برس حضرت نافع کے درس میں رہے۔

حضرت نافع کی وفات کے بعد امام مالک ان کے جانشین ہوئے۔ شعبہ جو کوفہ کے راس المحدثین تھے بیان کرتے ہیں کہ "نافع کی وفات کے ایک سال بعد مدینہ آیا تو دیکھا کہ مالک ایک حلقہ کے صدر نشین ہیں"[1]۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے ۱۱۸ھ میں اپنی مجلس درس مستقل قائم کی۔

مجلس کی تہذیب امام صاحب کی مجلس درس ہمیشہ پر تکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رہتی تھی، وسط مجلس میں شہ نشین تھی، جس پر امام صاحب املائے حدیث کے وقت رونق افروز ہوتے تھے، جا بجا شرکائے مجلس کے لئے پنکھے پڑے رہتے تھے، جب حدیث کا درس ہوتا تو انگیٹھی میں عود اور لوبان جلائی جاتی، صفائی و نزاہت کا یہ عالم تھا کہ فرش پر ایک تنکا بھی بارِ خاطر ہوتا تھا، جب حدیث نبویؐ کے املا کا وقت آتا، پہلے وضو یا غسل کرکے عمدہ اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے، بالوں میں کنگھی کرتے، خوشبو لگاتے، اس اہتمام کے بعد مجلس علمی کی صدارت کے لئے باہر تشریف لاتے[2] سب لوگ خاموش سرنگوں مؤدب بیٹھتے تھے، یہاں تک کہ امام ابو حنیفہ بھی جب امام کی مجلس درس میں آکر شریک ہوئے تو وہ بھی اسی طرح مؤدب ہو کر بیٹھے[3] اس وقت امام صاحب کی ہر ادا سے شکوہ اور وقار کا اظہار ہوتا تھا، پوری مجلس پر ایک مقدس سکوت طاری رہتا تھا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ کتاب کے ورق بھی اس ڈر سے نہیں الٹتے تھے کہ کھڑکھڑاہٹ کی آواز نہ ہو[4] جاہ و جلال اور شان و شکوہ سے کاشانۂ امامت پر بارگاہِ شاہی کا دھوکہ ہوتا تھا، طلبہ کا ہجوم، مستفتیوں کا ازدحام، امرا کا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ [2] تزئین الممالک و بستان المحدثین [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ [4] توالی التاسیس بمناقب ابن ادریس بن حجر۔

درود، علماء کی تشریف آوری، سیاحوں کا گزر، حاضرین کی مودب نشست، مکان کے پھاٹک پر سواریوں کا انبوہ دیکھنے والوں پر رعب طاری کر دیتا تھا، اسی موقع پر ایک شاعر کا گزر ہوا تو بے اختیار اس کی زبان سے یہ دو شعر نکل گئے [۱]

یدع الجواب فما یراجع ھیبۃ   والسائلون نواکس الاذقان

اگر امام جواب نہیں دیتے تو ہیبت سے پھر پوچھا نہیں جاسکتا، پوچھنے والے سر نیچے کئے رہتے ہیں۔

ادب الوقار وعز سلطان التقی   فھو المھاب ولیس ذا سلطان

وقار کا ادب اور سلطان تقویٰ کا جاہ وجلال ہے لوگ اس سے ڈرتے ہیں حالانکہ یہ صاحب حکومت نہیں ہے۔

امام مالک صاحب حکومت نہ تھے، لیکن صاحب حکومت اس آستانہ پر آکر جھکتے تھے، امام شافعی نے اپنی تعلیم کے لئے والیٔ مدینہ کو بہ غرض سفارش جب درِ امامت پر لانا چاہا تو اس نے کہا "میرا کہاں وہاں گزر" [۲]

حدیث کا املا مسجد نبوی یا مجلس درس سے باہر نہیں کرتے تھے، خلیفہ مہدی اور ہارون دونوں نے خیمۂ خلافت میں املاء کی خواہش کی، لیکن امام نے انکار کر دیا، جلدی میں یا کسی کام کی مصروفیت میں یا راہ چلتے ہوئے حدیث نہیں بیان فرماتے تھے کہ خلافِ ادب ہے۔ درحقیقت سماع و فہم حدیث کے لئے اطمینان اور حضورِ قلب چاہیئے جو ان موقعوں پر عموماً مفقود ہوتے ہیں، ان کی مجلس میں زور زور سے بولنا بھی خلافِ ادب تھا، ایک بار خلیفہ منصور امام سے مسجد میں مناظرہ کر رہا تھا اور اس کی آواز نہایت بلند ہو رہی تھی، امام نے ڈانٹ کر یہ آیت پڑھی [۳]

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (حجرات ۲)   پیغمبر کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو۔

آپ کا معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد طلوعِ آفتاب تک مصلّی پر اور وظائف میں مشغول رہتے،

---

[۱] تزیین۔ [۲] ابن خلکان ج ۲۔ و تہذیب الاسماء قسم اول ج ۲۔

طلوع کے بعد لوگ آنا شروع ہوتے، امام صاحب ان کی طرف متوجہ ہو کر خیریت پوچھتے، مجلس کی یہ ترتیب تھی کہ قریب تر اچھے، مستعد اور صاحب فہم طلبہ کو جگہ دیتے، پھر علی قدر مراتب لوگ آ آ کر بیٹھتے جاتے، درس شروع کرنے سے پہلے فرما دیتے کہ "مشہور اور صاحب فہم لوگ قریب بیٹھیں"۔ املا آہستہ اور سکون کے ساتھ کرتے، ایک حدیث ختم ہو جاتی تو دوسری حدیث شروع کرتے۔

طریقہ درس مختلف شیوخ کی مجلسوں میں درس کا طرز مختلف تھا، اکثر شیوخ کا دستور تھا کہ وہ خود کسی بلند مقام پر بیٹھ جاتے یا کھڑے ہو جاتے، طلبہ ترتیب کے ساتھ آگے پیچھے قلم دوات لے کر بیٹھ جاتے، شیخ زبانی یا اپنا جزء حدیث ہاتھ میں لے کر اس سے املا کرتا، طلبہ لکھتے جاتے تھے، مجلس درس میں اگر غیر معمولی اجتماع ہوتا تو تھوڑی تھوڑی دور پر مستملی کھڑے ہو کر شیخ کے الفاظ کو آگے پہنچاتے، امام مالک بھی کبھی کبھی اس طریقہ پر درس دیتے تھے، ابن علیہ جو ایک اچھے شاگرد تھے امام کے مستملی تھے۔

لیکن مدینہ کے اکثر شیوخ کا دستور یہ تھا کہ وہ اپنی احادیث و فتاوی و تعلیقات کو پہلے قلمبند کر لیتے یا کسی مستعد اور صاحب فہم شاگرد کو لکھنے پر مامور کرتے، یہ لکھے ہوئے اجزا کاتب کے ہاتھ میں ہوتے اور وہ مجلس میں اس کو پڑھتا، شیخ جابجا اس کے مطالب کی تشریح کرتا جاتا، اگر کاتب سے غلطی ہو گئی ہوتی تو اس کی تصحیح کر دیتا، امام صاحب کے کاتب کا نام ابن حبیب تھا جن کا شمار محدثین کبار میں ہے۔ کبھی معن بن عیسیٰ یا دوسرے تلامذہ پڑھتے، یہی سبب ہے کہ امام کے بعض تلامذہ مثلاً یحییٰ[1] جن کی روایت بخاری میں ہے بجائے حدثنا مالک و اخبرنا مالک کے قرأۃ علی مالک کہتے ہیں۔

امام صاحب اس اصول کی شدت سے پابندی کرتے تھے، یحییٰ بن سلام اسی بات پر ناراض ہو کر مجلس سے اٹھ گئے کہ خود نہیں پڑھتے، شاگردوں سے پڑھواتے ہیں، یحییٰ بن سلام تو خیر ایک ادنیٰ شاگرد تھے، خود خلیفۂ وقت ہارون نے امین و مامون کے لئے درخواست کی کہ امام پڑھیں اور یہ سنیں تو امام نے شیوخ مدینہ کا نام گن کر فرمایا کہ "ہمارے شہر کے شیوخ کا یہی دستور تھا" کیا عجیب بات ہے کہ جس بات کے لئے لوگوں کو اس قدر اصرار تھا وہی آج ایک مدت سے تمام مدارس اسلامیہ کا دستور عام ہے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔

Marfat.com

اس طریقہ کی خوبی شیوخ مدینہ کا یہ طریقہ متعدد وجوہ سے زیادہ محتاط و بہتر ہے۔ مجمع عام میں جب کوئی شخص بولنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو عجلت، کثرت ازدحام اور کبھی مرعوبیت کے سبب سے اس میں سامحت ہو سکتی ہے، بخلاف اس کے اگر پہلے سے لکھ لیا جائے تو فراغ خاطر، اطمینان قلب اور فرصت فکر و مراجعت کے سبب سے صحت و حفظ و وثوق کے ذرائع زیادہ ہیں، محدث کا خود قرأت نہ کرنا اس لئے زیادہ مناسب ہے کہ وہ دوبارہ سُن کر اپنے مسودہ کی تصحیح کر سکے کیونکہ خود پڑھنے میں اکثر دیکھا گیا کہ زبان و نظر اپنی یاد کی بنا کر غلط لکھے ہوئے کو بھی صحیح پڑھتی ہے، دوسرا اجنبی شخص ہر سطر پر بار بار ٹھہرتا ہے، اس طرح معلم کو ہر مرتبہ غلطی پر تنبیہ ہوتی ہے، لیکن اس سے بھی بڑی مصلحت اس میں یہ ہے کہ اکثر فقہائے محدثین احادیث و آثار کے ساتھ اپنی ذاتی تحقیق و رائے یا کسی لغت کی شرح بھی بیان کرتے جاتے تھے، چنانچہ امام زہری کا یہی طرز تھا لیکن اس طرز میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اکثر طلبہ اصل اور اضافہ میں تمیز نہیں کر سکتے تھے، اور متن اور شیخ کے کلام میں ان کو اشتباہ ہوتا تھا، امام مالک کا طرز نہایت محفوظ تھا کہ اصل تو کاتب پڑھتا تھا اور اضافہ خود اپنی زبان مبارک سے ادا کرتے تھے، اس طرح ہر طالب علم کو اصل و اضافہ و ادراج میں فرق معلوم ہو جاتا تھا۔

مجلس درس کی شہرت ایک تو مدینہ خود اسلام کا گہوارہ اور نسلاً بعد نسل علم دین کا مرکز تھا دوسرے امام ہمام کا خاندان ابتدائے علم کے ساتھ ایک خاص نسبت رکھتا تھا، ان اضافی اوصاف کے ساتھ خود ذاتی جوہر نے وہ پر و بال نکالے کہ پوری دنیائے اسلام مشرق سے مغرب تک امام کے آوازۂ شہرت سے معمور ہو گئی اور امام کی درس گاہ مرز و بوم کے اختلاف و بوقلمونی کا مظہر بن گئی۔ ایک طرف سیستان دوسری صدی کی مملکت اسلام کا مشرقی گوشہ اور دوسری طرف قرطبہ دنیائے اسلام کا مغربی گوشہ، دونوں کے ڈانڈے مدینۃ الرسول میں آکر مل گئے۔ ممالک عرب شام، ممالک عراق، ممالک عجم، ممالک ترکستان، ممالک مصر، ممالک افریقہ، ممالک اندلس و ایشیائے کوچک، الغرض ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں براعظموں سے طالبان علم کے قافلے مسلسل مدینہ کا رُخ کرنے لگے، اس طرح پیغمبر عالم علیہ الصّلوٰۃ والسلام کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

Marfat.com

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوشک ان یضرب الناس اکباد الابل فلا یجدون احدا اعلم من عالم المدینۃ

(ترمذی ابواب العلم باب ماجاء فی عالم اہل المدینۃ)

ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب لوگ طلبِ علم کے لئے اونٹ ہنکائیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم وہ کسی کو نہ پائیں گے۔

تلامذہ ومستفیدین

محدث ذہبی لکھتے ہیں کہ امام مالک سے اتنے لوگوں نے روایت کی ہے جن کا شمار تقریباً ناممکن ہے[۱]۔ ان کے تلامذہ میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو دوسرے علماء کی مجلس سے فضل وکمال کی سند حاصل کر چکے تھے، بلکہ خود امام کے شیوخ بھی امام کے احسان علمی کے بار سے سبکدوش نہ تھے[۲]۔ خود امام مالک فرماتے تھے کہ بہت کم ایسے لوگ ہیں جن سے میں نے سیکھا ہو اور آخر میں ان کو خود مجھ سے پوچھنے کی حاجت نہ پڑی ہو[۳]۔

تلامذہ کی خصوصیات امام کو اپنے تلامذہ ومستفیدین کی حیثیت سے بھی متعدد خصوصیات حاصل ہیں، جس کثرت، جس رتبہ اور جتنے طبقات کے لوگ امام کے حلقۂ فیض میں داخل ہیں وہ محدثین و فقہا میں سے کسی کو بھی نصیب نہیں وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ

۱۔ کثرتِ تعداد کے لحاظ سے امام مالک کے تلامذہ کی تعداد تیرہ سو ہے۔ فربری کی روایت کے مطابق امام بخاری کے شاگردوں کی تعداد نوے ہزار ہے لیکن ان کا ان تیرہ سو منتخب روزگار تلامذہ سے کوئی مقابلہ نہیں، ان میں سے چند (چار یا پانچ) کے سوا ہر ایک فن کا ماہر اور بلند پایہ محدث ہے۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ حیدرآباد دکن ۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ذکر مالک بن انس ۔

۲؎ تزیین الممالک تقدس عن فضائل امام مالک لابن محمد الزہرانی ۔

۲۔ امام بخاری کے نوے ہزار رواۃ ہیں سے ایک مخصوص تعداد کے سوا باقی کے حالات مجہول دستور اور نام بنام غیر معلوم ہیں، لیکن امام مالک کے تمام رواۃ وتلامذہ نام بنام معلوم اور مشہور ہیں، ابوبکر خطیب بغدادی، ابن بشکوال اندلسی، قاضی عیاض، شمس الدین دمشقی، حافظ سیوطی نے ان کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے رسائل میں جمع کردیئے ہیں۔

۳۔ دوسرے عام محدثین کے تلامذہ کی دنیا جغرافیائی حیثیت سے اس قدر وسیع نہیں جس قدر امام مالک کی ہے، امام ابوحنیفہ کے تلامذہ تمام عجم وعرب میں پھیلے ہوئے تھے لیکن افریقہ واندلس ان سے بے نیاز رہے، امام اوزاعی کا علم اندلس میں پھیلا لیکن عجمی ممالک ان سے مستفید نہ ہوئے، لیکن امام مالک کے علم ومعارف نے دنیائے اسلام کے کسی گوشہ کو بھی اپنی غلامی سے آزاد نہ چھوڑا۔

۴۔ لیکن محض تلامذہ کی کثرت اور جغرافیائی وسعت اس قدر مایۂ فخر نہیں ہے، جس قدر ان کا علوئے رتبہ، رفعتِ کمال اور کثرت فضل ہے، امام مالک اپنے ہم سروں میں اس حیثیت سے جس قدر ممتاز ہیں، اس کو محض عطیۂ الٰہی سمجھنا چاہیئے جو صرف عالم مدینہ کے لئے مقدر تھا، ان کے حلقۂ تلامذہ ومستفیدین میں ان کے شیوخ بھی شامل ہیں اور دوسرے ایسے آئمہ کبار وارباب فن بھی، جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی اقلیم مستقل کا فرماں رواہے۔

۵۔ اس سے بھی زیادہ عجیب شئے یہ ہے کہ امام کا حلقۂ افادہ اتنے مختلف النوع طبقوں پر مشتمل ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ مختلف سمتوں اور جہات کے خطوط کیونکر ایک ہی مرکز کی طرف رجوع ہوئے۔ مثلاً خلفائے اسلام، امرائے بلاد، تابعین، آئمہ محدثین، آئمہ مجتہدین، فقہاء، قضاۃ، زہاد وصوفیائے کرام، ادباء وشعراء، مورخین، مفسرین اور فلاسفہ سب آپ کے حلقۂ مستفیدین میں داخل تھے۔

اس عہد کے بعد کے تمام محدثین کبار بلا استثناء بیک واسطہ یا بدو واسطہ مالک کے تلمذ سے مشرف ہیں۔ مسانید وصحاح کے مصنفین میں امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، ابوداؤد ونسائی، صرف ایک واسطہ سے امام کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہیں اور اس پر ان کو ناز وفخر ہے، یہ فخر آٹھویں صدی تک باقی رہا، چنانچہ محدث کبیر شمس الدین ذہبی فخریہ لکھتے ہیں کہ میں سات واسطوں سے امام کا شاگرد

Marfat.com

ہوں گے"۔ امام نووی کو بھی ساتویں صدی میں امام سے قرب نسبت پر ناز ہے، مقدمہ شرح مسلم میں اپنے استاد کے حال میں لکھتے ہیں "ایک کتاب کی سند مجھ کو کتب بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی سب سے بہتر ملی اور وہ امام مالک کی مؤطا ہے جو ان تمام محدثین کے شیخ تھے"۔[۲]

فقہ و فتاویٰ

فقہ مالک امام مالک کے فقہ و فتاویٰ کی بنیاد فقہ مدینہ پر ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے مصفٰی کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"امام مالک بنائے فقہ بر حدیث آنحضرتؐ نہادہ است کہ مسند باشد یا مرسل ثقات، بعد ازاں قضایائے حضرت عمرؓ و بعد ازاں بر فتوی ابن عمرؓ عمل او بعد ازاں بر فتاوائے سائر صحابہ و فقہائے مدینہ کر سعید بن مسیب وغیرہ ابن زبیر، قاسم و سالم و سلیمان بن یسار و ابو سلمہ و ابوبکر بن عبدالرحمٰن و ابوبکر بن عمرو عمر بن عبدالعزیز۔"

مؤطا کے طرز استدلال اور احادیث و آثار کا جس نے بغور مطالعہ کیا ہے، وہ یقیناً اس کی تائید کرے گا کہ امام مالک کی فقہ و فتاویٰ کی یہی وہ بنیاد و اصول ہیں جن پر امام مالک فقہی فتاویٰ کا جواب دیتے تھے۔

امام مالک کے فضل و کمال کا تمام شیوخ مدینہ کو اعتراف تھا، اس کے باوجود انہوں نے اس قدر احتیاط کی کہ جب تک ستر علمائے عظام نے امام صاحب کی قابلیت و استحقاق کا فتویٰ نہ دیا، انہوں نے اس مرتبہ عالی پر قدم رکھنے کی ہمت نہ کی، آپ کا معمول تھا کہ جب کسی فتویٰ کا جواب ارشاد فرماتے تو پہلے ماشاء اللہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہتے۔[۳]

حکومت کا اعلان نہ صرف مدینہ و حجاز بلکہ تمام اطراف ملک سے سائلین کا اژدہام رہتا تھا، موسم حج میں جب پوری دنیائے اسلام عرصۂ عرفات میں جمع اور سارے علمائے دین کوفہ، بصرہ، خراسان وغیرہ سے سمٹ سمٹ کر حرم مکہ میں جمع ہو جاتے تھے تو حکومت کی طرف سے اعلان ہوتا تھا کہ "امام مالک اور ابن ابی

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ا۔ [۲] مقدمہ صحیح مسلم [۳] مقدمہ مصفٰی [۴] تزیین الممالک عن ابن نعیم و تذکرۃ الحفاظ ج ۲

ذئب کے سوا اور کوئی فتویٰ نہ دے۔[1]

حکومت کے مقابلہ میں آزادی فتویٰ، طلاق مکرہ حکومت کی اس تعلیم و تکریم کا اثر شاید دوسروں پر یہ ہوتا کہ وہ کم از کم مختلف فیہ مسائل میں اپنی رائے کے خلاف حکومت کے منشار کی تعمیل کرتے، لیکن امام صاحب اپنی حریت رائے اور اعلانِ حق میں اس کی پروا نہیں کرتے تھے، اگر کسی کو زبردستی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کیا جائے اور وہ ڈر کر محض جبر سے طلاق دے دے تو امام ابوحنیفہ اور بعض دیگر آئمہ کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی لیکن امام مالک اور اکثر اصحاب حدیث اس کے قائل ہیں کہ طلاق واقع نہ ہو گی۔ والی مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی نے جو خلیفہ منصور کا چچا زاد بھائی بھی تھا امام کو حکم دیا کہ وہ یہ فتویٰ نہ دیں، لیکن امام صاحب نے علی الاعلان اپنی رائے کا اظہار کیا اور آخر اس کے لئے کوڑوں کی سزا تک گوارا کی۔

لا ادری اس سے بھی زیادہ شدید موقع اعلانِ حق کا اپنے نفس کے مقابلہ میں ہوتا ہے، مفتی کے لئے جس قدر پہلی قسم کی حریت کی حاجت ہے اس سے زیادہ دوسری قسم کی حریت کی ضرورت ہے، لیکن امام صاحب جس طرح پہلی منزل میں مستقیم تھے، دوسری منزل میں بھی درماندہ نہ تھے، امام صاحب سے جب کوئی فتویٰ پوچھا جاتا اور اس وقت اس جزئیہ پر اطلاع نہ ہوتی تو نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ فرماتے تھے کہ لا ادری، میں نہیں جانتا، امام کے شاگرد ابن وہب کہتے ہیں کہ اگر میں امام مالک کی لا ادری لکھا کرتا تو کتنی تختیاں بھر جاتیں۔[2]

ممالک بعیدہ کے استفتاء سے احتراز چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دور کے شہروں سے جو مستفتی آتے تھے امام صاحب ان کو بھی ایسا ہی جواب دیتے تھے، ابن عبد اللہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نہایت دور دراز مسافت سے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے ایک مسئلہ پوچھا، امام صاحب نے فرمایا کہ "میں اس کو اچھی طرح نہیں جانتا"۔ سائل نے کہا کہ "میں چھ مہینے کی راہ طے کر کے صرف اس مسئلہ کی خاطر حاضر ہوا ہوں، جن لوگوں نے مجھ کو بھیجا ہے میں ان کو جا کر کیا جواب دوں گا"۔ امام صاحب نے فرمایا کہ کہہ دینا کہ "مالک نے کہا کہ میں نہیں جواب دے سکتا"۔[3]

امام صاحب کی یہ احتیاط درحقیقت شدتِ تقویٰ اور ایک نہایت دقیق نکتہ پر مبنی تھی، مفتی کی حالت یہ

---

[1] ابن خلکان ج ۲۔ [2] تزئین الممالک عن ابی نعیم [3] جامع بیان العلم ابن عبد البر۔

Marfat.com

ہے کہ آج وہ ایک مسئلہ کی نسبت ایک رائے رکھتا ہے، دوسرے دن اس سے صحیح تر صورت اس کے خیال میں آتی ہے، ایسے موقع پر شہر اور اس کے قرب وجوار میں مستفتی کو اپنی غلطی کی اطلاع دے سکتا ہے لیکن اس زمانہ میں جب وسائل سفر آسان نہ تھے، دور کے مقامات میں تصحیح و تغلیط کی اطلاع مشکل تھی۔ امام صاحب کے ایک مصری دوست نے حیرت سے امام صاحب سے پوچھا کہ آپ ان بے چاروں کو جو کوسوں سے مصائب سفر و مصارف برداشت کرکے آتے ہیں کیوں واپس کر دیتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا یہ صحیح ہے کہ مصری مصر سے، شامی شام سے، عراقی عراق سے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں، مگر میں نے جو جواب آج دیا ہے اس کے بجائے اگر کل مجھ کو کچھ اور جواب معلوم ہو اس وقت کیا ہوگا؟[۱] حضرت لیث مصری نے جب امام کا یہ قول سنا تو رو پڑے کہ مالک، لیث سے قوی تر ہیں اور لیث ان سے کمزور تر۔

رائے پوچھنے پر زجر | فتووں کے جواب میں اکثر فرماتے تھے کہ قال رسول اللہ ﷺ کذا سائل نے کہا آپ کی رائے کیا ہے، آپ نے جواب میں یہ آیت پڑھی۔[۲] فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ جب کسی مسئلہ قیاسی کو بیان فرماتے تو پہلے یہ آیت پڑھتے ان نظن الا ظنا وما نحن بمستیقنین

جواب میں کاوش فکر | مسائل و فتاویٰ کا جواب ہمیشہ نہایت دقت نظر اور کاوش فکر سے دیتے تھے، ابن ابی اویس کہتے ہیں کہ ایک بار امام صاحب نے فرمایا کہ کبھی کبھی ایسا مسئلہ پیش آجاتا ہے کہ خواب و خور حرام ہو جاتا ہے، ابن ابی اویس نے کہا آپ کی بات تو لوگوں کو نقش فی الحجر کی طرح تسلیم ہوتی ہے، پھر آپ کیوں یہ مشقت برداشت کرتے ہیں، امام صاحب کس نکتہ سنجی کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ "ابن ابی اویس! اس حال میں تو مجھ کو اور بھی کاوش کرنی چاہیئے"[۳]

انصاف پسندی | اگر کسی مسئلہ میں غلطی ہو جاتی اور کوئی شخص اس کی اصلاح کرتا تو فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔ ایک شخص نے پوچھا کیا وضو میں پاؤں کی انگلیوں میں تخلیل کرنی چاہیئے؟ امام نے فرمایا ذلک علی الناس۔ ابن وہب امام کے شاگرد بیٹھے تھے، مجلس کے بعد انہوں نے کہا کہ تخلیل کی ایک حدیث میرے پاس ہے، امام نے حدیث سن کر فرمایا کہ حدیث حسن اور اس کے بعد پھر ہمیشہ فتویٰ اس کے موافق دیا۔[۴]

---

[۱] تزیین الممالک عن ابی نعیم [۲] مناقب مالک للزواوی عن سعید بن مسیب۔ [۳] الزواوی۔

امام مالک تقریباً ساٹھ برس مستقل فقہ و فتاوی میں مصروف رہے، امام کے تلامذہ نے ان کے مسائل فقہیہ کو مدون بھی کیا ہے، سب سے پہلی کتاب اسد بن فرات قاضی افریقہ کی "اسدیہ" ہے اور سب سے ضخیم ابن قاسم متوفی ۱۹۱ھ کی المدونہ ہے جو خود امام کی زندگی میں مدون ہو رہی تھی، مدونہ مصر میں چھپ گئی ہے، تیسری کتاب ابن وہب مصری متوفی ۱۹۷ھ کی کتاب المجالسات عن مالک ہے، ان کتابوں میں امام کے ہزاروں مسائل و فتاوی مدون ہیں، ابن قاسم مصنف مدونہ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کو امام کے چالیس ہزار مسائل زبانی یاد تھے۔

اہلِ علم کا اعتراف

امام مالک ارباب رائے میں داخل ہیں، محدثین نے ارباب رائے کا کم اعتراف کیا ہے لیکن اس کے باوجود امام صاحب محدثین میں وہی درجہ رکھتے ہیں جو صاحبِ فن اپنے اتباع اور مقلدین میں رکھتا ہے۔ یحییٰ بن معین جو حدیث و رجال کے ناقد ہیں کہتے ہیں "مالک اقلیم حدیث کے بادشاہ ہیں"۔ محدث کبیر سفیان بن عینیہ فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ مالک کے سامنے کیا چیز ہیں ہم تو اُن کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں، اگر امام مالک نے کسی شیخ سے روایت کی ہے تو اس سے کرتے ہیں ورنہ چھوڑ دیتے ہیں"؛ عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے کہ "روئے زمین پر مالک سے بڑھ کر حدیث کا کوئی امانت دار نہیں"

امام شافعی فرمایا کرتے تھے "علماء میں امام مالک ستارہ ہیں"؛ محدث ابن نہیک کا قول ہے کہ "صحت حدیث میں مالک پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا" امام ابن حنبل سے ایک شخص نے پوچھا کہ "اگر کسی کی حدیث وہ زبانی یاد کرنی چاہے تو کس کی کرے؟" جواب دیا کہ "مالک بن انس کی"؛ ابن مہدی سے جو نہایت مشہور محدث ہیں ایک شخص نے کہا کہ "میں نے سنا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ مالک ابو حنیفہ سے بھی زیادہ فقیہہ ہیں"۔ انہوں نے فرمایا "میں نے یہ تو نہیں کہا، لیکن یہ کہتا ہوں کہ مالک ابو حنیفہ کے استاد (حماد) سے بھی زیادہ فقیہ ہیں"

سفیان بن عینیہ باایں ہمہ علم و فضل، حلال و حرام اور حدیث معمول کا املا امام مالک کے حلقہ میں بیٹھ کر سنتے اور وہاں سے اٹھ کر اپنے مستفیدین کے حلقہ میں بیٹھتے تھے، سفیان ثوری جو مجتہد مستقل ہیں وہ مناسک حج میں امام کی پیروی کرتے تھے، ابن معین جو نقد حدیث میں امام ہیں فرماتے ہیں "مالک خدا کی

Marfat.com

طرف سے خلق پر ایک حجت تھے"۔ ابن معین کا دوسرا قول ہے کہ "اصحاب زہری میں مالک سے بڑھ کر کوئی اثبت نہیں"۔ یحییٰ بن سعید القطان جو امام حدیث ہیں فرماتے ہیں کہ "مالک اس امت کے لئے رحمت تھے"۔ ابن ابی حازم نے ناقدِ حدیث دراوردی سے پوچھا کہ "اس خدائے کعبہ کی قسم! مالک سے بڑا کوئی عالم تم نے دیکھا؟" جواب دیا کہ "خدایا نہیں"۔

عام حالات

اب ہم مجلسِ درس و استفادہ سے اٹھ کر دربارِ شاہی میں آتے ہیں، امام صاحب ۹۳ھ میں پیدا ہوئے تھے جب کہ ولید سریر آرائے خلافت تھا، لیکن پچیس برس کے بعد ۱۱۸ھ میں جب امام تعلیم سے فارغ ہو کر شہرت عام حاصل کر رہے تھے تو خلافت امویہ کا دم باز واپسین تھا۔ ۱۳۲ھ میں خلافت عباسیہ کے نام سے تاریخ کا نیا باب شروع ہوا۔

خلافت عباسیہ کا پہلا تاجدار ابو عباس سفاح تھا، اس کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر منصور خلیفہ ہوا۔ اس انقلاب سے پہلے وہ مدینہ کی درسگاہ کا ایک طالب علم اور امام مالک کے طبقہ کا ایک شریک صحبت تھا۔

خلافت کے بعد منصور نے ۱۴۰ھ میں پہلا حج کیا اور مکہ معظمہ کے بعد مدینہ منورہ آیا، شہر کے شرفاء اور علماء اس کے استقبال کے لئے نکلے، سفیان ثوری، سلیمان خواص اور امام مالک بھی اس لئے اس سے ملنے کے لئے آئے کہ کل تک وہ علم حدیث کی مجلسوں میں ان کے ساتھ برابر کا شریک تھا، دیکھیں اب وہ کس حال میں ہے۔ دربار میں حجاز کے تمام علماء و فقہاء موجود تھے، منصور نے امام صاحب کی طرف خطاب کرتے ہوئے کہا "اے ابو عبداللہ! میں اختلافات فقہی سے گھبرا گیا ہوں، عراق میں تو کچھ نہیں ہے، شام میں صرف جہاد کا شوق ہے، کوئی بڑا عالم نہیں، جو کچھ ہے وہ حجاز میں ہے اور حجاز کے علماء کے سرخیل آپ ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اس تصنیف مؤطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کر دوں کہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں اور تمام اطراف ملک میں اس کی نقلیں بھیجوں تاکہ اسی کے مطابق لوگ فتوے دیں"۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب کی تالیف کی خواہش ظاہر کی جو ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور ابن عمرؓ کے اصول فقہ کے بین بین اور معتدل ہو، اس کے

Marfat.com

بعد امام صاحب نے مؤطا تالیف کی۔

جاہ پسند علماء کے لئے یہ طلائی موقع تھا لیکن امام صاحب کے قدم کو اس موقع پر لغزش نہ ہوئی انہوں نے فرمایا کہ "صحابہ تمام اطرافِ ملک میں پھیل گئے تھے، ان کے فتاویٰ اور احکام اپنے اپنے مقام میں وراثتہً ان کے فقہاء و علماء تک پہنچے ہیں اور ہر جگہ وہی مقبول ہیں، ایسی حالت میں ایک شخص کی رائے و عقل پر جو صحت و غلطی دونوں کرسکتا ہے، تمام ملک کو مجبور کرنا مناسب نہیں" منصور نے کہا "اگر آپ مجھ سے متفق ہوتے تو میں یہی کرتا"[1] ایک بار اس نے پوچھا کہ "اے ابو عبداللہ! تم سے بھی زیادہ کوئی عالم ہے؟" امام نے فرمایا "ہاں" پوچھا "وہ کون ہے" فرمایا "ان کا نام یاد نہیں"۔ منصور نے کہا "میں بنو امیہ کے زمانہ میں طلبِ علم کرچکا ہوں سب کو جانتا ہوں"[2]

امام مالک کے فضل و کمال کا اعتراف منصور نے نہ صرف امام کے سامنے کیا بلکہ پیٹھ پیچھے بھی کرتا تھا، ایک بار ان کی عدم موجودگی میں فرمایا کہ "سفیان ثوری اور امام مالک ابن انس کے سوا کوئی نہیں جس کا ادب کیا جائے"[3]

نئے تاجدار امویوں کے استیصال اور بیخ کنی میں لگے ہوئے تھے اور منصور نے احتیاطاً یا سوءِ ظن کی بنا پر فاطمی و علوی سادات کی بیخ کنی شروع کردی، آخر تنگ آکر ان ہی سادات میں سے ۱۴۵ھ میں محمد نفس زکیہ نے مدینہ میں علمِ بغاوت بلند کردیا، اکثر لوگوں نے ان کا ساتھ دیا لیکن تقدیر ساتھ نہ تھی، بڑی بہادری سے میدانِ جنگ میں لڑے مگر مارے گئے، ان کے بعد ان کے بھائی ابراہیم اس ساز و سامان سے نکلے کہ منصور بدحواس ہوگیا، چند مہینوں کی جنگ کے بعد ابراہیم کی شہادت پر جنگ ختم ہوگئی، منصور نے اپنے عم زاد بھائی جعفر کو مدینہ کا والی مقرر کیا۔

امام مالک منصور کی نوازشوں کے باوجود ان تمام کوششوں میں حق کے ساتھ تھے۔ امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ "خلافت نفس زکیہ کا حق ہے" لوگوں نے پوچھا "ہم منصور کی بیعت پر حلف اٹھا چکے ہیں"۔ امام صاحب نے فرمایا "منصور نے جبراً بیعت لی تھی۔ اور جو کام جبراً کرایا جائے شریع میں اس کا اعتبار نہیں، حدیث میں ہے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔ کتاب الامامۃ ابن قتیبہ ج ۲ مناقب مالک للزواوی۔ [2] مناقب زواوی [3] ان واقعات کے لئے دیکھو کتاب الامامہ ج ۲۔ ابن خلدون ج ۳۔

Marfat.com

کہ اگر جبراً طلاق کسی سے دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی"۔

طلاق مکرہ کا فتویٰ | جعفر نے مدینہ پہنچ کر نئے سرے سے لوگوں سے بیعت لی، امام مالک نے کہیں یہ سنا کہ آئندہ طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں کہ لوگوں کو بیعت جبری کی بے اعتباری و عدم صحت کے لئے سند ہاتھ آئے، لیکن امام صاحب نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور بدستور جبری معاملہ کے عدم صحت کا فتویٰ دیتے رہے، جعفر نے غضب ناک ہوکر حکم دیا کہ ان کو ستر کوڑے مارے جائیں، چنانچہ امام دار الہجرۃ مکانِ امارت میں گنہگاروں کی طرح لائے گئے، کپڑے اتارے گئے اور شانۂ امامت پر دستِ ظلم نے ستر کوڑے پورے کئے، تمام پیٹھ لہولہان ہوگئی، دونوں ہاتھ مونڈھے سے اتر گئے، اس پر بھی جعفر کی تسلی نہ ہوئی تو حکم دیا کہ اونٹ پر بٹھا کر شہر میں ان کی تشہیر کی جائے، امام صاحب بایں حال زار بازاروں اور گلیوں سے گزر رہے تھے اور زبانِ صداقت نشان باوازِ بلند کہہ رہی تھی "جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا ہے وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں، فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری درست نہیں"[1]۔

اس کے بعد اسی طرح خون آلودہ کپڑوں میں مسجدِ نبوی میں تشریف لائے، پشت مبارک سے خون صاف کیا اور دو رکعت نماز پڑھ کر لوگوں سے فرمایا کہ "سعید بن مسیب کو جب کوڑے مارے گئے تھے تو انہوں نے بھی مسجد میں آکر نماز پڑھی تھی"[2] یہ تعزیر گو تحقیر کے لئے تھی لیکن اس نے امام کی عزت و وقار کے پایہ کو اور بلند کر دیا، یہ واقعہ سنہ ۱۴۶ھ کا ہے[3]۔

منصور کی لاعلمی اور ندامت | جعفر والی مدینہ کی یہ حرکت منصور کو پسند نہ آئی اور فوراً اس کو معزول کر کے بذلت تمام گدھے پر سوار کر کے بغداد طلب کیا اور امام مالک کو معذرت کا خط لکھا۔

دوسرے سال سنہ ۱۴۷ھ میں جب کہ تمام حجاز و عراق میں سکون ہو چکا تو حج کے ارادہ سے منصور حجاز آیا، امام مالک ملنے کو آئے اور بعض روایتوں میں ہے کہ حج سے پہلے خود امام کو بغداد بلا بھیجا اور نہایت تعظیم سے ملا اور بوثوق کہا کہ "نہ میں نے تعزیر کی اجازت دی اور نہ مجھے اس کا علم ہوا" امام صاحب نے فرمایا کہ "ہاں آپ کو اطلاع نہ ہوگی" منصور نے خلعت پیش کیا، قاعدہ تھا کہ خلعت کے کپڑے درباری

---

[1] طبقات ابن سعد ترجمہ مالک، مناقب للزواوی [2] تزیین الممالک عن الخطیب روایۃ عن ابی وہب۔ [3] کتاب الانساب سمعانی ترجمہ

کے کندھے پر رکھ دیے جاتے تھے، حاجب نے بھی عام طریقہ امام صاحب کے ساتھ برتنا چاہا، امام صاحب پیچھے ہٹ گئے، منصور نے حاجب کو ڈانٹا کہ اس خلعت کو آپ کے فرودگاہ میں پہنچا دو۔

منصور کو ایک بار معلوم ہوا کہ علماء میری حکومت سے ناراض ہیں تو اس نے خلاف وقت شب کو ابن ابی ذئب و ابن سمعان اور امام مالک کو طلب کیا، امام صاحب واقعہ سمجھ گئے، زندگی سے ناامید ہو کر، غسل فرما کر کفن کے کپڑے پہن کر، اور حنوط مل کر دربار میں آئے، منصور نے کہا اے گروہ فقہاء مجھ کو ایک خبر معلوم ہوئی ہے جس کا افسوس ہے، تمہارا فرض تھا کہ پہلے تم لوگ میری اطاعت کرتے اور مجھ کو برا کہنے سے باز رہتے۔ پھر اگر مجھ میں کچھ عیب تھا تو مجھ کو نصیحت کرتے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ اے امیر المومنین! ... کا ارشاد ہے:۔

یاایھا الذین امنوا ان جاءکم	مسلمانو! اگر کوئی فاسق تم کو کچھ خبر دے
فاسق بنبا فتبینوا ان تصیبوا	تو اس کی تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ نادانستگی
قوما بجہالۃ فتصبحوا علی ما	میں بے گناہوں کو ستاؤ، پھر اپنے کیے
فعلتم ندمین (حجرات ۱۳)	پر تم کو ندامت ہو۔

منصور نے کہا اچھا بتاؤ کہ میں تمہارے نزدیک کیسا ہوں؟ امام نے فرمایا مجھے اس کے جواب دینے سے معاف کرو، منصور نے ابن سمعان کی طرف رخ کیا، وہ بولے "امیر المومنین آپ سب سے بہتر ہیں، حج کرتے ہیں، جہاد کرتے ہیں، مظلوموں کی امداد کرتے ہیں، اسلام کے پشت پناہ ہیں، عادل ہیں، اب منصور نے ابن ابی ذئب سے پوچھا کہ تم مجھ کو کیسا سمجھتے ہو، ابن ابی ذئب نے نہایت دلیری سے کہا کہ "تم بدترین مخلوق ہو، مسلمانوں کی تمام دولت اپنی شان و شوکت میں صرف کرتے ہو، غریبوں کو ہلاک اور امیروں کو پریشان کر ڈالا، بتاؤ کل تم خدا کے سامنے کیا جواب دو گے" منصور نے کہا "تم دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے یہ کیا چیز ہے" ابن ابی ذئب نے کہا "ہاں ننگی تلواریں دیکھتا ہوں لیکن آج کی موت کل کی موت سے بہتر ہے"

تھوڑی دیر کے بعد ابن سمعان اور ابن ابی ذئب چلے گئے لیکن امام تشریف فرما رہے، منصور نے کہا "مجھے آپ کے کپڑوں سے حنوط کی بو آتی ہے" امام صاحب نے فرمایا اس بے وقت کی طلبی سے میں اپنی زندگی

سے مایوس ہو کر آیا تھا، منصور نے کہا "سبحان اللہ ابو عبداللہ! کیا میں خود اپنے ہاتھ سے اسلام کا ستون گراؤں گا"[1]

۱۵۸ھ میں منصور نے انتقال کیا اور محمد المہدی اس کا جانشین ہوا اور ۱۶۰ھ میں حج کے ارادہ سے عازم حجاز ہوا، حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ آیا، شہر کے قریب پہنچا تو شرفاء و علمائے شہر نے استقبال کیا جن میں امام مالک بھی تھے، مہدی نے امام کو سلام کر کے سینہ سے لگالیا۔ اس سال حجاز میں سخت قحط تھا، موقع پا کر امام نے فرمایا "امیر المومنین اس وقت آپ جس شہر میں جا رہے ہیں وہاں مہاجرین و انصار کی اولاد آباد ہے، وہ روضۂ نبویؐ کے ہم سایہ ہیں" مہدی امام کا مقصد سمجھ گیا اور ۲۵ لاکھ درہم امام کے پاس بھیج دیئے کہ تقسیم کرا دیجئے، امام نے رقم اپنے معتمد تلامذہ کے حوالہ کی کہ حسب حاجت لوگوں میں تقسیم کر دیں۔[2]

ایک مرتبہ تین ہزار دینار اپنے حاجب اعظم ربیع کے ہاتھ امام کی خدمت میں بھیجے اور خواہش ظاہر کی کہ آپ بغداد میرے ساتھ چلیں۔ امام صاحب نے قاصد سے کہا تھیلیاں اب تک سربستہ اسی طرح پڑی ہیں، جی چاہے لے جاؤ، لیکن مالک مدینہ نہیں چھوڑ سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، المدینۃ خیر لھم لو کانوا یعلمون۔[3]

ایک مرتبہ مہدی نے سواری بھیجی کہ اس پر سوار ہو کر بارگاہ خلافت میں آئیں، امام نے سواری واپس کر دی کہ میں مدینہ میں سوار ہو کر نہیں نکلتا کیونکہ ان گلیوں میں رسول اللہ چلتے پھرتے تھے، پیادہ آئے، بیمار تھے، اس لئے بعض مشاہیر علمائے مدینہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے، مہدی نے کہا سبحان اللہ! اگر میں خود یہ خدمت ان سے لینا چاہتا تو شاید ان میں سے کوئی قبول نہ کرتا، مغیرہ نے کہا "امیر المومنین! مالک جس سے ٹیک لگا کر بیٹھیں وہ اس کے لئے شرف ہے"[4]

مہدی نے اسی سفر میں موطا کی سماعت کی بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ مہدی ہی کے لئے امام نے موطا لکھی، گو یہ صحیح نہیں، مہدی نے موسیٰ و ہارون اپنے دونوں بیٹوں کو حکم دیا کہ امام سے موطا سنیں، شہزادوں

---

[1] کتاب الامامہ والسیاسۃ ج ۲۔ [2] کتاب الامامہ والسیاسۃ ج ۲ و مناقب مالک للزواوی [3] تذکرۃ ذہبی ج ۱۔

[4] زواوی عن ابی مصعب۔

نے امام کو بلا بھیجا، امام صاحب نے فرمایا "علم بیش قیمت شے ہے اس کے پاس خود شائقین آتے ہیں"، اس جواب پر مہدی کی اجازت سے دونوں شہزادے خود مجلس درس میں حاضر ہوئے، شہزادوں کے اتالیق نے کہا پڑھ کر سنایئے، امام صاحب نے فرمایا کہ ہمارے علماء کا دستور یہ ہے کہ طلبہ پڑھیں، شیوخ سنیں، مہدی کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے کہا ان علماء کی اقتدا کرو اور تم خود پڑھو، چنانچہ شہزادوں نے خود پڑھا اور امام نے سماعت کی۔[لہ]

سنہ ۱۷۰ھ میں ہارون الرشید خلیفہ ہوا، خلافت کے پہلے ہی سال حج و زیارت کے لئے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ حاضر ہوا، لوگ پیادہ استقبال و تہنیت کے لئے نکلے، امام صاحب بھی محمل میں سوار ہو کر آئے، ہارون الرشید نے ان کو دیکھ کر بڑی مسرت ظاہر کی اور کہا "آپ کی تصنیفات پہنچیں، میں نے خاندان کے نوجوانوں کو ان کے مطالعہ کی تاکید کی ہے، لیکن اس کا کیا سبب ہے کہ میں نے ان میں ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کی روایتیں نہیں پائیں؟" امام نے فرمایا امیر المومنین! یہ دونوں بزرگوار ہمارے شہر میں نہ تھے۔

سنہ ۱۷۴ھ میں ہارون الرشید اپنے دونوں شہزادوں امین و مامون کو لے کر حج کے لئے آیا اور مؤطا کے املاء کے لئے امام کو سراپردۂ خلافت میں طلب کیا، امام صاحب نے انکار کیا اور خود مؤطا کے بغیر تشریف لائے، ہارون رشید نے شکایت کی، امام صاحب نے فرمایا "علم تیرے گھر سے نکلا ہے، خواہ اس کو ذلیل کر، خواہ اس کو عزت دے۔" یہ سن کر ہارون رشید متاثر ہوا، اور امین اور مامون کو لے کر مجلس درس میں حاضر ہوا، وہاں طلبہ کا ہجوم تھا، ہارون رشید نے امام سے کہا "اس بھیڑ کو الگ کر دیجئے۔" امام نے فرمایا "شخصی فائدہ کے لئے عام افادہ کا خون نہیں کیا جا سکتا۔" ہارون رشید مسند پر بیٹھ گیا، امام نے فرمایا امیر المومنین "تواضع پسندیدہ ہے۔" یہ سن کر ہارون نیچے اتر گیا۔ اور امام سے درخواست کی کہ آپ قرأت کیجئے، امام نے فرمایا "خلاف عادت ہے۔" اور معن بن عیسیٰ کو جو ایک مستعد طالب علم تھے اور آگے چل کر بڑے بڑے محدثین کے استاد ہوئے اشارہ کیا، انہوں نے قرأت شروع کی، اور ہارون نے مع شہزادوں کے سماعت کی۔

اس سفر میں شام و عراق و حجاز کے کل علماء ساتھ تھے، قاضی ابو یوسف بھی اس مجمع میں شریک تھے

لہ ۔ تزیین الممالک ۔

ہارون رشید نے ان سب علماء کی ایک علمی مجلس منعقد کی، امام صاحب مسندِ تدریس پر رونق افروز ہوئے موطا کا املا شروع ہوا، ہر مسئلہ کے اختتام پر فقہاء و محدثین سکوت کی زبان سے سحت کا اعتراف کرتے جاتے تھے، فقہی معلومات کا ایک دریا تھا جو زبان امامت سے امنڈ امنڈ کر سواحل قلوب تک پہنچ رہا تھا۔

ہارون رشید کے نام امام مالک کا ایک رسالہ بھی ہے جس میں امام نے ہارون کو نصائح کئے ہیں اور آداب وسنن کی تعلیم دی ہے، رسالہ مصر میں ۱۳۲۲ھ میں چھپ گیا ہے اور لاہور میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

وفات

آخر عمر میں اتنے ضعیف و ناتواں ہو گئے تھے کہ مسجد نبوی کی حاضری، جماعت میں شرکت اور عیادت شادی کی تقریبوں میں آنا جانا بند ہو گیا تھا، لوگ اعتراض کرتے تو فرماتے کہ "ہر شخص اپنا ہر عذر بیان نہیں کر سکتا" معن بن عیسیٰ (م ۱۹۸ھ) جو امام کے عزیز ترین شاگرد تھے امام کے خادم تھے، امام صاحب انہی کے سہارے چلتے تھے لیکن اس ضعف و ناتوانی کے عالم میں بھی درس و افتا کی خدمت جاری تھی۔ یحییٰ بن یحییٰ اندلسی مصمودی امام اندلس جب دوسری بار مصر سے لوٹ کر مدونہ کی سند لینے کے لئے آئے تو امام صاحب بستر مرض الموت پر تھے۔

اتوار کے روز بیمار پڑے اور تقریباً تین ہفتہ بیمار رہے، مرض کی شدت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی، لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب وقت آخر ہے، مدینہ کے تمام علماء و امراء آخری دیدار کے لئے جمع ہو گئے، یحییٰ اندلسی کا بیان ہے کہ مجھے تو اپنی محرومی کا رونا تھا ہی، وہ لوگ بھی جو مدتوں امام کی ملازمت کا شرف حاصل کر چکے تھے وہ بھی روتے تھے، تلامذہ کے علاوہ حدیث و فقہ کے ایک سو ساٹھ علماء مؤدب باچشم گریاں پاس بیٹھے تھے۔

نبض کی حرکت آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی، آنکھوں سے آنسو جاری تھے، قعنبی جو امام کے اخص تلامذہ میں تھے وہ اس وقت حاضر ہوئے، اور گریہ کا سبب دریافت کیا، فرمایا کہ "قعنبی! میں نہ روؤں تو کون روئے

اے کاش! مجھ کو میرے ہر قیاسی فتویٰ کے بدلہ ایک کوڑا مارا جاتا اور میں فتویٰ نہ دیتا۔ گریہ جاری تھا اور لب متحرک تھے کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

امام صاحب بروایت صحیح ۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ھ کو انتقال فرمایا، چھیاسی برس کی عمر پائی، ۱۱۱ھ میں مسندِ درس پر قدم رکھا اور باسٹھ برس تک علم و دین کی خدمت میں مصروف رہے۔ جنازہ میں ایک خلقت کا ہجوم تھا، والیٔ مدینہ عبداللہ بن محمد ہاشمی خود پیادہ پا شریک تھا، اور نعش اٹھانے والوں میں داخل تھا، جنت البقیع جس کی خاک میں اسلام کے ارکان عظام و اعلام کرام مدفون ہیں امام مدینہ کا جسدِ مبارک بھی اسی خاک کو سپرد ہوا۔[1]

دور دراز شہروں اور ملکوں کے علماء کو جب امام کی وفات کی خبر پہنچی تو ہر جگہ ماتم کیا گیا، کوفہ میں سفیان بن عیینہ کو جب معلوم ہوا تو ان پر سکوت طاری ہو گیا اور جب بولے تو یہ بولے کہ "روئے زمین پر مالک نے اپنی مثال نہیں چھوڑی۔" حماد بن زید نے کہا "خدا ان پر رحم کرے، مذہب میں ان کا بڑا مقام تھا۔"

امام کی تاریخ و پیدائش و وفات پر ایک بزرگ نے یہ قطعہ کہا ہے۔

فخر الائمۃ مالک	نعم الامام سالک
مالک اماموں کے فخر ہیں	پیرو کے لئے بہترین پیشوا ہیں
مولدہ "نجم ھدی"	وفاتہ "فاز مالک"[2]
ان کی تاریخ پیدائش ہدایت کا ستارہ ہے	اور ان کی تاریخ وفات یہ ہے کہ مالک کامیاب ہے
۹۳ھ	۱۷۹ھ

اخلاق و عادات اور ذاتی حالات

طاعت الٰہی امام کا شمار عبادِ زمانہ میں تھا،[3] درس و افتاء سے جو وقت بچتا وہ زیادہ تر

[1] ان بیانات کے لئے ملاحظہ ہو ابن خلکان ج ۲۔ تزیین الممالک [2] بستان المحدثین [3] کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر عباد۔

عبادت اور تلاوت میں صرف ہوتا، امام کی خواہر محترمہ سے کسی نے پوچھا کہ امام مالک گھر میں کیا کرتے تھے جواب دیا ان کے دو کام تھے "المصحف والتلاوۃ"[۱] امام صاحب کی صاحبزادی سے منقول ہے کہ امام جمعہ کی شب عبادت و طاعت میں مشغول رہتے تھے، امام صاحب کے بھانجے ابن ابی یونس سے روایت ہے کہ امام مہینہ کی پہلی تاریخ کو شب زندہ دار رہتے تھے[۲]۔

حب رسول حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا بے حد ادب کرتے تھے، جب نام مبارک زبان پر آتا چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا، لوگ پوچھتے تو فرماتے کہ ہم نے جن مقدس بزرگوں کی زیارت کی ہے ان کی حالت مجھ سے بھی بڑھ کر تھی[۳]۔

مسجد نبوی میں جس کے ایک حجرہ میں روضۂ انور ہے، شور وغل ناپسند فرماتے کہ یہ آستانۂ نبوت سے گستاخی ہے، کلام نبوی اس وقت تک زبان پر نہیں آتا جب تک وضو یا غسل فرما کر با ادب بیٹھ نہ لیتے، امام کے اصطبل میں کثرت سے گھوڑے اور خچر تھے، مگر کبھی مدینہ کی گلیوں میں سوار ہو کر نہ نکلے، لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ "مجھے شرم آتی ہے کہ جو سرزمین قدوم نبویؐ سے مشرف ہوئی ہے اس کو میں جانوروں کے سموں سے روندوں[۴]"، ذات نبوی کی محبت اور حدیث نبوی کے شغل وانہماک کے سبب سے کوئی شب ایسی نہ گزرتی جس میں عالم رویا میں زیارت نبویؐ کا شرف حاصل نہ ہوتا[۵]۔

حب مدینہ امام کو مدینہ سے غایت درجہ محبت تھی، بجز سفر حج کبھی مدینہ سے باہر نہیں نکلے، منصور نے بغداد کی سکونت کے لئے درخواست کی، پذیرا نہ ہوئی، مہدی نے تین ہزار دینار بھیجے اور کہلا بھیجا کہ بغداد کا عزم کیجئے، فرمایا "اشرفیاں علیٰ حالہا رکھی ہیں، جی چاہے تو لے جاؤ مگر مالک سے مدینہ نہیں چھوٹ سکتا[۶]۔"

انتہائے محبت یہ ہے کہ جمہور اسلام کے خلاف امام مکہ معظمہ پر مدینہ منورہ کو فضیلت دیتے ہیں[۷]۔

فیاضی امام مالک طبعاً فیاض تھے، ایک بار امام شافعی کو لے کر اصطبل کا ملاحظہ کر رہے تھے، امام شافعی

---

۱ مناقب مالک للزواوی ۲ تزئین الممالک ۳ مناقب مالک للزواوی ۴ ابن خلکان ج ۲ و بستان المحدثین ۵ تزئین عن ابی نعیم والخطیب ۶ تذکرہ ذہبی ج ۱۔ ۷ اعلام علماء الاعلام عبدالکریم بن عبداللہ مکی۔

نے بعض گھوڑوں کی تعریف کی، امام صاحب نے تمام اصطبل ان کی نذر کر دیا[1] ہر سال امام شافعی کو گیارہ ہزار دینار مرحمت فرماتے تھے۔

مہمان نوازی مہمان نوازی عربوں کا خاصہ اور ایک مومن کا فرض ہے لیکن امام صاحب کا اخلاق میزبانی اس سے بھی زیادہ تھا۔ امام شافعی جو طالب علم کی حیثیت سے ان کے گھر میں ٹھہرتے تھے، امام ان کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے خوان اٹھا کر لاتے تھے، صبح کی نماز کے لئے اپنے ہاتھ سے پانی لاکر رکھتے تھے، باوجود وقار کے رخصت کے وقت خود بازار تک جاکر سواری کر دی، اور روپے کی ایک تھیلی زادِ راہ کے لئے عنایت کی۔[2]

صبر و استقلال استقلال و ضبط کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ موزہ میں بچھو تھا، امام مالک نے بے خبری میں اس کو پہن لیا، اور مجلس درس میں آکر بیٹھ گئے، بچھو نے مسلسل سترہ بار ڈنک مارا لیکن آدابِ مجلس کے خیال سے امام نے پہلو تک نہ بدلا، چہرہ کا رنگ بار بار متغیر ہو رہا تھا، اختتام درس کے بعد عبداللہ بن مبارک نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ موزہ میں بچھو ہے۔[3]

حلم و عفو خودداری و جلالت شان کے ساتھ حلم و عفو جو ایک گراں قدر جوہر ہے، اکثر جمع نہیں ہوتا، لیکن امام میں یہ دونوں صفتیں مجتمع تھیں، ایک طرف تو منصور و رشید جیسے قہار سلاطین کو ڈانٹ دیتے تھے، دوسری طرف آپ کے شانۂ مبارک پر ذلیل ہاتھوں سے کوڑا مارا جاتا ہے تو آپ انگیز کرتے ہیں اور منصور جب مجرم کی سزا کا ذکر کرتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے معاف کیا۔[4]

حق گوئی و آزادی امام صاحب خلفاء کے دربار میں آمد و رفت رکھتے تھے، بعض لوگوں کو اس پر اعتراض تھا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ "اگر نہ جاؤں تو حق گوئی کا موقع کہاں ملے؟"[5] امام صاحب کو اس لئے کوڑے مارے گئے کہ حق کے اظہار میں انہوں نے حکومت کی پروا نہ کی۔ ایک بار منصور نے مسجد نبویؐ میں زور و شور سے مناظرہ شروع کیا، امام نے فرمایا کہ ادب ملحوظ رہے لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ،

---

[1] توالی التاسیس معالی ابن ادریس لابن حجر [2] مرات الاوراق ابن حجہ حموی ج ۱۔ [3] بستان المحدثین [4] کتاب الامامہ ابن قتیبہ ج ۲۔ [5] مناقب مالک للزواوی۔

عباسیوں کے مقابلہ میں محمد نفس زکیہ نے جب علم بلند کیا تو آپ نے علی الاعلان فتویٰ دیا کہ خلافت محمد نفس زکیہ کا حق ہے، عباسیوں نے زبردستی بیعت لی ہے۔

خودداری علم کی شان یہ ہے کہ اس کی جلالت ملحوظ رکھی جائے تاکہ لوگوں میں اہل علم کا وقار قائم رہے اور ان میں اکتساب علم کا ذوق پیدا ہو، امام مالک نے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ اوپر گزر چکا ہے کہ امام صاحب مجلس درس میں بڑے وقار و متانت اور خودداری کے ساتھ بیٹھتے تھے، لوگ اعتراض کرتے تو فرماتے کہ اریدان اجل العلم یعنی "میں چاہتا ہوں کہ علم کی شان بڑھاؤں"۔ بڑے بڑے امراء اور حکام آستانہ امامت پر حاضر ہوتے ہوئے کانپتے تھے، رشید نے اپنے خیمہ میں املائے حدیث کے لئے بلایا تو فرمایا "لوگ علم کے پاس آتے ہیں، لوگوں کے پاس علم نہیں جاتا"۔ رشید خود آیا تو مسند درس پر بیٹھنا چاہا، فرمایا تواضع محبوب ہے، رشید نے کہا آپ پڑھیئے، فرمایا اپنی یہ عادت نہیں[1]۔

منصور کے دربار کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی دربار میں آتا تو خلیفہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا، امام نے کبھی یہ ذلت گوارا نہ کی۔

انصاف پسندی لیکن اس خودداری اور اس اظہار حق سے زیادہ گراں قیمت اور مشکل الحصول شئے انصاف پسندی ہے، وہ بھی اپنے نفس کے مقابلہ میں۔ امام صاحب کا یہ حال تھا کہ جس مسئلہ پر عبور نہ ہوتا تو بمتانت فرما دیتے کہ "مجھے نہیں معلوم"۔ آپ کے ایک شاگرد کا قول ہے کہ میں امام کے "نہیں معلوم" کو لکھا کرتا تو تختیاں بھر جاتیں۔

ابن القاسم امام کے ایک شاگرد نے کہا کہ مصر کے علماء بیع و شراء کے مسائل میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، امام مالک نے پوچھا، انہوں نے کس سے ان کی تعلیم پائی، ابن القاسم نے کہا کہ آپ سے، فرمایا کہ مجھے تو خود ان میں دخل نہیں[2]۔

اہل علم کی عزت خلیفہ ہارون رشید مجلس درس میں آیا تو اس کو مسند سے نیچے اتر کر بیٹھنا پڑا لیکن ایک بار امام ابوحنیفہ تشریف لائے تو امام نے اس قدر تعظیم کی کہ ان کے لئے اپنی چادر فرش پر کچھا دی، وہ اٹھ

---

[1] مناقب مالک، عزّاوی [2] مختصر جامع بیان العلم لابن عبد البر

گئے تو طلبہ سے کہا کہ یہ عراق کے ابو حنیفہ ہیں، جو اس ستون کو سونا ثابت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، اس کے بعد کوفہ کے محدث سفیان آئے تو ان کی بھی تعظیم کی لیکن اس سے کم، ان کے چلے جانے کے بعد فرمایا کہ لوگوں کی علمی قدر مراتب عزت کرنی چاہیئے۔

عبدالرحمن ... تمام آپ کے شاگرد تھے لیکن جب ان کو خط لکھتے ... تو فقیہہ مصر ... کرتے تھے، ایک بار آپ کے نامور شاگرد و قعنبی محدث مدینہ آرہے تھے، تو امام صاحب اپنے تلامذہ کو لے کر خود بنفس نفیس ان کے استقبال کے لئے شہر سے باہر نکل آئے۔[1]

حُلیہ رنگ سُرخ و سپید، قد بلند و بالا، بدن بھاری، پیشانی کشادہ، آنکھیں بڑی، ناک اونچی، داڑھی بڑی اور گھنی، سر میں قدرتاً بال نہ تھے، مونچھوں کو بہت چھوٹی کرانا ناپسند کرتے تھے، خضاب کا استعمال کبھی نہیں کیا۔

پوشاک مزاج میں صفائی اور نزاہت غایت درجہ تھی، ہمیشہ نفیس اور بیش قیمت پوشاک زیب بدن فرماتے تھے، بعض لوگ اس پر ٹو... ...اتے کہ میں اس شہر (مدینہ) کے جس عالم سے ملا اس کو خوش پوشاک پایا، امام صاحب کو اپنے کپڑوں کا خاص اہتمام تھا، عدن کے کپڑے، اس زمانے میں مشہور اور بیش قیمت ہوتے تھے، وہاں سے اپنے لئے کپڑے منگواتے تھے، کبھی کبھی مرو کے بنے ہوئے کپڑے بھی استعمال کرتے۔[2]

خوشبو کا استعمال ہمیشہ کرتے تھے، عود کی انگیٹھیاں جلتی رہتی تھیں، کپڑے خوشبو سے بسے رہتے تھے، جس گلی سے ایک بار نکل جاتے، دیر تک اس میں خوشبو پھیلی رہتی اور اکثر فرماتے کہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ خدا نے جس کو نعمت دی ہو اس کے آثار اس پر ظاہر نہ ہوں، کبھی کبھی طیلسان کا بھی استعمال کرتے جو اس زمانہ میں علماء کی نشانی تھی، عمامہ جب زیب سر فرماتے تو شملہ گلے میں لپیٹ کر دائیں یا بائیں شانہ پر ڈال لیتے، ہاتھ میں ایک چاندی کی انگوٹھی تھی، جس کے سیاہ پتھر کے نگینہ پر حسبنا اللہ ونعم الوکیل نقش تھا۔

امام مالک کا یہ شرف کیا کم ہے کہ مدینہ مطہرہ کی خاک پاک جسم مبارک کا عنصر تھی، لیکن اس سے بھی

---

[1] تذکرۂ ذہبی ج ۱۔ [2] ابن ندیم مطبوعہ یورپ و مرأۃ الجنان ج ۱ و بستان المحدثین۔

زیادہ شرف یہ ہے کہ مسکن وہ تھا جو حضرت عبداللہ بن مسعود کا مکان تھا اور مجلس نشست گاہ وہ تھی جو حضرت عمر فاروقؓ کا دولت خانہ تھا۔ یہیں اکثر املائے حدیث کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، اس بناپر امام مالک نہ صرف علوم و معارفِ فاروقی کے وارث تھے، بلکہ ان کی مادی جائیداد کا بھی خدا نے انہیں وارث بنا دیا تھا۔

تصنیفات

اس عہد میمون میں تصنیف و تالیف کی ابتدا ہو چکی تھی، امام کے دستِ مبارک سے جو کتابیں ترتیب پائی ہیں یا ان کی طرف منسوب ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ **مؤطا**:۔ کی نسبت مفصل بحث آگے آئے گی، مؤطا اور ان کی دوسری تصنیفات میں پہلا امتیاز یہ ہے کہ مؤطا کی روایت امام کے تلامذہ نے کی ہے اور بقیہ رسائل و کتب صرف بعض تلامذہ کی روایت سے ثابت ہیں۔

۲۔ **رسالۃ مالک الی الرشید**:۔ یہ خلیفہ ہارون الرشید کے نام خط کے طور پر بائیس صفحہ کا ایک رسالہ ہے جس میں امام نے خلیفہ کو ہر قسم کے دینی و دنیاوی و اخلاقی نصائح کئے ہیں۔

بعض علماء نے اس بناپر اس کی نسبت امام صاحب کی طرف کرنے سے انکار کیا کہ اس میں بعض ضعیف و منکر حدیثیں ہیں، لیکن اصل یہ ہے کہ اخلاقیات میں محدثین اس قدر احتیاط نہیں کرتے تھے، ابن ندیم نے الفہرست میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ رسالہ چھپ گیا ہے اور لاہور میں کسی شخص نے اس کا اردو ترجمہ بھی چھاپا ہے۔

۳۔ **احکام القرآن**:۔ یہ خود امام کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور ماہر علوم قرآن علامہ ابو محمد مکی بن ابی طالب اندلسی متوفی ۴۳۷ھ کی تالیف ہے، امام مالک سے جو احکام قرآن یعنی آیات احکامیہ کی تفسیریں مروی ہیں ان کو علامہ موصوف نے اس میں یکجا کر دیا ہے اسی لئے اس کا پورا نام کتاب الماثور عن مالک فی احکام القرآن[1] ہے۔

---

[1] تزیین الممالک

۴۔ المدونۃ الکبریٰ :۔ فقہ مالکی کی ضخیم کتاب ہے، بعض لوگ اس کو خود امام کی تصنیف بتاتے ہیں حالانکہ عبدالرحمٰن بن قاسم متوفی ۱۹۱ھ امام کے ایک شاگرد کی تصنیف ہے، البتہ اس لحاظ سے امام کی تصنیف کہنا درست ہے کہ یہ کتاب درحقیقت ان کے "ملفوظات فقہیہ" کا مجموعہ ہے، ابن قاسم نے امام کے زمانہ میں مدینہ سے واپس آکر امام کے مجتہدات واقوال کو ایک کتاب کی صورت میں مدون کرنا شروع کیا تھا اور شاید اسی زمانہ میں ختم بھی ہو گئی تھی کیونکہ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی دوسری بار مصر سے مدونۂ ابن قاسم کو خود امام سے سننے کے لئے آئے تھے لیکن افسوس کہ امام اس وقت بستر مرض پر تھے[1]۔ مصر میں مدونہ چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے۔

۵۔ رسالۃ مالک الی ابن مطرف :۔ غسان بن محمد بن مطرف کے نام "فتویٰ" کی بحث پر ایک رسالہ ہے۔

۶۔ رسالۃ مالک الی ابن وہب :۔ امام کے شاگرد رشید ابن وہب کے نام سے مسئلہ قضا و قدر پر ایک مشہور رسالہ ہے، قاضی عیاض نے اس رسالہ کی تعریف کی اور لکھا ہے وھو من خیار الکتب فی ھذا الباب الدال علی سعۃ علمہ بھذا الشان۔

۷۔ کتاب الاقضیہ :۔ بعض قاضیوں کے لئے امام نے یہ رسالہ لکھا، غالباً اس میں عہدۂ قضا کے متعلق اصول وہدایات ہوں گے۔

۸۔ کتاب المناسک :۔ ابوجعفر زہری امام کے ایک دوست کا بیان ہے کہ یہ امام مالک کی سب سے بڑی تصنیف تھی جس میں حج کے احکام ومسائل تھے۔

۹۔ تفسیر غریب القرآن :۔ اس کی روایت خالد بن عبدالرحمٰن مخزومی نے امام سے کی ہے۔

۱۰۔ کتاب المجالسات عن مالک :۔ ابن وہب امام کے تلمیذ رشید نے امام کی مجالس میں حدیث وآثار واخلاق کے جملہ متفرق فوائد ونکات اس میں جمع کیے ہیں ۔ حافظ سیوطی نے یہ رسالہ دیکھا تھا۔

۱۱۔ تفسیر القرآن۔ قرآن مجید کی تفسیر بروایت احادیث مسندہ ہے۔ حافظ سیوطی نے اس کو

---

[1] ۔ ابن خلکان ترجمہ ابن قاسم

Marfat.com

دیکھا تھا اور اس کی تعریف کی ہے، لیکن یہ مشکوک ہے کہ آیا یہ خود امام کی تالیف ہے، یا کسی شاگرد نے امام سے اس کی تعلیق کی ہے۔

۱۲۔ کتاب المسائل :۔ ان رسائل وکتب کے علاوہ امام کی اور بھی تصنیفات تھیں۔ محدث خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ ابو العباس سفاح کے سامنے بہت سے منتشر اوراق پڑے تھے جن کی نسبت اس نے کہا کہ یہ امام صاحب کے ستر ہزار مسائل کا مجموعہ ہے[1]

موطاء

امام کی اصلی تصنیف "موطا" ہے جو قرآن پاک کے بعد کتب خانہ اسلام کی دوسری کتاب ہے اوّل کلام خدا ہے اور ثانی کلام رسول اللہ۔

۱۳۲ھ میں خلافت امویہ مٹ کر خلافت عباسیہ قائم ہوتی ہے، اسی کے پس وپیش عہد میں سینکڑوں مجموعہ ہائے حدیث مدون ہوئے۔ موطاء کی تالیف کا بھی یہی زمانہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اکثر صحابہ تعلیم وارشاد اور جہاد وغزا کی نیت سے بلاد مفتوحہ میں پھیل گئے تھے، لیکن صحابہ کا گروہ عظیم جن میں اکابر واجلہ فقہا داخل تھے، مدینہ ہی میں رہا۔ امام مالک کا عہد وہ ہے جب احادیث وروایات تمام بلاد اسلامیہ میں منتشر تھیں اس لحاظ سے ان کے عہد میں جن ملکوں میں مجموعہ ہائے حدیث کی تدوین ہوئی۔ وہ اپنے اپنے حدود ملکی کے اندر محدود تھے مگر نبوت اور مہبط وحی مدینہ میں جو علوم نبوی کا سب سے بڑا گنجینہ ہے حدیثوں کی جمع وترتیب جس خوش بخت کی قسمت میں تھی وہ امام مالک ہیں[2]۔

موطاء | موطا علوم مدینہ کا مجموعہ ہے، جہاں زر وجواہر کی اصلی کان تھی، تمام اکابر صحابہ واعاظم تابعین کا مسکن یہی شہر مبارک تھا۔ اس لئے یہ صحیفہ مقدس انہی بزرگوں کی روایات وفتاوی پر مبنی ہے۔ اس بنا پر یہ صحیفہ حقیقت میں صحیح ترین، اوثق ترین اور کامل ترین احکام اسلامیہ کا مجموعہ ہے[3]۔

---

[1] تزئین الممالک [2] ان معلومات کے لئے مقدمہ فتح الباری ملاحظہ ہو [3] مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب وکشف الظنون ج ۲

تالیف موطا | یہ ظاہر ہے کہ امام مالک ہمیشہ مدینہ ہی میں قیام فرما رہے، اس لئے اس تالیف کا مقام معلوم ہے لیکن صحیح زمانہ متعین نہیں، سنہ ۱۳۰ھ سے زوال بنی امیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے اس سے پہلے تصنیف و تالیف کا شغل عام نہ تھا، سنہ ۱۴۸ھ میں منصور نے آخری حج کیا ہے، اس وقت موطا متداول و مشہور ہو چکی تھی[1] اس لئے اس کا زمانہ تالیف ان دونوں کا درمیانی زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک روایت ہے کہ امام مالک نے منصور ہی کے حکم سے موطا کی تالیف شروع کی تھی، اس کی فرمائش تھی کہ اس مجموعۂ احکام میں نہ ابن عمرؓ کی سختیاں ہوں نہ ابن عباسؓ کی رخصتیں اور نہ ابن مسعودؓ کے شواذ[2]۔

امام صاحب جب موطا کی تالیف میں مشغول ہوئے اور اس کی خبر دوسرے لوگوں کو پہنچی تو مدینہ کے اور علماء بھی اپنی اپنی احادیث کا مجموعہ تیار کرنے لگے، لوگوں نے امام سے جا کر عرض کیا، تو آپ نے فرمایا کہ "صرف حسن نیت کو بقا ہے"۔ یہ پیشین گوئی کس قدر صحیح ثابت ہوئی، چنانچہ موطا نے امام مالک کے سوا کوئی موطا دنیا میں معلوم و باقی نہیں رہی، بعض لوگوں نے رشک کا انتقام دوسری طرح لیا، محمد بن اسحاق صاحب سیر و مغازی نے کہا "مالک کی کتابیں میرے پاس لاؤ میں ان کے عیوب دکھاؤں، مالک کی کتابوں کا ناقد تو میں ہوں[3]"۔

امام مالک نے تصنیف سے فارغ ہو کر اس کو شیوخ حدیث کی خدمت میں پیش کیا، سب نے بنہایت پسند کیا، عام اہل مدینہ کے لئے وہ دن عجیب مسرت کا تھا، جب ان کے مجموعۂ فضائل میں ایک اور فضیلت کا اضافہ ہو رہا تھا، سعدون نام کا ایک شاعر موطا کی تعریف میں کہتا ہے[4]۔

فبادر موطا مالک قبل فوته	فما بعده ان فات للحق مطلب
مالک کی موطا کو جلد لو، کھونے نہ پائے	اگر یہ کھو گئی تو حق کی جستجو کی پھر جگہ نہیں

---

[1] کشف الظنون جلد ۲ و جامع بیان العلم ابن البر۔ [2] کتاب الامامۃ والسیاسۃ ذکر منصور ج ۲۔ [3] تہذیب الکمال "مالک بن انس"۔ [4] بستان المحدثین ذکر امام مالک۔

ودع للموطا کل علم تریدہ   فان الموطا الشمس والغیر کوکب

اور موطا کے لئے ہر اس علم کو جس کو چاہتے ہو چھوڑ دو،   کہ موطا آفتاب ہے اور اس کے علاوہ دوسری کتابیں ستارہ ہیں۔

وجہ تسمیہ | موطا کے لغوی معنی "روندا ہوا" یا "چلا ہوا" کے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے، "روندے ہوئے یا چلے ہوتے" کے مجازی معنی یہ ہیں کہ "جس پر عام آئمہ اور علماء اور اکابر چلے ہوں اور جس کو ان سب کی رایوں نے روندا اور پامال کیا ہو یعنی سب نے اس کے متعلق گفتگو کی ہو اور اس سے اتفاق کیا ہو"[1] اس طرح گویا اس کے معنی "متفق" اور "مطابق" کے ہیں، چونکہ تمام شیوخ حدیث نے اس سے اتفاق و مطابقت کی، اس لئے اس کا نام موطا مشہور ہو گیا[2] میرے نزدیک اس سے زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ "موطا اس راستہ کو کہتے ہیں جس پر لوگ بکثرت گزرتے ہوں"۔ سنت کے معنی بھی راستہ کے ہیں، یہ وہ راستہ ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گزرے، موطا وہ پامال راستہ ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام صحابہ گزرے، غرض موطا کا لفظ اپنی حقیقت کا آپ مظہر ہے کہ یہ ان مسائل پر مشتمل ہے جن پر صحابہ کا عمل رہا ہے اور جمہور سلف جن پر چلے ہیں۔

تعداد مرویات | ابتداً موطا میں دس ہزار حدیثیں تھیں، لیکن امام کے خامہ صحت پسند نے تقریباً آٹھ ہزار حدیثیں قلم زد کر دیں، باقی سترہ سو ہیں ہیں جن میں سے مسند اور مرفوع چھ سو ہیں، مرسل دو سو پینتیس، موقوف چھ سو تیرہ، تابعین کے اقوال و فتاوی دو سو پچاسی، بلاغات مالک چھتر۔

موضوع | موطا کا موضوع صرف احکام فقہیہ ہیں، اس لئے وہ سینکڑوں ابواب و فصول جو بخاری و مسلم اور ترمذی وغیرہ میں نظر آتے ہیں موطا ان سے خالی ہے، کیونکہ فقہیات سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے اس بنا پر محدثین کی اصطلاح کے مطابق اس کو "کتاب السنن" کہنا چاہیئے۔

موطا اور دیگر فقہائے مجتہدین کے مجموعہ ہائے حدیث | چاروں مجتہدین فقہاء میں سے ہر ایک کے انتساب سے ایک مجموعہ حدیث موجود ہے لیکن امام مالک کے سوا کسی امام مجتہد کے قلم

[1] مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب۔ [2] ایضاً۔

سے علم حدیث کی کوئی تصنیف ظاہر نہیں ہوئی، وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ مسند ابی حنیفہ کے نام سے متعدد کتابیں موجود ہیں مگر دراصل یہ تمام کتابیں امام ابوحنیفہ کے سینکڑوں برس بعد، امام ممدوح کے تلامذہ کی تصنیفات اور غیر معروف مسانید سے لے کر محمد بن یعقوب اور حسین بن محمد بن خسرو وغیرہ نے تالیف کی ہیں اور ان کو مسند ابی حنیفہ اور مسند امام اعظم کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔

مسند امام شافعی کی حقیقت یہ ہے کہ امام شافعی نے اپنی تصنیفات میں بر سبیل استدلال جو حدیثیں روایت کی ہیں، ابوجعفر بن محمد بن مطر نیشاپوری اور ابوالعباس نام ایک شافعی نے ان کو یک جا کر دیا ہے، مسند احمد بن حنبل کی تالیف یقیناً امام احمد نے شروع کی تھی، لیکن وہ ابھی مسودہ تھا کہ امام موصوف نے وفات پائی، اس کی تبیض و ترتیب بعد کو امام احمد کے صاحبزادہ عبداللہ نے کی، جو افسوس ہے کہ اس میدان کے مرد نہ تھے، اسی لئے اس میں مدنی اور عراقی مسندوں میں تخلیط ہے اور صحیح احادیث کا التزام نہیں، گو خود امام ابن حنبل کو اس کا دعویٰ تھا۔

موطاء اور اس کی معاصر کتابیں موطاء سے قبل اور خود اس کے زمانہ میں بیسیوں مسانید اور موطائیں لوگوں نے لکھیں، جن میں سے بعض اب تک باقی ہیں لیکن اور موطاؤں اور موطائے امام مالک کے موازنہ سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ موطاء اور ان کتابوں میں وہی نسبت ہے جو صحیح بخاری کو مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی سے ہے، خود ان کتابوں کا فقدان اور عدم شہرت اس کی سب سے بڑی دلیل ہے، تین خاص وجوہ سے موطاء کا امتیاز بالکل روشن ہو جاتا ہے۔

(۱) موطاء سے پہلے جو حدیث کی کتابیں لکھی گئیں، ان کا منبع زیادہ تر صحابہ و تابعین کے آثار و فتاویٰ تھے، امام مالک نے موطاء میں احادیث صحاح و مسند یا منقطع و مرسل کو منبع اول اور آثار و فتاویٰ کو منبع ثانی قرار دیا۔

(۲) دوسرا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ ان میں صحت کا التزام نہیں کیا گیا تھا اور موطاء میں صرف اسی حدیث یا فتویٰ نے جگہ پائی ہے جس کو صحت کا شرف حاصل تھا۔

(۳) تیسری بات یہ کہ موطاء مدینہ میں تالیف ہوئی ہے اور اس کے رواۃ حجازی ہیں اور دیگر مسانید

اور موطا میں کوفہ، بصرہ، واسط، شام، یمن، خراسان اور رے وغیرہ میں لکھی گئیں، اس لئے ان کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے اور اس پر تمام علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ حجاز کی حدیثیں صحت، قوت اور جودت اسناد میں سب پر فائق ہیں۔

طبقاتِ کتب حدیث میں موطا کا درجہ علمائے حدیث نے کتب حدیث کو چار مختلف طبقات میں منقسم کیا ہے، طبقہ اولیٰ میں وہ تصانیف ہیں جن کے مصنفین حدیث کے امام اور فن کے نقاد تھے اور جن کی تصنیفات صحت، جودت، اسناد اور قبول محدثین کے لحاظ سے سب سے مقدم ہیں اور جن کے رجال حفظ، ثبوت، وثوق، شہرت میں معروف ہیں، اس طبقہ میں موطأ، بخاری اور مسلم داخل ہیں۔

طبقہ اولیٰ میں موطا کا درجہ عام علماء تو اس کو مسلم بلکہ ترمذی کے بھی بعد جگہ دیتے ہیں لیکن محققین قدماء اور عموماً متاخرین میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب اس کو بخاری سے بھی مقدم سمجھتے ہیں اور خود میں بھی بدطلب حدیث سے یہی اعتقاد جازم رکھتا ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ موطا میں مرسل، موقوف اور منقطع حدیثیں ہیں، جو صحیح کے لئے قادح ہیں، لیکن ان کا ارسال، وقف اور انقطاع موطا کی روایت کے لحاظ سے درست ہے، مگر حقیقت کی رو سے یہ تمام مراسیل و موقوفات و منقطعات، متصل، مرفوع و مسند ہیں اور خود ان کا رفع و اتصال و اسناد، امام بخاری و امام مسلم و ترمذی وغیرہ نے کیا ہے۔ اس بنا پر درحقیقت موطا میں کوئی مرسل، موقوف یا منقطع حدیث نہیں، اس میں جو حدیث بھی ہے اس پر (الا ماشاء اللہ) بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے، اس سے موطا کی صحت کے درجہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ موطا کو سب سے بڑا شرف یہ بھی حاصل ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں کلام اللہ کے بعد جو کتاب آئی وہ کلام الرسول کا یہی مجموعہ تھا جو ظاہر ہوئی، کشف الظنون میں ہے: "سب سے پہلی کتاب جو اسلام میں لکھی گئی ہے وہ موطا ہے"۔[1] قاضی ابوبکر ابن عربی م ۵۴۶ھ موطا کی شرح میں لکھتے ہیں،

---

[1] کشف الظنون ج ۲۔

"یہ پہلی کتاب ہے جو شریعت اسلامیہ میں لکھی گئی ہے" و حضرت سفیان کہتے ہیں: "سب سے پہلے مالک نے صحیح تالیف کی"

۲۔ باوجود نقش اول ہونے کے بھی اس کے بعد کی کتابیں اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتیں، جس کے متعلق آئمہ مجتہدین اور علمائے حدیث کی قوی شہادتیں موجود ہیں، امام شافعی م ۲۰۴ھ فرماتے ہیں "روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد کوئی کتاب موطا امام مالک سے زیادہ صحیح نہیں ہے"۔ ابوبکر ابن عربی فرماتے ہیں "یہ اسلام کی سب سے پہلی کتاب ہے اور سب سے پچھلی بھی، کیونکہ پھر اس کے مثل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی"۔

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کتاب الام میں امام شافعی اور کتاب الآثار میں امام محمد کی جو فقاہت ہے وہ موطا ہی کے صدقہ میں ہے۔

۳۔ امام مالک سے موطا کی روایت کرنے والے جس پایہ کے لوگ ہیں وہ بخاری اور مسلم کے نہیں ہیں اس لئے خواص و عوام کی نقل و روایت میں جو فرق ہے وہ یقیناً موطا و دیگر کتب کے نقل و روایت میں ہے۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مولفین حدیث میں جتنے واسطے کم ہوں گے اسی قدر ان کی تالیفات زیادہ معتبر اور مستند ہوں گی، بخاری و مسلم کی روایتیں عموماً پانچ چھ واسطوں سے مروی ہیں، موطا کی حدیثیں تین چار واسطوں سے زیادہ کی نہیں ہیں، امام بخاری کو اپنی بیس ثلاثیات پر ناز ہے اور موطا کی بنیاد ہی ثلاثیات پر ہے اس کے علاوہ اس میں چالیس ثنائیات ہیں۔

موطا کے نسخے موطا امام مالک صاحب سے تیس مختلف طریقوں سے مروی ہے جن میں مشہور سولہ نسخے ہیں، ان میں سے معتبر اور باوثوق گیارہ اور باوثوق تر چار ہیں، یعنی یحییٰ، ابن بکیر، ابو مصعب اور ابن وہب کے نسخے، لیکن متداول ترین اور مشہور ترین یحییٰ کی روایت والا نسخہ ہے، کتاب کی مشہور ترتیب یہ ہے۔ اول کتاب الجنائز، پھر کتاب الصلوٰۃ، پھر کتاب الزکوٰۃ، پھر کتاب الصیام، اس کے بعد تمام نسخے کتاب الحج تک متفق ہیں، کتاب الحج کے بعد سے پھر مختلف الترتیب ہیں[1] اس قسم کا اختلاف بخاری و مسلم سب میں ہے۔

[1] بستان المحدثین۔

Marfat.com

شرح و تعلیقات کسی تصنیف کے قبول و ہر دلعزیزی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کو شارحین، معلقین و محشین کی ایک بڑی جماعت ہاتھ آئے اور اس میں کمیت سے زیادہ اصل چیز کیفیت ہو، موطا ان دونوں خصوصیات کے لحاظ سے خوش قسمت ہے۔ تقریباً پچیس علمائے کبار نے اس کی شرح و تعلیق اور دیگر خدمات انجام دی ہیں، قدما میں ابن حبیب مالکی متوفی ۲۳۹ھ، امام ابو سلیمان خطابی م ۳۸۸ھ، ابن رشیق قیروانی م ۴۵۶ھ، محدث ابن عبدالبر م ۴۶۳ھ امام باجی اندلسی متوفی ۴۷۴ھ، قاضی عیاض متوفی ۵۴۴ھ، قاضی ابوبکر بن عربی متوفی ۵۴۶ھ اور متاخرین میں حافظ جلال الدین سیوطیؒ متوفی ۹۱۱ھ، علامہ زرقانی مصری، م ۱۱۲۲ھ، شاہ ولی اللہ دہلوی م ۱۱۷۶ھ وغیرہ داخل ہیں۔

امام خطابی، حافظ سیوطی، ابن عبدالبر، ابن حزم، ابوالولید باجی نے بحذف فتاوی صرف موطا کی احادیث کی تلخیص کی ہے، حافظ سیوطی نے رجال موطا کو علیحدہ کیا ہے، احمد بن عمران، اخفش بصری اور قاضی عیاض نے موطا کے لغات حل کئے ہیں، باجی اور دارقطنی نے موطا کے اختلاف نسخ پر بحث کی ہے، ابوالحسن علی بن محمد قابسی نے موطا کی صرف متصل الاسناد حدیثیں جمع کی ہیں، ابن بشکوال اور خطیب بغدادی نے صرف ان لوگوں کے حالات لکھے ہیں جنہوں نے امام سے موطا کی روایت کی ہے، غرض موطا کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد ستر کے قریب ہے۔

موطا کا ایک اور امتیاز سلاطین اور خلفائے اسلام میں سینکڑوں ایسے گزرے ہیں جو صاحب سیف و قلم تھے جن کے نام سے تخت و منبر دونوں عزت پاتے تھے لیکن کسی کے متعلق یہ ذکر نہیں ہے کہ اس نے طلب علم و اخذ سند کے لئے کوئی سفر کیا ہو کیونکہ خود ان کا دربار اساتذہ کا مرکز اور علماء کا مرجع ہوتا تھا، تنہا امام مالک کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ ان کی کتاب موطا کے لئے مہدی، ہادی، رشید، مامون اور امین جیسے مشاہیر خلفائے اسلام نے عراق سے حجاز تک کا سفر کیا اور آخر میں چھٹی صدی ہجری میں بزرگ ترین سلاطین اسلام صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس نے قاہرہ سے اسکندریہ تک صرف اسی کی خاطر سفر گوارا کیا۔[1]

---

[1] تزیین الممالک۔

Marfat.com

امام ابو داؤد طیالسی

(متوفی ۲۰۴ھ)

نام و نسب سلیمان نام، ابو داؤد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے۔ سلیمان بن داؤد بن جارود[1]۔

ولادت وہ بالاتفاق ۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے، علامہ سمعانی نے ربیع الاول کا مہینہ بھی لکھا ہے۔

خاندان و وطن آبائی وطن فارس ہے، بصرہ میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی، اصلاً غلام زادہ تھے، ان کے والدین قبیلہ قریش کے موالی تھے، فارسی، بصری، قرشی اور طیالسی کی نسبتوں سے منسوب کئے جاتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور نسبت طیالسی ہے، جو طیالسہ کی جانب ہے، طیالسہ، طیلسان کی جمع ہے، یہ ایک قسم کی چادر ہوتی تھی جس کو اہل عرب عماموں کے اوپر اوڑھتے تھے، اس نسبت سے جو لوگ منسوب ہیں ان میں ابو داؤد سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں[2]۔ طیلسان فارسی زبان کا لفظ ہے، اصمعی کے نزدیک وہ اصل میں تالشان (تالسان) تھا اور معرب ہو کر طیلسان ہو گیا ہے[3]۔ اس نسبت سے منسوب ہونے کا سبب نہیں معلوم ہو سکا۔

اساتذہ و شیوخ حافظ ابو داؤد طیالسی کو دوسری صدی ہجری کا مبارک زمانہ ملا جو علم و فضل اور خیر و برکت کے لحاظ سے خیر القرون میں شمار کیا جاتا ہے اس لئے ان کو مقدس اور برگزیدہ علمائے اسلام

---

[1] تاریخ بغداد ج ۹، خلاصۃ تذہیب التہذیب الکمال، تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔ [2] کتاب الانساب۔

[3] لسان العرب۔

کی صحبت میسر آئی اور بڑے بڑے محدث علماء سے استفادہ کا موقع ملا، ان کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک ہزار شیوخ سے حدیثیں لکھیں، ان میں ابن عون اور ان کے مرتبہ کے متعدد لوگ تھے، بعض مشہور شیوخ کے نام حسب ذیل ہیں۔

ابان بن یزید عطار، ابراہیم بن سعد، ایمن بن نابل، جریر بن حازم، جریر بن عبدالحمید، حبیب بن یزید، حرب بن شداد، حماد بن درہم، حماد بن سلمہ، زائدہ بن قدامہ، زہیر بن معاویہ، سفیان بن سعید ثوری، شعبہ بن حجاج، عبدالرحمن بن ابی الزناد، عبداللہ بن عون، عبدالعزیز بن ماجشون، قرۃ بن خالد، ابوعوانہ وضاح بن عبداللہ، ورقا، ہشام بن عبداللہ دستوائی، ہمام بن یحییٰ اور یزید بن ابراہیم وغیرہ[۱]۔

تلامذہ جس طرح انہوں نے بے شمار مشائخ سے اکتساب فیض کیا تھا، اسی طرح ان کے دامن سے بھی بکثرت طلبہ اور محدثین وابستہ ہوئے، ان میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔

احمد بن ابراہیم دورقی، احمد بن حنبل، اسحاق بن منصور کوسج، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابومسعود رازی، ابن فرات، بکار بن قتیبہ ثقفی، حجاج بن یوسف الشاعر، عباس دوری، عبداللہ بن محمد مسندی، عثمان بن ابی شیبہ، علی بن مدینی، علی بن مسلم طوسی، عمرو بن علی فلاس، محمد بن ابوبکر مقدمی، محمد بن بشار بندار، محمد بن رافع، محمد بن سعد کاتب واقدی، محمد بن مثنیٰ، محمود بن غیلان، ہارون حمال، یعقوب بن ابراہیم دورقی اور یونس بن حبیب اصبہانی وغیرہ[۲]۔

آپ کے استاد جریر بن عبدالحمید نے بھی آپ سے روایت کی ہے[۳]۔ مولفین صحاح اور امام طیالسی کے زمانہ میں کافی تفاوت ہے اس لئے ان میں سے تین نے آپ سے بالواسطہ روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے امام بخاری[۴] اور مولانا عبدالرحمن مبارکپوری نے امام ترمذی کے سلسلۂ رواۃ میں ان کا نام گنایا ہے[۵]۔ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوداؤد سجستانی کے متعلق لکھا ہے کہ غالباً وہ ان سے بیک واسطہ روایت کرتے ہیں[۶]۔

---

[۱] تاریخ بغداد جلد ۹ و کتاب الانساب و تہذیب التہذیب ج ۴ [۲] ایضاً [۳] تاریخ بغداد ج ۹ و تہذیب التہذیب ج ۴۔
[۴] مقدمہ فتح الباری [۵] مقدمہ تحفۃ الاحوذی [۶] بستان المحدثین۔

رحلت وسفر ابوداؤد کے مشائخ کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے حدیث کی طلب و جستجو کے لئے مختلف مقامات کا سفر کیا ہوگا، لیکن کتابوں میں صرف بغداد اور اصبہان کے سفر کا ذکر کیا ہے۔

فضل وکمال حدیث کے علاوہ ان کے دوسرے علمی کمالات پردۂ خفا میں ہیں، اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کن کن علوم وفنون میں جامعیت رکھتے تھے، صرف فن حدیث میں ان کی مہارت و ژرف نگاہی کا حال معلوم ہوتا ہے جس نے ان کو مرتبۂ امامت پر فائز کیا۔

حفظ وضبط ان کا حافظہ غیر معمولی تھا، علمائے فن اور ان کے معاصرین نے اس کا اعتراف کیا ہے، بعض علماء کا بیان ہے کہ "ان کو تیس اور بعض نے کہا ہے کہ چالیس ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں۔" یونس بن حبیب اصبہانی فرماتے ہیں کہ انہوں نے اصبہان میں ایک لاکھ حدیثیں محض اپنی یادداشت سے املاء کرائیں، عمرو بن علی فلاس کہتے ہیں "محدثین کے زمرہ میں مجھ کو کوئی شخص ابوداؤد سے بڑا حافظ نظر نہیں آیا، میں نے ان کو خود فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں تیس ہزار حدیثیں زبانی بیان کرتا ہوں۔" علی بن مدینی کا بیان ہے کہ میری نظر سے کوئی ان سے زیادہ حدیثوں کا حافظ نہیں گزرا۔ محمد بن بشار کا قول ہے کہ "جتنی حدیثیں ابوداؤد سے لکھی گئیں اتنی کسی اور محدث سے نہیں لکھی گئیں، صالح بن احمد عجلی ان کو کثیر الحفظ بتاتے ہیں۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ "بصرہ میں ابوداؤد طیالسی اپنے زمانے میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے اور اس وصف میں وہ اپنے معاصرین میں فائق و برتر تھے۔" ہیثم بن خارجہ نے امام احمد سے دریافت کیا کہ "ابوداؤد اور ابوعبیدہ حداد میں کس کو آپ زیادہ پسند کرتے؟" فرمایا ابوداؤد حافظہ کے لحاظ سے فائق ہیں اور ابوعبیدہ زیادہ تر کتابوں سے روایت کرتے ہیں، اس لئے غلطی بہت کم کرتے ہیں۔" اور وکیع کا بیان ہے کہ "طویل حدیثوں کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں رہا"۔ شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں "ابوداؤد طویل حدیثوں کو اچھی طرح محفوظ کرتے تھے اور اس وصف میں اپنے معاصرین سے ممتاز تھے۔"

لہ۔ العبر ج ۱ و کتاب الانساب، تاریخ بغداد ج ۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۱ و میزان اعتدال ج ۱ و تہذیب التہذیب ج ۴۔

عدالت وثقاہت | ثقاہت میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، علمائے جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں "وہ لوگوں میں سب سے زیادہ سچے تھے"[1] ابوالمنذر نعمان کا ارشاد ہے کہ "وہ ثقہ اور معتبر تھے"[1]، ابن معین سے شعبہ کے تلامذہ کے متعلق دریافت کیا گیا کہ ابوداؤد طیالسی اور حرمی میں آپ کے نزدیک کون زیادہ بہتر ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ ابوداؤد صدوق ہیں اس لئے وہ مجھ کو زیادہ پسند ہیں، صالح بن احمد عجلی اور خطیب بغدادی نے ان کو ثقہ ثابت بتایا ہے، عمرو بن علی نے ان کو ثقہ ومعتبر کہا ہے، ابن عدی عمرو کی رائے کی تصدیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ میرے اور دوسروں کے نزدیک متیقظ اور ثابت تھے، ابوحاتم ان کو صدوق محدث قرار دیتے ہیں، ابومسعود رازی نے امام احمد سے ان کے بارے میں سوال کیا تو ارشاد ہوا کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے، امام نسائی کا ارشاد ہے کہ "ابوداؤد ثقہ اور لوگوں میں سب سے زیادہ سچے تھے، ابن حبان نے بھی ان کو ثقات میں شامل کیا ہے، اور محمد بن سعد صاحب طبقات لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے"[1] شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں، یحییٰ بن معین و ابن المدینی و فلاس و وکیع و دیگر علمائے رجال اور اتعدیل و توثیق مفرط نمودہ اند۔[2]

معرفت حدیث | وہ حدیثوں کے صرف ناقل و حافظ ہی نہ تھے بلکہ ان کی پرکھ میں بھی مہارت رکھتے تھے بندار کا بیان ہے کہ وہ حدیث اور معرفت حدیث کے لحاظ سے نہایت برتر تھے۔

وکیع جیسے نامور محدث حدیث میں ان کی غیر معمولی واقفیت اور تمیز کی بنا پر ان کو جبل العلم کہتے تھے، یحییٰ بن معین ان کو عبدالرحمٰن بن مہدی سے بھی زیادہ صاحب علم اور حدیثوں کا واقف کار بتاتے ہیں، ان کے استاد شعبہ کو ان کے علم و تمیز پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنی عدم موجودگی میں ان کو مسند درس پر رونق افروز ہونے کی اجازت دے دیتے تھے، ابوحاتم کا بیان ہے کہ معرفت حدیث میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ وہ شعبہ سے مذاکرہ کر سکتے تھے، اس سلسلہ میں ابوداؤد کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ بعض محدثین اور شیوخ کی روایات کا ان سے زیادہ کوئی واقف کار نہ تھا، عثمان بری کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں کہ میرے سینہ میں ان کی بارہ

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۹ و تہذیب التہذیب ج ۴ کتاب الانساب و میزان الاعتدال ج ۱ و طبقات ابن سعد قسم دوم جلد ۷۔ [2] بستان المحدثین۔

ہزار حدیثیں محفوظ ہیں، مشہور محدث شعبہ کی روایتوں کے لئے تو وہ سند کی حیثیت رکھتے تھے، احمد بن سعید دارمی نے امام احمد سے سوال کیا کہ شعبہ کی حدیثیں کس سے قلمبند کی جائیں تو انہوں نے فرمایا کہ جب تک ابوداؤد زندہ ہیں ہمارا خیال ہے کہ ان ہی سے نقل و روایت کی جائے، ابومسعود رازی کا بیان ہے کہ شعبہ کی روایتوں کے معاملہ میں ابوداؤد سے زیادہ کوئی واقف کار مجھ کو نہیں ملا[۱]۔ حضرت شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں۔

وازمحدثاں اکابر مثل شعبہ وہشام وستوائی وابن عون وغیرہم روایات بسیار دارد[۲]۔

اخلاق و عادات ابوداؤد طیالسی کے اخلاق عادات اور اعمال و عبادات وغیرہ کی تفصیل نہیں معلوم ہوسکی، بعض واقعات سے ضمناً ان کے بعض اوصاف کا پتہ چلتا ہے، مثلاً اصبہان میں ایک لاکھ حدیثیں املا کرانے کے بعد جب ان کو اپنی بعض غلطیوں کا پتہ چلا تو انہوں نے ان کو تسلیم کر لیا اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت کی کہ وہ بھی ان کی تصحیح کرلیں۔

امام احمد نے بھی ان کی اس خوبی کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے تھے۔

وفات مشہور روایت کے مطابق ۷۲ سال کی عمر میں ۲۰۴ھ میں ان کا انتقال ہوا بعض لوگوں نے صفر اور بعض نے ربیع الاول ۲۰۴ھ کا مہینہ بتایا ہے، ۲۰۳ھ اور ۲۱۳ھ بھی سنہ وفات بتایا جاتا ہے لیکن یہ غلط ہے، اس زمانے میں حاکم بصرہ یحییٰ بن عبداللہ بن عمر نے نماز جنازہ پڑھائی[۳]۔

مسندِ طیالسی مسانید کے جو مجموعے مشہور و متداول ہیں، ان میں ایک ابوداؤد طیالسی کی مسند بھی ہے، اس کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ وہ دوسرے مسانید کے مقابلہ میں زیادہ قدیم ہے بعض علماء نے اس کو سب سے قدیم مسند بتایا ہے[۴]۔ حاکم صاحب مستدرک فرماتے ہیں کہ علمائے اسلام میں عبیداللہ بن موسیٰ اور ابوداؤد طیالسی نے سب سے پہلے تراجم رجال پر مسانید مرتب کئے[۵]۔ لیکن علمائے محققین کی ایک جماعت کو اس رائے سے اتفاق نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ عام مصنفینِ مسانید کے مقابلہ میں ابوداؤد کا زمانہ قدیم ہے، اس لئے لوگوں نے ان کی مسند کو بھی سب سے قدیم سمجھ لیا، حالانکہ اس کی جمع و ترتیب ان

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۹ وخلاصہ تذہیب تہذیب الکمال [۲] بستان المحدثین [۳] تاریخ بغداد جلد ۹ [۴] کشف الظنون ج ۲ والرسالۃ المستطرفۃ [۵] المدخل فی اصول الحدیث

Marfat.com

کے بعد بعض متاخرین خراسانی حفاظ نے کی ہے[1]، بہر حال اس کی قدامت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، گو بعض مشہور کتب حدیث کی طرح ان کی مسند کو زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی، لیکن اس کو مسانید میں یک گونہ خصوصیت حاصل ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے[2]۔

ترتیب و تبویب | یہ مسند گیارہ اجزا پر مشتمل ہے، اس کی ترتیب میں بڑی حد تک مسانید کے عام اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے یعنی صحابہؓ کے شرف و تقدم اور سبقت فی الاسلام کے لحاظ سے روایتیں نقل کی گئی ہیں، پہلے خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ اور کبار صحابہؓ کی حدیثیں ہیں چھٹے جز کے آخر سے صحابیات کی مرویات کا سلسلہ شروع ہو کر ساتویں جز میں ختم ہوتا ہے، سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ اور اس کے بعد حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کی روایات ہیں، ہر صحابی کی حدیثیں الگ الگ عنوان سے ہیں، بعض صحابہ کی حدیثیں دو جگہ بھی نقل ہو گئی ہیں بعض مقامات پر ایک صحابی کی روایتوں میں دوسرے صحابی کی روایتیں بھی خلط ملط ہو گئی ہیں، مسند کی باقاعدہ جمع و ترتیب کا کام بعض اہل خراسان نے کیا اور زیادہ تر روایتیں یوسف بن حبیب کے واسطہ سے مروی ہیں[3]۔

خصوصیات | ۱۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت اس کی قدامت ہے۔

۲۔ مسند کی اکثر روایتیں دوسری مشہور کتب حدیث میں موجود ہیں

۳۔ کہیں کہیں آثارِ صحابہ بھی نقل کئے گئے ہیں۔

۴۔ حدیث کی کتابوں کی عام خصوصیات مثلاً رواۃ کے ناموں کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں، کثرت طرق، تعدد اسناد، اختلاف الفاظ و معانی یا خاص اضافہ و کمی کا ذکر، روایتوں کے باہمی فرق، رواۃ کے سہو و نسیان روایات کے درجہ و حیثیت کی تشریح، دو روایتوں کے درمیان ترجیح، روایات کی تصویب و تغلیط ان کے یا راویوں کے متعلق اپنے یا شیوخ کے شک و تردد کا اظہار، مشکل الفاظ، روایات کے ابہام اور مفہوم کی وضاحت اور ان کے بعض خاص پہلوؤں اور نکتوں کی تشریح وغیرہ اس میں بھی موجود ہیں۔

یہ مسند پہلی مرتبہ مطبع دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوئی ہے صفحات کی تعداد ۲۹۲ ہے۔ ارکان دائرہ نے حاشیے میں متعدد کتب حدیث خصوصاً مسند احمد، سنن ترمذی اور سنن ابی داؤد

---

[1] کشف الظنون ج ۲ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ [3] کشف الظنون ج ۲۔

سے اس کی حدیثوں کی مطابقت یا اختلاف کو دکھایا ہے، اور کہیں کہیں لغات اور بلاد واماکن وغیرہ کی بھی مختصر تشریح کی ہے، خاتمہ میں مسند کے قدیم نسخہ سے اس نسخہ کے اختلاف کا مقابلہ کیا گیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ساتویں صدی ہجری سے قبل کا خدابخش خاں لائبریری میں موجود ہے۔ شیخ عبدالرحمٰن بناساعاتی نے مسند احمد کی طرح اس کو بھی فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے، اسی کے ساتھ موصوف نے اس کی "المحمود علی منحۃ المعبود" کے نام سے تصحیح و تعلیق لکھی ہے، اصل و تعلیق دو جلدوں میں مطبع میمنہ مصر سے شائع ہوئی ہے۔

بعض اعتراضات اور ان کا جواب ابوداؤد طیالسی پر سہو و خطا اور تدلیس کے اعتراضات بھی ملتے ہیں۔

خطا ابوحاتم، ابراہیم جوہری، ابن سعد اور علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کی بھول چوک اور خطا و نسیان کا ذکر کیا ہے، مگر ان سے ابوداؤد کے حفظ و ضبط، علم و فضل اور ثقاہت میں فرق نہیں آتا۔ خطا و نسیان تو بشریت کا خاصہ ہے جس سے کوئی محدث بھی بری نہیں، چنانچہ ان پر جن لوگوں نے اعتراض کیا ہے وہ بھی ان کو ثقہ اور ضابط مانتے ہیں، فلاس کا بیان ہے کہ "میں جانتا ہوں کہ علامت منافق والی حدیث میں کسی نے ان کی متابعت نہیں کی ہے تاہم اس کے باوجود وہ ثقہ وضابط ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ محدثین اور علمائے فن کے نزدیک سہو و خطا کرنے والا متروک الحدیث نہیں سمجھا جاتا۔[1] ائمہ صحاح کی کتابوں میں بھی ایسے رواۃ کی روایتیں موجود ہیں اس لئے یہ الزام خواہ صحیح ہو یا غلط، اس سے ابوداؤد کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ابوداؤد طیالسی کے حافظہ میں حدیثوں کا بڑا ذخیرہ محفوظ تھا اور وہ اپنی یادداشت سے حدیثیں بیان کرتے تھے، اس لئے ان سے بھول چوک کا ہو جانا تعجب انگیز نہیں ہے، ابن عدی کہتے ہیں کہ "جو شخص محض یادداشت سے چالیس ہزار حدیثیں بیان کرے اس سے بعض روایتوں میں اس طرح کے سہو و خطا کا ہو جانا کہ جس روایت کو دوسرے موقوفاً بیان کرتے ہوں وہ اس کو مرفوعاً یا جس کو لوگ مرسلاً بیان کرتے ہوں وہ اس کو موصولاً بیان کر دے بعید اور تعجب خیز نہیں، کیونکہ اس کا تمام تر دار و مدار حافظہ پر ہوتا ہے، باقی ابوداؤد نہ صرف میرے بلکہ دوسرے لوگوں کے نزدیک بھی متیقظ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴۔

Marfat.com

اور ثابت ہیں[1] امام احمد سے ایک مرتبہ کسی نے ان کی غلطیوں کا ذکر کیا تو فرمایا ان کی غلطی کو غلطی نہیں کہنا چاہیئے، خطا کا الزام اس وقت ان پر درست ہو سکتا ہے جب ان سے ان کی غلطی کا تذکرہ کیا جائے اور وہ متنبہ نہ ہوں لیکن ان کا یہ حال ہے کہ ان سے جس وقت ان کی غلطی کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ فوراً متنبہ ہو جاتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں[2] دوسرے مورخین اور ائمہ تعدیل نے بھی اس قسم کی توجیہہ بیان کی ہے۔

تدلیس:۔ دوسرا اعتراض تدلیس کا ہے، یعنی وہ ایک راوی کی روایت کو دوسرے کی طرف منسوب کر دیتے تھے، محمد بن منہال فرماتے ہیں" ابو داؤد نے ہم سے ابن عون کے واسطے سے بیس سے کچھ زیادہ حدیثیں بیان کیں، مگر ان میں سے ایک کے علاوہ جس کو میں نہیں جانتا تھا باقی حدیثیں یزید بن زریع کی تھیں[3]۔

حافظ ابن حجر نے دو اور واقعے نقل کئے ہیں، ان میں سے ایک ان ہی محمد ابن منہال کے واسطہ سے اور دوسرا امام دارقطنی کی کتاب الجرح والتعدیل سے ماخوذ ہے، ان تینوں واقعات سے خود ظاہر ہے کہ ابو داؤد نے غلطی سے روایت کا انتساب اصل راوی کے بجائے دوسرے کی جانب کر دیا ہے، خود حافظ ابن حجر نے جو ان واقعات کے ناقل ہیں انہیں تحریف و تدلیس کے بجائے سہو و نسیان پر محمول کرنے کی کوشش کی ہے اور بجز ایک قلیل جماعت کے جمہور کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ تدلیس میں کوئی عیب نہیں ہے، سفیان ثوری جیسے بزرگ جو امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں اور بہت سے اہل کوفہ بھی تدلیس کرتے تھے، ابن صلاح لکھتے ہیں۔۔

صحیح یہ ہے کہ مدلس جس چیز کو لفظ محتمل سے روایت کرے اور سماع و اتصال کی وضاحت نہ کرے تو اس کا حکم مرسل اور اس کی قسموں جیسا ہے لیکن جس روایت کو ایسے الفاظ سے بیان کیا جائے جن سے اتصال کی صراحت ہوتی ہے جیسے، سمعت حدثنا واخبرنا وغیرہ تو وہ مقبول اور قابل حجت ہے، صحیحین وغیرہ کتب معتبرہ میں بھی اس قسم کی بے شمار روایتیں ہیں، جیسے قتادہ، اعمش، سفیانین، اور ہشام بن بشیر وغیرہ کے واسطے سے اور یہ اس بنا پر کہ تدلیس دراصل کذب نہیں بلکہ ایک طرح کا ابہام ہے جو لفظ محتمل کی بنا پر ہوتا ہے[4]۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ و میزان الاعتدال ج ا [2] تاریخ بغداد ج ۹ [3] ایضاً و تہذیب التہذیب ج ۴۔

[4] مقدمہ ابن صلاح۔

امام عبدالرزاق بن ہمام

(متوفی ۲۱۱ھ)

نام ونسب عبدالرزاق نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، عبدالرزاق بن ہمام بن نافع۔

ولادت، وطن اور خاندان یمن کے مشہور شہر اور پایہ تخت صنعاء میں ۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے، قبیلۂ حمیر سے ولا کا تعلق تھا، صنعانی حمیری کی نسبتوں سے زیادہ مشہور اور یمنی بھی کہے جاتے تھے[1]

اساتذہ بلند پایہ محدثین اور کبار آئمہ فن میں ابن جریج، امام اوزاعی، سفیان ثوری، سفیان بن عینیہ، عبداللہ بن ابی سبرۃ، امام مالک، معتمر بن سلیمان، معمر بن راشد ازدی اور ہشیم بن بشیر واسطی وغیرہ سے اعزہ ومتعلقین میں اپنے والد ہمام اور چچا وہب سے اور دوسرے علماء ومشائخ میں ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ، اسماعیل بن عیاش، ایمن بن نابل، ثور بن یزید کلاعی، جعفر بن سلیمان، داؤد بن قیس فراء، زکریا بن اسحاق مکی، سعید بن بشیر، سعید بن عبدالعزیز، عبدالرحمٰن بن زید اسلم، عبدالعزیز بن ابی رواد، عبداللہ بن زیاد بن سمعان، عبداللہ بن عمر عمری اور ابو معشر نجیح سندی وغیرہ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ معمر ازدی سے خاص تعلق تھا، سات آٹھ سال تک مستقل ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے[2]۔

تلامذہ ان کے تلامذہ میں خود ان کے بعض شیوخ ابن عینیہ اور معتمر بن سلیمان معاصرین واقران میں ابو اسامہ حماد بن سلمہ اور وکیع، ائمۂ اسلام اور ناقدین حدیث میں امام احمد، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی،

---

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۱۔ تذکرۃ الحفاظ ۱۔ مرآۃ الجنان ج ۲۔ تہذیب التہذیب ج ۶۔ بستان المحدثین۔

[2] تہذیب التہذیب ج ۶۔

Marfat.com

محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن معین اور دوسرے مشہور لوگوں میں ابراہیم بن موسیٰ، ابومسعود رازی، احمد بن صالح، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یوسف سلمی، اسحاق بن ابراہیم دبری، اسحاق بن ابراہیم سعدی، اسحاق بن منصور کوسج، حجاج بن شاعر، حسن بن علی خلال، زہیر ابن حرب، سلمہ بن شبیب، عبد بن حمید، عبداللہ بن محمد مسندی، عبدالرحمن بن بشر، عمرو الناقد، محمد بن رافع، محمد بن مہران حمال، یحییٰ بن جعفر بیکندی اور یحییٰ ابن موسیٰ وغیرہ شامل ہیں[۱]۔

رحلت وسفر مورخین نے تجارت کے لئے شام اور حج وزیارت کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے جانے کا ذکر کیا ہے[۲]۔ مگر حدیث کی طلب وجستجو کے لئے سفر کی تصریح نہیں کی ہے، ان کے مشائخ کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مشہور اور اہم مراکز کا سفر ضرور کیا ہوگا۔

مقبولیت ومرجعیت ان کے فضل وکمال اور علمی عظمت نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے علاوہ کسی اور شخص کے پاس اس قدر زیادہ لوگ سفر کرکے نہیں آئے۔ اکثر علمائے اسلام ان کی بارگاہ کمال میں حاضر ہوئے تھے[۳]۔ مورخ یافعی نے ان کو المرتحل الیہ من الآفاق یعنی وہ شخص جس کے پاس لوگ مختلف اطراف واکناف سے آتے تھے لکھا ہے[۴]۔

اعتراف کمال علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے ان کو مخزن علم بتایا ہے۔ ایک مرتبہ امام احمد سے پوچھا گیا کہ ان سے زیادہ بہتر اور برتر محدث کا آپ کو علم ہے، فرمایا نہیں، ان کے معاصر ہشام کو اعتراف تھا کہ ہم لوگوں میں سب سے زیادہ صاحب علم عبدالرزاق ہیں[۱]۔

حفظ وضبط ابراہیم بن عباد دبری کا بیان ہے کہ عبدالرزاق کو سترہ ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں ہشام بن یوسف فرماتے ہیں "ہم لوگوں میں سب سے بہتر حافظ ان کا تھا"۔

ثقاہت ان کی ثقاہت پر علماء کا اتفاق ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ بے شمار اہل حدیث نے

[۱] تہذیب التہذیب ج۶ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج۱ [۳] تاریخ ابن خلکان ج۱ و کتاب الانساب، تذکرۃ الحفاظ ج۱
[۴] مراۃ الجنان ج۲ ص۔ ایضاً۔

ان کو ثقہ اور متقن کہا ہے۔ ابوحاتم فرماتے ہیں کہ "عبدالرزاق کی حدیثیں لکھے جانے اور احتجاج کے لائق ہیں" ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ ان کی حدیثیں ثابت اور معتبر ہیں۔ ابن حبان یعقوب بن شیبہ آجری، عجلی اور بزار وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، اور ذہلی وغیرہ نے ان کو احادیث کے معاملہ میں بڑا متیقظ قرار دیا ہے امام احمد سے ابن جریج کے شاگردوں میں ان کے اور برسانی کے بارہ میں پوچھا گیا تو فرمایا عبدالرزاق زیادہ ثقہ اور معتبر ہیں، مشہور محدث معمر کی حدیثوں کے سب سے بڑے حافظ اور سب سے زیادہ مستند راوی یہی تھے۔ یحیٰی بن معین فرماتے ہیں کہ معمر کی حدیثوں کے لئے عبدالرزاق سے زیادہ بہتر اور معتبر اور کوئی نہیں، امام احمد کے نزدیک معمر کی عبدالرزاق کے واسطہ سے مروی حدیثیں بصریوں کے توسط سے مروی روایات سے زیادہ بہتر ہیں اور جب ان کی کسی حدیث کے متعلق ان کے تلامذہ مختلف الرائے ہوتے تھے تو عبدالرزاق کی روایت کو قبول کرتے تھے[1]

پیشہ | عبدالرزاق تجارت پیشہ تھے، اور بسلسلہ تجارت شام جایا کرتے تھے۔

شعر وسخن | شعر وسخن کا ذوق تھا، اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

فذالک زمان لعبنا بہ   وھذا زمان بنا یلعب

ترجمہ:۔ ایک وہ زمانہ تھا جس سے ہم کھیلتے تھے اور اب یہ زمانہ ہے جو ہم سے کھیل رہا ہے۔

وفات | پچاسی سال کی عمر میں جب کہ ہوش وحواس بجا نہیں رہتے تھے، ۲۱۱ھ میں وفات پائی، ابن سعد کے بیان کے مطابق شوال کا مہینہ تھا۔

تصنیفات

حافظ عبدالرزاق متعدد کتابوں کے جامع و مصنف تھے مگر ان میں سے اکثر معدوم ونایاب ہیں بعض کے نام یہ ہیں (۱) جامع یا سنن عبدالرزاق، اس کی اکثر حدیثوں کی صحاح میں تخریج کی گئی ہے (۲)

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱، تہذیب التہذیب ج ۱۔ بستان المحدثین۔

Marfat.com

(۲) کتاب السنن فی الفقہ (۳) کتاب المغازی (۴) تفسیر میں بھی ایک کتاب لکھی تھی (۵) مصنف عبدالرزاق کی سب سے زیادہ اہم اور مشہور کتاب ہے، اس کو فقہی ابواب پر مرتب کیا گیا ہے، اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ مصنف کے جو مجموعے موجود ہیں ان میں مصنف ابن ابی شیبہ کے بعد سب سے مشہور یہی ہے اور قدامت کے لحاظ سے یہ اس پر بھی فوقیت رکھتی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اکثر روایتیں ثلاثی ہیں، مصنف عبدالرزاق ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، جرمنی اور حجاز کے بعض کتب خانوں میں اس کے مکمل اور ناقص نسخے موجود ہیں۔

عبدالرزاق پر نقد و جرح بعض علمائے جرح و تعدیل نے عبدالرزاق پر نقد و جرح بھی کی ہے۔

۱. **شیعیت**۔ ان کی جانب شیعیت کی نسبت کی جاتی ہے، لیکن اس کے متعلق ان کا خود بیان ہے کہ "مجھے اس بات پر کبھی شرح صدر نہیں ہوا کہ جناب امیر کو شیخین سے افضل قرار دوں" سلمہ بن شبیب ان کا قول نقل کرتے ہیں کہ "حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ پر خدا کی رحمت ہو، جس شخص کے دل میں ان بزرگوں کی محبت نہ ہو وہ مومن نہیں، مجھ کو اپنے اعمال میں سب سے زیادہ بھروسا ان حضرات کی محبت ہی پر ہے۔" ابوالازہر فرماتے ہیں کہ "عبدالرزاق نے بتایا کہ وہ شیخین کی تفضیل کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ خود حضرت علیؓ سے بھی یہی ثابت ہے، وہ اپنے کو شیخین سے افضل اور بہتر کہنے سے منع کرتے تھے۔ جناب امیر کی شان میں اس سے بڑی اور کیا گستاخی ہوگی کہ ان سے محبت رکھنے کے باوجود ان کے عقیدہ و مسلک کی مخالفت کی جائے، جس چیز کو ان کی شیعیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ بعض اکابر کی طرح وہ بھی حضرت علی اور اہل بیت کے بڑے گرویدہ تھے لیکن دوسرے صحابہؓ کے مراتب و درجات کو اہل سنت ہی کی طرح مانتے تھے، اس لئے ان کے معاصرین اور تلامذہ تک کو ان کی شیعیت کا علم نہ تھا، امام احمد سے ان کے صاحبزادہ عبداللہ نے اس کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے کانوں نے ان سے اس طرح کی کوئی بات نہیں سنی

ہے۔ ان کے بارے میں مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ احادیث سے بڑا شغف رکھتے تھے

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان پر شیعیت کا اعتراض کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کی حقیقت صرف اس قدر تھی

کہ وہ حضرت علیؓ سے بڑی محبت اور ان کے قاتل سے سخت نفرت کرتے تھے، علمائے جرح وتعدیل نے متفقہ

طور پر ان کی توثیق کی ہے اور ان کی روایات کو تسلیم کیا ہے، کتب صحاح میں ان کی روایات اس کا

ثبوت ہیں ۔

۲۔ **سؤ حفظ و فتور عقل** :۔ دوسری جرح یہ ہے کہ ضعیفی میں ان کی بصارت زائل ہو گئی تھی اور سؤ حفظ

اور فتور عقل میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن یہ علت محض آخری دور کی حدیثوں کے لئے قادح اور مانع ہو سکتی ہے

اس کے پہلے کی روایات کے ثبوت و اعتبار میں اس سے فرق نہیں آتا بلکہ بعض علماء نے بڑھاپے کی بھی

صرف ان ہی روایتوں کو کمزور کہا ہے جن کو وہ یادداشت سے بیان کرتے تھے ۔

بعض اور بھی اعتراضات کئے گئے ہیں لیکن حافظ ابن حجر اور علامہ ذہبی نے ان کو سراسر مہمل اور

بے بنیاد قرار دیا ہے ۔

امام اسد بن موسیٰ
(متوفی ۲۱۲ھ)

نام ونسب اسد نام اور اسد السنۃ لقب تھا، شجرۂ نسب یہ ہے، اسد بن موسیٰ بن ابراہیم بن ولید بن عبدالملک بن مروان بن حکم[1]

ولادت، وطن، خاندان ۱۳۲ھ میں اموی حکومت کے زوال وانقراض کے سال مصر میں پیدا ہوئے، خاندان بنوامیہ سے نسبی تعلق تھا، اس لئے اموی اور مصری کہلاتے ہیں[2]

اساتذہ وشیوخ ان کو جن نامور محدثین اور اکابر فضلا سے شرف تلمذ حاصل ہے اُن کے نام حسب ذیل ہیں۔

ابن ابی ذئب، حماد بن سلمہ، روح، شعبہ، شیبان، عبدالعزیز بن ماجشون، لیث بن سعد، محمد بن طلو، مسعودی، معاویہ بن صالح اور یونس بن ابی اسحاق وغیرہ۔

تلامذہ بعض نامور تلامذہ کے نام یہ ہیں :-

احمد بن صالح مصری، رحیم، ربیع بن سلمان مرادی، عبدالملک بن حبیب، محمد بن عبدالرحیم برقی، مقدام بن داؤد رعینی، ابو یزید یوسف قراطیسی[3]

طلب حدیث کے لئے سفر طلب حدیث کے لئے ان کے رحلت وسفر کا ذکر بھی ملتا ہے، علامہ ذہبی وابن عماد حنبلی لکھتے ہیں رحل فی طلب الحدیث، انہوں نے حدیث کی طلب کے لئے سفر کیا[4] (العبر ج ۱)

حفظ وثقاہت اپنے زمانہ کے صاحب کمال محدثین اور ثقہ وضابط حفاظ میں شمار کئے جاتے ہیں، علمائے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ [2] ایضاً وحسن المحاضرہ ج ۱ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔ تہذیب التہذیب ج ۱۔ [4] العبر ج ۱

رجال نے الحافظ کے لقب سے اُن کا تذکرہ کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے ان کو مشہور الحدیث کہا ہے اور ان کی روایتوں سے استشہاد کیا ہے۔ اسی طرح امام ابو داؤد اور امام نسائی نے بھی استدلال کیا ہے امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن یونس، ابن قانع، عجلی اور بزار وغیرہ نے بھی ان کی توثیق کی ہے۔ ابن حبان نے ثقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ خلیلی لکھتے ہیں "مصری صالح" یعنی اسد ابن موسیٰ مصری حدیثوں کے لئے صالح و معتبر تھے[۱]۔ ابن عماد نے لکھا ہے کہ احد الثقات الاکیاس، یعنی وہ ثقہ اور دانشمند لوگوں میں سے ایک تھے[۲]۔

اتباعِ سنت | سنت سے خاص شغف تھا۔ عجلی نے صاحب سنہ کہا ہے[۳]۔ اسی لئے اسد السنہ کہلاتے تھے۔

وفات | اسی سال کی عمر میں اپنے وطن مصر میں ۲۱۲ھ میں انتقال کیا[۴]۔

اولاد | حافظ ابن حجر نے سعید نام ایک فرزند کا ذکر کیا ہے، تابعین کے فضائل و مناقب میں ان کی ایک کتاب دو جلدوں میں تھی اس میں انہوں نے اپنے والد اور اس طبقہ کے دوسرے محدثین سے بکثرت روایات کی ہیں[۵]۔

تصنیفات | اسد السنہ صاحبِ تصنیفات تھے[۶]۔ ان کی تصنیفات میں صرف مسند اور کتاب الزہد کا ذکر ملتا ہے۔ بعض علمائے اسلام نے اس کو سب سے قدیم مسند بتایا ہے۔ یہ رائے درست ہو یا نہ ہو اتنا مسلم ہے کہ مصر میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی۔ علامہ ابن عدی کا بیان ہے کہ مصر میں سب سے پہلے اسد السنہ نے مسند مرتب کی جو یحییٰ بن عبد الحمید حمانی اور مسدد ابن مسرہد بصری سے قدیم العہد تھے[۷]۔ اس لئے یہ قدیم ترین مسانید میں ہے اور اس کی اہمیت کا سبب اس کی قدامت ہی ہے۔

ایک اعتراض کا جواب | اسد السنہ پر بعض اعتراضات بھی کئے گئے ہیں مثلاً علامہ ابن حزم نے ان کو منکر الحدیث اور ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن یونس نے لکھا ہے کہ وہ منکر حدیثیں بیان کرتے

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱ [۲] شذرات الذہب ج ۲ [۳] تہذیب التہذیب ج ۱، [۴] خلاصہ تذہیب التہذیب الکمال
[۵] تہذیب التہذیب ج ۱ [۶] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ [۷] الرسالۃ المستطرفہ۔

Marfat.com

تھے لیکن ان اقوال کی حیثیت شواذ و نوادر کی ہے جو علمائے فن اور آئمہ جرح و تعدیل کی عام توثیق کے مقابلہ میں قابل اعتنا نہیں۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ مجھے ان کے کسی عیب کا حال معلوم نہیں سوائے اس کے کہ ابن حزم نے ان کو ضعیف بتایا ہے لیکن یہ تضعیف مردود اور ناقابل تسلیم ہے[1] وہ اور حافظ ابن حجر دونوں لکھتے ہیں۔ داحب الآفۃ من غیرہ[2] یعنی ان کی روایتوں میں جو سقم نظر آتا ہے وہ بعد کے دوسرے رواۃ کی وجہ سے ہے۔

---

[1] میزان الاعتدال ج ۱ [2] ایضاً و تہذیب التہذیب ج ۱۔

عبیداللہ بن موسیٰ عبسی

متوفی ۲۱۳ھ

نام و نسب عبیداللہ نام، ابو محمد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، عبیداللہ بن موسیٰ بن ابی المختار باذام[1]

ولادت و خاندان ۱۲۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے، قبیلہ عبس کے مولی تھے،[2] اس لئے کوفی اور عبسی کہلاتے ہیں لیکن علامہ سمعانی کا بیان ہے۔

العبسی... الی عبس بن بغیض بن ریث بن غطفان... عدنان وھی القبیلۃ المشہورۃ ینسب الیھا العبسیون بالکوفۃ۔[3]

عبسی عبس بن بغیض... عدنان کی طرف نسبت ہے اور یہ وہ مشہور قبیلہ ہے جس کی طرف کوفہ کے عبسی منسوب ہیں۔

سید مرتضیٰ زبیدی فرماتے ہیں۔

عبس محلۃ بالکوفۃ قد نزلھا بنو عبس ومنھا العبسیون المحدثون ومن الضوابط ان من کان من اھل الکوفۃ فھو بالموحدۃ منسوب الی ھذہ المحلۃ۔[4]

عبس کوفہ میں ایک محلہ ہے جہاں بنو عبس آکر اترے تھے اور ان ہی میں سے عبسی محدثین ہیں اور یہ قاعدہ کلیہ میں سے ہے کہ جو راوی اہل کوفہ میں سے ہوتا ہے، وہ یائے موحدہ کے ساتھ اسی محلہ کی طرف منسوب ہے۔

---

[1] تقریب التہذیب و تہذیب التہذیب [2] خلاصۃ تذہیب و تہذیب ج ۷ [3] کتاب الانساب [4] تاج العروس ج ۴۔

Marfat.com

ان بیانات سے عبیداللہ بن موسیٰ کا عرب نژاد ہونا اور قبیلۂ عبس سے ولا کی بجائے نسبی تعلق ظاہر ہوتا ہے۔

اساتذہ ان کے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں :۔

ابن ادم محاربی، ابن جریج، اسرائیل بن یونس، اسماعیل بن ابی خالد الاعمش، امام اوزاعی، ایمن بن نابل، حسن بن صالح، حنظلہ بن ابی سفیان، زکریا بن ابی زائدہ، سفیان ثوری، شیبان، عبدالعزیز بن سیاہ، عثمان بن اسود، محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ، معروف بن خربوذ، موسیٰ بن عبیدہ ربذی، ہارون ابن سلیمان فرا، ہشام بن عروہ، یونس بن ابی اسحاق وغیرہ[1]

تلامذہ ان کے تلامذہ اور منتسبین کی تعداد بے شمار ہے۔ چند نام یہ ہیں :۔

ابراہیم بن دینار بغدادی، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوحاتم، ابوسعید اشج، احمد بن ابراہیم دورقی، احمد بن ابی سریج رازی، احمد بن حنبل، اسحاق بن منصور، اسحاق بن راہویہ، حجاج بن شاعر، حسین بن علی بن اسود دارمی، سفیان بن عیینہ، عباس بن عبدالعظیم منذری، عباس دوری، عبداللہ بن صباح عطار، عبداللہ بن محمد مسندی، عثمان بن ابی شیبہ، قاسم بن زکریا، محمد بن حسین بن اشکاب، محمد بن سعد کاتب واقدی، محمد بن سلیمان باغندی کبیر، محمد بن عبداللہ بن نمیر، محمد بن یحییٰ ذہلی، محمود بن غیلان، وکیع بن جراح، یحییٰ بن معین، یعقوب سفیان وغیرہ[2]

خالد بن حمید مہری عمر میں عبیداللہ بن موسیٰ سے بڑے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ان سے احادیث روایت کی ہیں، ائمہ صحاح نے بالواسطہ ان سے حدیثیں بیان کی ہیں[3]

حفظ و ثقاہت علمائے فن نے ان کا "الحافظ" کہہ کر تعارف کرایا ہے۔ ابن معین، ابن عدی اور عجلی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ ابن حبان و ابن شاہین نے ثقات میں تذکرہ کیا ہے۔ ابوحاتم اور ابن سعد ثقہ، صدوق اور حسن الحدیث بتاتے ہیں۔ ابوداؤد نے ان کو جائز الحدیث اور ابن قانع نے صالح الحدیث کہا ہے۔ اسرائیل کے مرویات کے سب سے زیادہ معتبر راوی یہی سمجھے جاتے تھے[4]

لہ۔ تہذیب التہذیب ج ۷ ، ؎ ایضاً ۔ ؎ تہذیب التہذیب ج ۵

حدیث میں درجہ | علم حدیث میں ان کا مقام نہایت بلند تھا، علمائے فن کو ان کی اس خصوصیت کا اعتراف ہے، ان کے پاس احادیث کا نہایت وافر ذخیرہ تھا، علامہ ابن سعد نے انہیں کثیر الحدیث لکھا ہے[۱]

قرأت و تفسیر اور فقہ | وہ حدیث کے علاوہ فن قرأت، تفسیر اور فقہ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے، حمزہ علی بن صالح اور عیسیٰ بن عمر سے علم قرأت کی تحصیل کی تھی اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے علوم قرآنی میں مہارت کی وجہ سے صاحب قرآن کہلاتے تھے[۲] عجلی کا بیان ہے کہ **عالما بالقرآن راسا فیہ**[۳] (قرآنی علوم کے ماہر و ممتاز عالم تھے) اور فقہ میں بھی یک گونہ امتیاز رکھتے تھے۔ صاحب مراۃ الجنان کا بیان ہے

کان اماما فی الفقہ والحدیث والقرآن[۴]۔ یعنی عبید اللہ فقہ، حدیث اور قرآن سے متعلق علوم کے امام تھے۔

زہد و عبادت | علم و فضل کی طرح زہد و تقویٰ اور تدین میں بھی ممتاز تھے۔ یافعی لکھتے ہیں۔ موصوفا بالعبادۃ والصلاح[۵] (یعنی وہ عبادت و صلاح سے متصف تھے) علامہ ذہبی کا بیان ہے

کان ذا زھد وعبادۃ واتقان[۶]۔ (یعنی وہ زاہد، عبادت گزار اور صاحبِ دیانت تھے)۔

وقار | مورخین نے لکھا ہے کہ وہ شرم و حیا کی وجہ سے ہمیشہ نگاہیں نیچی رکھتے اور سر جھکائے رہتے تھے، ان کو کبھی ہنسی مذاق کی بات کرتے نہیں دیکھا گیا، نہایت باوقار طریقہ پر رہتے تھے[۷]۔

عقیدہ و مسلک | بعض لوگوں نے ان کو شیعہ لکھا ہے مگر شیعیت اس زمانے میں تفضیلیت سمجھی جاتی تھی۔

وفات | مامون کے عہد خلافت میں شوال کے آخر یا شروع ذیقعد ۲۱۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا[۸]۔

تصنیفات | عبید اللہ کی تصنیفات میں صرف مسند کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی اہمیت کا سبب بھی اتصالِ

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۵ و طبقات ابن سعد ج ۶ و میزان الاعتدال ج ۲ [۲] طبقات ابن سعد ج ۶ [۳] ایضاً [۴] مراۃ الجنان ج ۲ و تہذیب التہذیب ج، [۵] میزان الاعتدال ج ۲ [۶] ایضاً و تہذیب التہذیب ج، و طبقات ابن سعد ج ۶ [۸] ایضاً۔

Marfat.com

ہے، بعض علمائے اسلام نے سب سے قدیم مسند اسی کو قرار دیا ہے لیکن عام لوگوں کا خیال ہے کہ کوفہ میں سب سے پہلے یہی مسند لکھی گئی[1]، علمائے محدثین نے اس کی قدامت کی وجہ سے اس کا خصوصیت سے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ایک شبہ کا جواب بعض ائمہ جرح و تعدیل نے تشیعت کی وجہ سے ان کی تضعیف کی ہے، امام احمد اور بعض دوسرے علماء نے ان کو صاحب تخلیط اور منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ عثمان بن ابی شیبہ ان کی ثقاہت و صداقت کے معترف ہونے کے باوجود کہتے ہیں کہ وہ سفیان ثوری کی حدیثوں میں قسم قسم کا اضطراب کرتے تھے لیکن مجموعی طور پر ان کی توثیق کی گئی ہے۔ علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ وہ امام بخاری کے شیوخ میں ہیں اور بذات خود نہایت ثقہ بزرگ تھے، البتہ تشیعت سے متہم کئے جاتے ہیں، ائمہ صحاح کا ان سے روایت کرنا ان کے ضبط و ثقاہت کا بڑا ثبوت ہے۔

---

[1] الرسالۃ المستطرفہ۔

امام عبداللہ بن زبیر حمیدی

متوفی ۲۱۹ھ

نام ونسب عبداللہ نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، عبداللہ بن زبیر بن عیسےٰ ابن عبید اللہ

خاندان ووطن ان کا خاندان عربی النسل اور وطن مکہ معظمہ تھا، وہ حمیدی، اسدی، زبیری، قریشی اور مکی کی نسبتوں سے مشہور ہیں۔ سب سے مشہور نسبت قریش کے مشہور قبیلہ اسد کے ایک معزز فرد حمید کی جانب ہے[1]۔ سنہ ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔

اساتذہ حمیدی کے بعض مشہور شیوخ کے نام حسبِ ذیل ہیں،۔

ابراہیم بن سعد، بشر بن بکر تنیسی، سفیان بن عینیہ، عبدالعزیز بن حازم، فضیل ابن عیاض، محمد بن ادریس شافعی، مروان بن معاویہ، مسلم بن خالد، وکیع اور ولید بن مسلم وغیرہ۔ ان بزرگوں میں سفیان ابن عینیہ اور امام شافعیؒ سے ان کو بڑا خاص تعلق تھا، ۱۹، ۲۰ سال تک سفیان کی خدمت میں رہنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا، ان کی دس ہزار حدیثیں حمیدی کو زبانی یاد تھیں، ان کے مرویات کے سب سے زیادہ معتبر اور قابل وثوق راوی سمجھے جاتے تھے، امام شافعیؒ کی صحبت میں بھی ایک عرصہ تک رہے، ان کے ہمراہ مصر تشریف لے گئے اور فقہ کی تکمیل وتخریج کی۔

تلامذہ حمیدی کے اکثر تلامذہ فن حدیث کے ممتاز ماہرین تھے، بعض کے نام یہ ہیں۔

---

[1] کتاب الانساب۔

Marfat.com

احمد بن ازہر نیشاپوری، اسماعیل بن عبد اللہ سمویہ، بشر بن موسیٰ، سلمیٰ بن شبیب، ابوزرعہ عبید اللہ بن عبد الکریم رازی، عبید اللہ بن فضالہ نسائی، محمد بن احمد قرشی، ابوبکر محمد بن ادریس، ابو حاتم بن ادریس محمد بن اسماعیل بخاری، محمد بن سنجر، محمد بن عبد اللہ بن عبد الرحیم برقی، محمد بن یحییٰ ذہلی، ابو العباس محمد بن یونس کدیمی، محمد بن یونس نسائی، ہارون حمال، یعقوب بن شیبہ، یعقوب بن سفیان اور یوسف بن موسیٰ قطان، امام بخاریؒ ان کے خاص فیض یافتہ لوگوں میں تھے، اپنی صحیح میں کچھ حدیثیں ان کے واسطے سے روایت کی ہیں[1]۔

فضل وکمال ان کے علم وفضل اور امامت پر محدثین اور ارباب فن کا اتفاق ہے، امام احمد اور امام بخاری نے ان کو امام کہا ہے، اسحاق بن راہویہ کا بیان ہے کہ "ابو عبیدہ، شافعی اور حمیدی ہمارے زمانہ میں امام ہیں، صاحب شذرات لکھتے ہیں کہ وہ مکہ کے مشہور عالم ومحدث اور امام حجت تھے، ذہبی فرماتے ہیں کہ حمیدی مشہور اور کبار ائمۂ دین میں تھے، ان کا خود بیان ہے کہ عراق میں احمد، خراسان میں اسحاق اور حجاز میں مجھ سے سبقت لے جانے والا کوئی دوسرا نہیں۔

ضبط وثقاہت ان کی قوت حافظ اور ثقاہت مسلّم ہے، امام شافعی کو ان کے غیر معمولی حافظہ کا اعتراف تھا، مورخین نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے یعنی ان کے علم وحافظہ میں احادیث کا وافر ذخیرہ اور وسیع سرمایہ محفوظ تھا، ابن سعد، ابن حبان، حاکم اور ابو حاتم وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے[2]۔ امام بخاری کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ ان کی روایت ملنے کے بعد وہ دوسروں کی مرویات کی پروا نہیں کرتے تھے۔

فقہ واجتہاد فقہ وافتا میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا، امام شافعی سے اس کی تحصیل کی تھی اور امام بخاری حدیث کی طرح فقہ میں بھی ان کے شاگرد تھے اور ان سے اس کی تحصیل کی تھی، مکہ کے فقیہ ومفتی کی حیثیت سے حمیدی کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، مصر سے واپسی کے بعد وہ یہاں فقہ وافتاء کا کام عمر بھر انجام دیتے رہے۔ صاحب مستدرک لکھتے ہیں وہ مکہ کے مشہور عالم ومحدث اور مفتی تھے حدیث وفقہ میں ان کا وہی درجہ اور مرتبہ تھا جو امام احمد کا عراق میں تھا۔

---

[1] فتح الباری ج ا [2] طبقات الشافعیہ ج ا

زہد وورع | ورع و تقویٰ اور دیانت و پاکبازی میں بھی ممتاز تھے، ابن عدی نے ان کی نیکی اور پاکبازی کا ذکر کیا ہے، ابن حبان نے ان کو صاحب سنت بتایا ہے[1]، احادیث و آثار سے شدت تمسک کی بنا پر وہ اہل رائے کو ناپسند کرتے تھے، اس کا اندازہ ان کے رسالہ اصول السنت سے ہوتا ہے۔

عقیدہ ومسلک | عقیدہ و عمل کے لحاظ سے وہ محدثین اور سلف کے مسلک پر عامل تھے، رسالۂ اصول السنۃ سے ان کے بعض عقائد و اعمال کے متعلق ان کا نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے۔

ایمان | قول و عمل دونوں کا نام ہے، اس میں کمی و بیشی ہوتی ہے، سفیان بن عیینہ کے سامنے ان کے بھائی ابراہیم نے کہا کہ "ایمان کم نہیں ہوتا" تو وہ غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ تم بچے ہو، ان مسائل کے بارے میں لب کشائی نہ کرو، ایمان کم بھی ہوتا ہے اور سلب بھی ہو جاتا ہے" ایمان و عمل کا اعتبار نیت پر موقوف ہے۔

تقدیر | تقدیر کے خیر و شر ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ جو کچھ ہوا ہے اس کا ہونا ضروری تھا اور نہ ہونا ناممکن تھا اور جو کچھ نہیں ہوا ہے، اس کا نہ ہونا ممکن نہیں تھا۔

قرآن | قرآن اللہ کا کلام ہے، جو لوگ اس کو مخلوق کہتے ہیں وہ مبتدع اور سلف صالحین کے مسلک سے منحرف ہیں۔

رؤیت | موت کے بعد مومنین دیدار الٰہی سے مشرف ہوں گے۔

صفات الٰہی | قرآن کی وہ آیتیں جن میں اللہ کے ید و یمین اور استوا و تمکن وغیرہ کا ذکر ہے، یا اس قسم کی جو حدیثیں ہیں ان کے مجرد بیان پر اکتفا اور توقف کرنا چاہیئے، نہ ان میں کسی اضافہ کا ہم کو حق ہے اور نہ تشریح و تفسیر کا، اس قسم کی آیات و احادیث میں بحث و کلام کرنے والے اہل باطل اور فرقہ جہمیہ و معطلہ میں شامل ہیں۔

مرتکبین کبائر | کبائر کے مرتکبین کو کافر سمجھنا خوارج کا عقیدہ ہے، گناہ کرنے سے انسان کافر نہیں ہوتا۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۵۔ حسن المحاضرہ ج ۱

احترام صحابہؓ | مسلمانوں کو صحابہ کرامؓ کے لئے دعا و استغفار کرنا چاہئے، قرآن مجید میں ہے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ (الحشر ۱۰)	اے رب بخش دے ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے داخل ہوئے ایمان میں اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں بیر ایمان والوں کا۔

اگر کوئی شخص ایک صحابی کو بھی برا بھلا کہے تو وہ جادۂ سنت سے منحرف ہے۔[1]

وفات | اپنے وطن مکہ میں ربیع الاول ۲۱۹ھ میں وفات پائی، ۲۲۰ھ بھی سنہ وفات بتایا جاتا ہے۔

تصنیفات | رسالہ اصول السنۃ کے علاوہ حمیدی کی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں :-

(۱) کتاب الرد علی النعمان

(۲) کتاب التفسیر[2]

(۳) مسند۔ حمیدی کی یہ سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے جو ۱۱ اجزا اور ۱۲۹۳ حدیثوں پر مشتمل ہے۔[3] اس کے رواۃ میں بشر بن موسیٰ اسدی بڑے ثقہ اور نامور محدث تھے، بعض صحابہ کے مرویات اس میں شامل نہیں ہو سکے، اس کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں :-

(۱) اس کا شمار قدیم ترین کتب مسانید میں ہوتا ہے، اور اغلب یہ ہے کہ مکہ میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی تھی۔

(۲) اکثر روایات مرفوع ہیں، موقوف روایتیں کم ہیں۔

(۳) صحابہ و تابعین کے آثار کا حصہ بھی اس میں شامل ہے۔

(۴) احادیث کے نقل و روایت ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ایک ماہر فن کی طرح ان کے متعلق

---

[1] اصول السنۃ بر خاتمہ مسند حمیدی مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ج ۲ ص ۵۴۶۔ [2] مقدمہ مسند حمیدی ج ۱ بحوالہ الجرح والتعدیل ج اول۔ [3] الرسالۃ المستطرفہ۔

Marfat.com

مختلف النوع معلومات بھی درج ہیں۔

مسند کے مخطوطے دارالعلوم دیو بند، حیدر آباد کے کتبہ سعیدیہ و جامع عثمانیہ اور دمشق کے دارالکتب الظاہریہ میں موجود تھے، مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے ان نسخوں کی مدد سے مسند کو پہلی مرتبہ ۱۹۶۲ء میں تصحیح و تحشیہ کے بعد دو جلدوں میں شائع کیا ہے، خاتمہ پر رسالہ اصول السنہ بھی دے دیا ہے، حواشی میں مشکل الفاظ کی تشریح، اختلاف نسخ اور مختلف کتب حدیث سے اس کی حدیثوں کے باہمی اختلاف و مطابقت وغیرہ کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے مطالب عالیہ میں مسند کے زوائد بیان کئے ہیں[1]۔

---

[1] مقدمہ مسند حمیدی۔

Marfat.com

امام سعید بن منصور

متوفی ۲۲۷ھ

نام ونسب | سعید نام اور ابو عثمان کنیت تھی۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: سعید بن منصور ابن شعبہ۔

وطن | سعید کا سنہ ولادت نہیں معلوم ہو سکا اور وطن کے متعلق بھی اختلاف ہے، ایک روایت کے مطابق وہ جوزجان میں پیدا ہوئے اور بلخ میں نشو ونما پائی۔ زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ ان کا وطن مرو تھا اور بلخ میں بود وباش اختیار کر لی تھی، طالقان کو بھی ان کا مولد بتایا جاتا ہے، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مرو، طالقان اور جوزجان سب بلخ ہی کے قرب ونواح میں تھوڑے سے فاصلہ پر واقع تھے۔ بلخ جو بعد میں ان کی مستقل قیام گاہ بن گیا تھا خراسان کا مشہور ردم خیز شہر اور ایک عرصہ تک اس کا پایۂ تخت رہا ہے، ان مقامات کی نسبت سے وہ مروزی، طالقانی، بلخی اور خراسانی مشہور ہیں[1]۔

اساتذہ | سعید بن منصور نے نہایت مقدس علمائے اسلام اور برگزیدہ محدثین سے کسب فیض کیا تھا، مشہور محدث اسماعیل بن علیہ کے مرویات کے سب سے بڑے ناقل ہونے کی وجہ سے ان کے راوی کہلاتے تھے، امام مالک سے انہوں نے موطا کے علاوہ بہت سی حدیثوں کا سماع کیا تھا، لیث بن سعد اور سفیان بن عیینہ سے بھی ان کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہے۔ دوسرے

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲، تہذیب التہذیب ج ۴، خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال، کتاب الانساب، بستان المحدثین

مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:۔

ابو قدامہ حارث بن عبید، حماد بن زید، داؤد بن عبدالرحمٰن بن ابی الزناد، ابوالاحوص، سلام بن سلیم، شریک بن عبداللہ، ابو شہاب عبدربہ بن نافع، عبدالعزیز بن ابی حازم، سلمہ بن دینار، عبیداللہ بن ایاد فلیح بن سلیمان، مہدی بن میمون، ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن، ہشیم بن بشیر اور ابو عوانہ وضاح بن عبداللہ بزاز وغیرہ۔

تلامذہ اساتذہ کی طرح ان کے تلامذہ میں بھی نامور علماء و محدثین شامل ہیں، امام احمد، امام مسلم اور ابو داؤد ان کے حلقۂ فیض میں داخل تھے، صحاح کی دوسری کتابوں میں بھی سعید کے مرویات بالواسطہ شامل کئے گئے ہیں، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:۔

ابو ثور ابراہیم بن خالد کلبی، ابو بکر اثرم، ابو شعیب حرانی، احمد بن خلید حلبی، بشر بن موسیٰ، حرب بن اسماعیل کرمانی، حسن بن محمد زعفرانی، عباس بن عبداللہ سندی، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، ابو زرعہ عبدالرحمٰن بن عمرو دمشقی، ابو زرعہ عبیداللہ بن کریم رازی، عمر بن منصور نسائی، ابو حاتم محمد بن ادریس، محمد بن علی بن میمون رقی، ابو عبداللہ محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن موسیٰ وغیرہ[۱]۔

رحلت و سفر حدیث کی طلب و جستجو میں ان کے کثرت سفر کو مزی نے وکان حافظاً جوالاً اور علامہ ابن حجر نے طاف البلاد کے الفاظ سے بیان کیا ہے[۲]۔

عظمت سعید بن منصور کی علمی عظمت کا اندازہ ان کے اساتذہ اور تلامذہ کے ناموں سے ظاہر ہے، امام احمدؒ ان کے بڑے قدر دان اور مداح تھے اور ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ ان کا ذکر کرتے تھے، محمد بن عبدالرحیم جب ان کی روایت بیان کرتے تو تعریف کرتے اور کہتے حدثنا سعید وکان ثبتاً[۳]

حفظ و ثقاہت علماء فن ان کے حفظ و ثقاہت کے بھی معترف تھے، یحییٰ بن حسان دوسرے

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔ تہذیب التہذیب ج ۴۔ خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال۔ کتاب الانساب۔ بستان المحدثین [۲] خلاصہ تذہیب الکمال و تہذیب التہذیب ج ۴ [۳] تہذیب التہذیب ج ۴۔

Marfat.com

محدثین کے مقابلے میں ان کی فضیلت کے اور حفظ وضبط کے بڑے قائل تھے، حرب کرمانی کا بیان ہے کہ سعید نے ہم کو دس ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں، امام احمد ان کو سچا اور صاحب فضل وکمال بتاتے ہیں، ابو حاتم، ابن حبان، ابن نمیر، ابن خراش، ابن قانع اور مسلمہ بن قاسم نے ان کی توثیق و تعدیل کی ہے خلیلی کہتے ہیں کہ ان کی ثقاہت پر اتفاق ہے، حافظ ذہبی نے ان کو الحافظ الثقہ اور الحافظ الامام الحجۃ لکھا ہے، ابن عماد کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور مشہور محدثین میں تھے[۱]

وفات آخر عمر میں انہوں نے مکہ معظمہ میں مستقل قیام کر لیا تھا اور یہیں تقریباً نوّے سال کی عمر میں مشہور اور صحیح روایت کے مطابق ۲۲۷ھ میں وفات پائی[۲]

تصنیفات سعید بن منصور صاحب تصانیف تھے[۳] مگر ان کی کتابیں معدوم ہیں، صرف ایک کتاب سنن کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ بھی طبع نہیں ہوئی ہے، سنن کو انہوں نے آخر عمر میں مکہ معظمہ کے زمانہ قیام میں مرتب کیا تھا[۴] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بڑی چھان بین، محنت و احتیاط اور حذف و ترمیم کے بعد مرتب کی گئی تھی، اس لئے نہایت مستند اور معتبر ہو گی، احمد بن نجدہ اور محمد بن علی بن صائغ نے اس کی روایت کی ہے، اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اکثر روایتیں ثلاثی ہیں[۵] اور اہمیت کا حال یہ ہے کہ (جمع فیہ ما لم یجمعہ غیرہ) سنن ابی سعید میں جو کچھ اکٹھا کیا گیا، دوسرے مجموعہ احادیث ان سے خالی ہیں، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

وہ اس مشہور سنن کے مصنف ہیں
جو بے نظیر اور عدیم المثال ہے۔[۶]

نقد و جرح سعید بن منصور کے متعلق علامہ ذہبی نے یعقوب فسوی سے روایت

۱؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۲، تہذیب التہذیب ج ۴ و میزان الاعتدال ج ۱ و شذرات الذہب ج ۲ ۔ ۲؎ طبقات ابن سعد قسم اول جزء ۵، العبر فی خبر من غبر ج ۱ ۔ ۳؎ تہذیب التہذیب ج ۴ ۔ ۴؎ الرسالۃ المستطرفہ ۔
۵؎ تہذیب التہذیب ۔ بستان المحدثین ۔ ۶؎ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال و البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ۔

Marfat.com

کی ہے کہ "وہ اپنی غلطی جان لینے کے بعد بھی اس سے رجوع نہیں کرتے تھے" لیکن ان کی عام مدح و توصیف کے متعلق اتنے کثرت سے اقوال منقول ہیں کہ ان کے مقابلہ میں اگر فسوی کا قول صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں اور اس سے سعید کے مرتبہ و عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "ایسا وہ اس لئے کرتے تھے کہ ان کو اپنی کتاب کی صداقت و صحت پر پورا اعتماد اور وثوق تھا"[1]

---

[1] میزان الاعتدال ج ۱ و تقریب التہذیب۔

Marfat.com

امام محمد بن صباح دُولابی

متوفی ۲۲۷ھ

نام و نسب | نام محمد، ابو جعفر کنیت بزار لقب اور والد کا نام صباح ہے، اس سے زیادہ نسب نامہ کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی۔

ولادت | مورخین اور علمائے طبقات و رجال نے ان کے سنہ ولادت کی تصریح نہیں کی ہے لیکن ان کی وفات ۲۲۷ھ میں ہوئی اور خطیب نے لکھا ہے کہ اس وقت ستر سال سے زیادہ عمر تھی، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وفات کے وقت ستتر سال کے تھے[1]۔ اس اعتبار سے وہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

خاندان | ان کے خاندان کا قبیلہ مزینہ سے ولاء کا تعلق تھا[2] اسی بنا پر مزنی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

وطن | ان کی نسبت دولابی کے متعلق اختلاف ہے، بعض لوگوں کے نزدیک دولاب رے کے ایک گاؤں کا نام ہے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے[3] لیکن علامہ سمعانی کا خیال ہے کہ دولاب رہٹ اور چرخی کو کہتے ہیں جو شخص اس کا پیشہ کرتا ہو جس کے پاس چرخی ہو اسے دولابی کہا جاتا ہے ابو جعفر محمد بن صباح کو بھی اس بنا پر دولابی کہا جاتا ہے[4]۔ یاقوت حموی کے نزدیک دولاب نام کے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۵ و میزان الاعتدال ج ۲ و تہذیب التہذیب ج ۹ [2] تاریخ بغداد ج ۵ و تہذیب التہذیب ج ۹ [3] میزان ج ۲ و تہذیب ج ۹ [4] کتاب الانساب۔

متعدد مقامات تھے، ابوجعفر دولابی کا تعلق دولاب مبارک سے تھا جو بغداد کے مشرقی جانب واقع ہے[1] آخر میں انہوں نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی[2]

اساتذہ ابوجعفر دولابی نے نہایت برگزیدہ اور جلیل القدر محدثین سے احادیث کی روایت کی ہے، بعض شیوخ کے نام یہ ہیں :-

ابراہیم بن سعد، ابن ابی عبیدہ حداد، اسماعیل بن جعفر، اسماعیل بن زکریا خلقانی، اسماعیل بن علیہ حفص بن غیاث، خالد بن عبداللہ واسطی، سعید بن محمد وراق، سفیان بن عیینہ، قاضی شریک بن عبداللہ، عبدالرحمٰن بن ابی الزناد، عبداللہ بن مبارک، عمر بن یونس یمامی، ابوقطن عمرو بن ہیثم، فضل بن موسیٰ سینانی، ہشیم بن بشیر، ولید بن ابی ثور، ولید بن مسلم، یزید بن ہارون، یوسف بن یعقوب، ماجشون وغیرہ،

تلامذہ ان کے تلامذہ میں بھی ممتاز محدثین شامل ہیں، چند کے نام یہ ہیں :-

ابراہیم حربی، ابراہیم بن ہانی، ابراہیم بن یعقوب جوزجانی، ابن ابی خیثمہ، ابن ابی الدنیا، ابوحاتم رازی، ابوزرعہ دمشقی، ابوزرعہ رازی، ابوقدامہ سرخسی، احمد بن حنبل، ابویعلی، احمد بن علی موصلی، احمد بن محمد بن صباح، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یحییٰ حلوانی، اسماعیل سمویہ، حسن بن علی خلال، حسن بن محمد صباح زعفرانی، داؤد بن ابن سلیمان دقاق، عبداللہ بن حنبل، عبدالملک بن عبدالحمید میمونی، عثمان بن سعید دارمی، عیسیٰ بن عبداللہ طیالسی، فضل بن سہل اعرج، ابوالعلا محمد بن احمد جعفر، محمد بن بشر بن مطر، محمد بن غالب تمتام، محمد بن یحییٰ حرانی، محمد بن یحییٰ ذہلی، یحییٰ بن معین وغیرہ[3]

ائمہ صحاح اور اصحاب سنن میں امام بخاری، امام مسلم اور ابوداؤد نے براہ راست اور دوسرے ائمہ نے امام بخاری کے واسطہ سے ان سے روایت کی ہے، صحیح بخاری میں بارہ اور صحیح مسلم میں بیس حدیثیں ان کے واسطہ سے مروی ہیں[4]

حفظ و ثقاہت علمائے فن نے بالاتفاق ان کو ثقہ و ضابط قرار دیا ہے۔ امام احمد فرماتے

---

[1] معجم البلدان ج ۴ [2] تاریخ بغداد ج ۵ و تہذیب التہذیب ج ۹ [3] تاریخ بغداد ج ۵ و تہذیب التہذیب ج ۹ [4] تہذیب التہذیب جلد ۹ -

Marfat.com

تھے کہ وہ ہمارے شیخ اور نہایت ثقہ بزرگ ہیں، ابن معین کا بیان ہے کہ دولابی ثقہ و مامون تھے، احمد عجلی نے ان کو ثقہ، ابوحاتم نے ثقہ، قابل حجت اور مستند کہا ہے اور ابن حبان نے ثقات میں شامل کیا ہے، تمام جب ان کے واسطے حدیث بیان کرتے تو کہتے ہم سے محمد بن صباح دولابی نے جو ثقہ و مامون تھے روایت کی ہے، یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ، صاحب حدیث اور ہشیم کے مرویات کے سب سے زیادہ ممتاز عالم تھے، سلمہ نے ان کو ثقہ اور مشہور محدث اور ذہبی نے ثقہ و حجت قرار دیا ہے[۵]۔

زہد و تقویٰ تدین و تقویٰ اور زہد و صلاح میں بھی نہایت ممتاز تھے، علامہ ابن عدی فرماتے ہیں کہ وہ بڑے صالح اور نیک بزرگ تھے[۶]۔

عزت و احترام علمی و دینی حیثیت سے ان کی شخصیت اتنی ممتاز تھی کہ علما و صلحا ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے، امام احمد ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے[۷]۔

وفات تقریباً ستتر سال کی عمر میں بغداد میں محرم ۲۲۷ھ میں انتقال کیا[۸]۔

اولاد مورخین نے ان کے ایک صاحبزادے احمد کا ضمناً تذکرہ کیا ہے جو بڑے صاحب کمال محدث تھے[۹]۔

تصنیفات ان کی تصنیفات میں ایک مجموعہ سنن کا مورخین اور علمائے طبقات و رجال نے ذکر کیا ہے[۱۰]۔ ذہبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنن و احکام سے متعلق روایات کا یہ ایک مختصر مگر منتخب اور مستند مجموعہ تھا۔

---

[۱] تہذیب التہذیب ج۹ و تاریخ بغداد ج۵ و میزان الاعتدال ج۳ [۲] تہذیب التہذیب ج۹ [۳] ایضاً [۴] ایضاً و میزان ج۳ و تاریخ بغداد ج۵ [۵] کتاب الانساب و تاریخ بغداد ج۵ [۶] البدایہ والنہایہ ج۱۰ [۷] العبر ج۱

امام یحییٰ بن عبدالحمید حمانی

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام ونسب یحییٰ نام ابوزکریا کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، یحییٰ بن عبدالحمید بن عبدالرحمٰن بن میمون بن عبدالحمید۔[1]

حافظ ابن حجر نے عبدالرحمٰن اور آخری عبدالحمید کے بجائے عبداللہ اور عبدالرحمٰن لکھا ہے،[2] یحییٰ کے والد بھی اکابر محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کے پردادا میمون کا لقب کشمین تھا۔[3]

خاندان ووطن قبیلہ حمان سے نسبی تعلق رکھتے تھے یہ قبیلہ کوفہ میں آباد ہو گیا تھا جو یحییٰ کا وطن ہے اسی لئے وہ کوفی اور حمانی کی نسبتوں سے مشہور ہیں۔

پیدائش ان کے سنہ ولادت کی تعیین وتصریح کتابوں میں نہیں ہے، قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۵ھ اور ۱۶۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔

اساتذہ اپنے والد ماجد عبدالحمید کے علاوہ انہوں نے جن نامور محدثین سے اکتساب فیض کیا تھا ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

ابراہیم بن سعد، ابو اسرائیل ملائی، ابوبکر بن عیاش، ابو خالد الاحمر، ابو عوانہ، ابو معاویہ ضریر، جریر بن عبدالحمید، جعفر بن سلیمان، حکم بن ظہیر، حماد بن زید، خالد بن عبداللہ، سفیان بن عیینہ، سلیمان

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۱ [3] تاریخ بغداد ج ۱۴ ومقدمہ فتح الباری۔

Marfat.com

بن بلال، شریک بن عبداللہ، عبدالرحمن بن زید، عبدالرحمن بن غسیل، عبداللہ بن مبارک، عبدالواحد بن زیاد، قیس بن ربیع، ہشام، ہشیم، وکیع اور یحییٰ بن یمان وغیرہ۔

تلامذہ ان کے حلقہ فیض سے جو اہم اور جلیل القدر محدثین وابستہ تھے ان کے نام یہ ہیں۔

ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوحاتم، ابوقلابہ رقاشی، ابویعلیٰ موصلی، احمد بن یحییٰ حلوانی، حمدان بن علی وراق، عبداللہ بن احمد دورقی، عبداللہ بن محمد بغوی، عثمان بن خرزاذ، علی بن عبدالعزیز بغوی، قیسم بن عباد ترمذی، محمد بن ابراہیم بوشنجی، محمد بن الیدب، محمد بن حسین وداعی، محمد بن عبید بن ابی الاسد، موسیٰ بن اسحاق انصاری، اور موسیٰ بن ہارون وغیرہ[1]

سفر طلب حدیث کے لئے ان کے سفر و سیاحت کا بھی ذکر ملتا ہے، خطیب نے بغداد جانے کی تصریح کی ہے۔

حدیث میں درجہ وہ بلند پایہ اور نامور محدث تھے، ان کے اساتذہ میں سفیان بن عیینہ وغیرہ ان کے علم و فضل اور حدیث میں کمال کے معترف تھے، علامہ ذہبی اور خطیب نے احد ارکان الحدیث اور احد المحدثین کے الفاظ سے ان کا تعارف کرایا ہے[2]۔

حافظہ ان کی قوت حافظہ غیر معمولی تھی، ائمہ فن نے الحافظ، الحافظ الکبیر و کان من اعیان الحفاظ وغیرہ الفاظ سے انہیں موسوم کیا ہے، ابن معین کا بیان ہے کہ کوفہ میں ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں تھا، شریک کے مرویات خاص طور پر انہیں حفظ تھے، ایک روایت کے مطابق ان کی سات ہزار حدیثوں کا ذخیرہ یحییٰ حمانی کے پاس تھا۔

ثقاہت اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے ابن عدی فرماتے ہیں لا باس بہ یعنی ان کی روایات میں کوئی مضائقہ نہیں، ابن معین نے ان کی ثقاہت کا اعتراف کیا ہے، ایک دفعہ فرمایا کہ وہ صدوق تھے محض حسد کی وجہ سے ان میں کلام کیا گیا ہے، لیکن امام نسائی نے انہیں ضعیف

---

[1] کتاب الانساب و تاریخ بغداد ج ۱۴ تہذیب التہذیب ج ۱۱ [2] تاریخ بغداد ج ۱۴ و العبر ج ۱۔
[2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال۔

اور امام احمد ابن مدینی، ذہلی اور علامہ ابن سعد وغیرہ ائمہ نے ان پر جرح بھی کی ہے[1] لیکن ان کی اکثریت ان کو ثقہ اور حجت مانتی ہے، امام بخاری تک نے اپنی صحیح میں فضائل قرآن کے ابواب میں ان کے واسطے ایک روایت نقل کی ہے[2]۔

وفات مشہور روایت کے مطابق ان کا انتقال رمضان ۲۲۸ھ میں ہوا[3]۔ لیکن ابن سعد کا بیان ہے کہ ۲۳۰ھ میں وفات پائی[4]۔

تصنیفات ان کی ایک تصنیف مسند کا پتہ چلتا ہے جو بہت ضخیم تھی[5]، ابن عدی لکھتے ہیں۔

ولہ مسند صالح ولم ار شیئا منکرا فی مسندہ[6]	مسند حمانی نہایت عمدہ اور بہتر ہے مجھے اس کے اندر کوئی منکر حدیث نظر نہیں آئی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کوفہ میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی جو صحیح نہیں معلوم ہوتا، عبید اللہ بن موسیٰ بھی صاحب مسند ہیں، ان کے اور حمانی کے سنہ وفات میں کم از کم پندرہ سال کا تفاوت ہے، اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ انہوں نے حمانی سے پہلے مسند مرتب کی ہو گی، لیکن مسند حمانی کی قدامت بھی مسلم ہے۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ و میزان الاعتدال ج ۳ [2] مقدمہ فتح الباری [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔ و خلاصہ تذہیب و تہذیب ج ۱۱ [4] طبقات ابن سعد ج ۶ [5] کتاب الانساب۔ [6] خلاصہ تذہیب و میزان الاعتدال ج ۳۔

امام مسدد بن مسرہد

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام ونسب ابوالحسن کنیت، مسدد لقب اور عبدالملک نام تھا، نسب نامہ یہ ہے:
مسدد بن مسرہد بن مسربل بن ماسک بن حرد بن یزید بن شبیب بن صلیب بن مالک بن اسد بن شریک۔

دوسرا نسب نامہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے:۔ مسدد بن مسرہد بن مسربل بن مغربل بن مرعبل بن مطربل بن ارندل بن سرندل بن عرندل بن ماسک بن مستورد[1]۔

علامہ سمعانی نے دونوں نسب نامے نقل کر کے پہلے کو صحیح بتایا ہے[2]۔

ولادت وخاندان نسبی تعلق عرب کے مشہور قبیلہ بنو اسد سے اور وطن بصرہ ہے۔ اسی لئے اسدی اور بصری کہلاتے ہیں[3]۔ سنہ ولادت کی مورخین اور علمائے طبقات نے کوئی تصریح نہیں کی ہے، اس لئے اس کی تعیین دشوار ہے۔ قیاس ہے کہ ۱۵۰ھ یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

اساتذہ وشیوخ ان کے بعض اکابر شیوخ کے نام یہ ہیں:۔

ابوالاحوص، ابوعوانہ، اسماعیل بن علیہ، باذام بن عمرو، جراح بن ملیح، جعفر بن سلیمان، بشر بن مفضل، جویریہ بن اسماء، حماد بن زید، حمید بن اسود، خالد بن حارث، خالد بن عبداللہ واسطی، عبداللہ بن یحیی،

---

[1] شذرات الذہب ج ۲ [2] کتاب الانساب [3] تہذیب التہذیب ج ۱۰۔

بن ابی کثیر، عبدالواحد بن زیاد، عبدالوارث بن سعید، عیسیٰ بن یونس، فضیل بن عیاض، قطان، محمد بن جابر یحیمی، معتمر بن سلیمان، مہدی بن میمون، وکیع، ہشیم، یزید بن زریع اور یوسف بن ماجشون وغیرہ۔[1]

تلامذہ | بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:۔

ابراہیم بن یعقوب جوزجانی، ابوحاتم رازی، ابوخلیفہ جمحی، ابوزرعہ رازی، احمد بن محمد بن مدریہ، قاضی اسماعیل بن اسحاق، حسن بن احمد کرمانی، حماد بن اسحاق، محمد بن سعید دندانی، معاذ بن مثنیٰ یعقوب بن شیبہ، قاضی یوسف بن یعقوب وغیرہ،

ائمہ صحاح میں امام بخاری نے بلاواسطہ اور امام ترمذی نے بالواسطہ اور امام ابوداؤد نے دونوں طریقوں پر ان سے روایت کی ہے۔[2]

حدیث میں امتیاز | مسدد بن مسرہد کے اساتذہ و تلامذہ کی عظمت سے خود ان کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے، ان کا اپنے زمانہ کے اکابر فضلاء اور بصرہ کے نہایت مشہور اور ممتاز الفضلاء محدثین میں شمار ہوتا تھا۔[3]

حافظہ | ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، محدثین میں وہ "الحافظ" کے لقب سے مشہور تھے، عجلی کا بیان ہے کہ ان کی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ جب وہ املاء کرانے لگتے تو اتنی زیادہ حدیثیں بیان کرتے کہ ہم لوگ لکھتے لکھتے گھبرا جاتے تھے۔[4] ذہبی نے الحافظ الحجۃ اور ابن عماد نے احد الحفاظ الثقات لکھا ہے۔[5]

ثقاہت | ان کی عدالت و ثقاہت پر علمائے فن کا اتفاق ہے، یحییٰ بن معین، روایت کرتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید قطان فرماتے تھے کہ اگر میں مسدد سے ملتا تو ضرور ان سے حدیثیں نقل و روایت کرتا بلاشبہ وہ اس کے اہل تھے، ان کا پایہ نہایت بلند اور وہ بڑے ثقہ تھے، ابوحاتم فرماتے ہیں کہ ان کی وہ حدیثیں جو قطان عبداللہ بن عمر کے واسطے سے روایت کرتے ہیں دنانیر کے مانند ہیں

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ [2] ایضاً [3] کتاب الانساب [4] تہذیب التہذیب ج ۱۰ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ وشذرات الذہب ج ۲۔

گویا تم رسول اللہ ؐ سے ان کو سن رہے ہو۔

امام احمد جیسے بزرگ ان کی عظمت و ثقاہت کے مداح و معترف تھے ان کے شاگرد رشید میمونی کا بیان ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مسدد کی اللہ مغفرت کرے کیا ہی عمدہ اور بہتر شیخ تھے۔ ابو زرعہ فرماتے ہیں کہ امام احمد نے مجھ سے کہا کہ مسدد سے جو حدیثیں میں بیان کرتا ہوں وہ صحیح اور درست ہیں اس لئے تم کو ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔ ابن معین، ابو حاتم، ابن قانع، عجلی اور امام نسائی وغیرہ ائمہ جرح نے ان کی توثیق کی ہے اور ابن حبان نے ثقات میں تذکرہ کیا ہے، جعفر بن عثمان نے یحیٰی بن معین سے دریافت کیا کہ بصرہ کے کس شخص سے حدیثیں لکھی جائیں تو فرمایا مسدد سے، لاریب وہ ثقہ اور مستند تھے[1]

وفات رمضان المبارک ۲۲۸ھ میں جب کہ بوڑھے ہو چکے تھے، انتقال کیا[2]۔

تصانیف ان کی تصنیفات میں صرف مسند کا ذکر ملتا ہے، علامہ ذہبی نے اس کے بعض حصوں کا سماع کیا تھا[3]، یہ مقطوع و موقوف ہر قسم کی روایتوں کا مجموعہ تھا، امام دارقطنی نے سب سے پہلی مسند اسی کو قرار دیا ہے[4]۔ اور ابن عدی کا بیان ہے کہ بصرہ میں مسند لکھنے کا شرف سب سے پہلے مسدد ہی کو حاصل ہوا[5]۔ اس مسند کی اہمیت اس کی قدامت کی وجہ سے ہے۔ تمام اصحاب تراجم و فہرست نے اس کا ذکر کیا ہے اس سے بھی اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و طبقات ابن سعد قسم دوم جز ہفتم [3] العبر ج ا و تذکرۃ ج ۲ و شذرات الذہب ج ۲ [4] العبر ج ۱ اور الرسالۃ المستطرفۃ [5] تقریب التہذیب و تہذیب التہذیب ج ۱۰

امام نعیم بن حماد خزاعی

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام ونسب نعیم نام ابو عبداللہ کنیت، اور نسب نامہ یہ ہے:۔ نعیم بن حماد بن معاویہ بن حارث بن ہمام بن سلمہ بن مالک[1]۔

خاندان ووطن ان کا قبیلہ خزاعہ سے خاندانی اور خراسان کے مشہور شہر مرو سے وطنی تعلق تھا لیکن مصر میں مستقل بود و باش اختیار کرلی تھی اس لئے خزاعی، مروزی اور مصری کی نسبتوں سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

اساتذہ وشیوخ انہوں نے جن نامور علمائے اسلام سے استفادہ کیا تھا، ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

ابراہیم بن سعد، ابراہیم بن طہمان، ابوبکر بن عیاش، ابوحمزہ عسکری، ابوداؤد طیالسی، بقیہ بن ولید، جریر بن عبدالحمید، حفص بن غیاث، خارجہ بن مصعب، زبید بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک عبدالوہاب ثقفی، عیسیٰ بن عبید کندی، فضل بن موسیٰ سینانی، فضیل بن عیاض، نوح ابن ابی مریم، معتمر بن سلیمان اور ہشیم وغیرہ، روح بن عبادہ سے پچاس ہزار حدیثوں کا سماع کیا تھا[2]۔

تلامذہ ان کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:۔

ابراہیم بن جوزجانی، ابوالاحوص عکبری، ابوبکر صنعانی، ابوحاتم رازی، ابواسماعیل ترمذی، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یوسف سلمی، اسماعیل سمویہ، بکر بن سہل دمیاطی، حمزہ بن محمد بن عیسیٰ بغدادی، علی بن داؤد قنطری

---

[1] تاریخ بغداد وتہذیب [2] تہذیب التہذیب ج ۱

Marfat.com

عصام بن رواد بن جراح، عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی، محمد بن عوف طائی، محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن معین وغیرہ صحاح ستہ کے مصنفین کے متعلق حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

امام بخاری نے صرف ایک دو مواقع پر ان سے روایت کی ہے لیکن اکثر مواقع پر تعلیق کی ہے، امام مسلم نے مقدمہ میں ایک جگہ ان کی روایت لی ہے، بقیہ آئمہ سنن میں امام نسائی کے علاوہ سب نے ان سے بالواسطہ روایتیں کی ہیں[۱]۔

طلب حدیث کے لئے سفر مورخین لکھتے ہیں کہ طلب الحدیث طلبا کثیرا بالعراق والحجاز یعنی عراق وحجاز میں نہایت دلچسپی اور انہماک سے حدیث کی تحصیل وتکمیل کی، عراق وحجاز میں ایک عرصہ تک قیام کرنے کے بعد مصر تشریف لائے اور چالیس سال کے لگ بھگ وہاں رہے[۲]۔

حفظ وثقاہت حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان کے لئے مشہور وممتاز تھے، یحییٰ بن معین، امام احمد، عجلی، ابن عدی اور ابو حاتم وغیرہ متعدد اکابر محدثین اور آئمہ جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے بعض ائمہ فن نے ان کے وہم وخطا کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اس سے ان کی عدالت وثقاہت میں فرق نہیں آتا۔ ابن معین وغیرہ کا بھی یہی خیال ہے[۳]۔

فقہ حدیث کی طرح ان کو فقہ سے بھی بڑی مناسبت تھی اور علم فرائض کے ماہر تھے اسی لئے فرائضی بھی کہلاتے تھے، مورخین نے فقیہ عارف بالفرائض اور من اعلم الناس بالفرائض کہہ کر اس کا اعتراف کیا ہے۔

علم وفضل ان کے علم وفضل کے بھی تمام علماء معترف تھے۔ علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کے متعلق احد علماء العصر (یکتائے روزگار) اور کان من اوعیۃ العلم (خزانہ) لکھا ہے[۴]۔

دینی حمیت نعیم بن حماد بڑے متبع سنت اور دیندار بزرگ تھے۔ حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وہ ان لوگوں میں تھے جو سنتوں کے معاملہ میں نہایت متشدد ومتصلب تھے اور اہل بدعت واہواء سنت

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱۰ [۲] ایضاً وتاریخ بغداد ج ۱۳ ومیزان الاعتدال ج ۳ [۳] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ومیزان الاعتدال ج ۳ [۴] تہذیب ج ۱۰ ومیزان الاعتدال ج ۳۔

متنفر اور بیزار رہتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے وہ خود بھی جہمیہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ابو عصمہ کے فیض صحبت سے جن کے یہ کاتب تھے اور جو جہمیت سے سخت متنفر تھے ان کو بھی جہمیہ اور اہل اہواء سے سخت تنفر ہو گیا تھا[۱]۔

قید و بند امام نعیم کی دینی حمیت اور غیرت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان سے خلق قرآن کا عقیدہ جبراً قبول کرنے کے لئے کہا گیا لیکن انہوں نے اصحاب دعوت و عزیمت کی طرح اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ان کو قید و بند کی مشقت سے دوچار ہونا پڑا اور وہ مصر سے قید کر کے عراق لائے گئے اور بغداد یا سامرا میں قید خانہ میں انتقال کیا[۲]۔

وفات ۱۲ جمادی الاولیٰ ۲۲۸ھ کو انتقال کیا۔ ۲۲۷ھ کی بھی روایت کی گئی ہے[۳]۔

تصنیفات وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں ولہ المصنفات فی السنن وغیرہا[۴]، ان کی تصنیفات میں دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں:۔

(۱) **الفتن والملاحم**:۔ یہ بڑی اہم، مشہور اور اپنے موضوع پر نہایت قدیم کتاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے[۵]۔

(۲) **مسند**:۔ اس کو قدامت کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل ہے، ایک عرصہ تک یہ اہل علم میں متداول رہ چکی ہے، بعض علماء سب سے قدیم مسند اسی کو بتاتے ہیں، امام احمد فرماتے ہیں ہمارے علم کے مطابق کتب مسند میں سب سے پہلی تصنیف نعیم کی ہے، خطیب نے لکھا ہے کہ مسند کے سب سے پہلے جامع و مرتب یہی تھے[۶]۔

---

[۱] تہذیب جلد ۱۰ و میزان الاعتدال ج ۳ [۲] تہذیب ج ۱۰ و تذکرۃ الحفاظ [۳] ایضاً [۴] البدایہ ج ۱۰ [۵] ضحی الاسلام ج ۲ ۔ تہذیب ج ۱۰ و تذکرہ الحفاظ ج ۲ ۔ [۶] تہذیب ج ۱۰ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲

Marfat.com

امام عبداللہ بن محمد جعفی

(متوفی ۲۲۶ھ)

نام و نسب | عبداللہ نام، ابوجعفر کنیت اور مسندی لقب تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے، عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن جعفر بن یمان بن اخنس بن خنیس[1]

خاندان و وطن | ماوراء النہر کا مشہور شہر بخارا جو امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری اور دوسرے اکابر محدثین کا مولد و مسکن ہے، ابوجعفر جعفی بھی اسی خاک کے نامور محدث تھے، جعفی بن سعد مذحجی کے موالی تھے اسی نسبت سے جعفی کہلائے[2] مسندی اس لئے کہلاتے تھے کہ مرسل اور منقطع حدیثوں کے بجائے ان کو مسند اور متصل حدیثوں کی تلاش رہتی تھی[3]

اساتذہ | ابوجعفر مسندی کے بعض اساتذہ و شیوخ کے نام یہ ہیں۔

ابوداؤد، ابوعامر عقدی، اسحاق بن ازرق حرمی بن عمارہ، خلیل بن احمد مزنی، سفیان بن عیینہ عبدالرزاق، فضیل بن عیاض، مروان بن معاویہ، معتمر بن سلیمان، یحییٰ بن آدم وغیرہ۔

تلامذہ | چند مشہور تلامذہ یہ ہیں۔

ابوحاتم رازی، ابوزرعہ رازی، احمد بن سیار حمدون بن عمارہ بزار، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی،

---

[1] کتاب الانساب و تہذیب التہذیب ج ۶ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و حاشیہ العبر ابوالعلاء الفاب

[3] تہذیب التہذیب ج ۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و کتاب الانساب۔

Marfat.com

عبیداللہ بن واصل، محمد بن احمد بن ہارون مصیصی، محمد بن نصر مروزی، محمد بن یحییٰ ذہلی وغیرہ۔

ان کی محدثانہ عظمت اس سے ظاہر ہے کہ امام بخاری اور ان کے واسطہ سے امام ترمذی نے ان سے روایتیں نقل کی ہیں، امام بخاری کی صحیح میں ان کے واسطہ سے چوالیس حدیثیں درج ہیں[1]۔

رحلت و سفر | مورخین اور علمائے طبقات نے احادیث کی طلب و جستجو کے لئے سفر و سیاحت کا بھی ذکر کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے یمن جانے کی تصریح کی ہے[2]۔

حفظ و ثقاہت | محدثین اور علمائے فن نے ان کو ثقہ اور معتبر حافظ و محدث قرار دیا ہے، ابن عماد نے الثبت حافظ ذہبی نے الحافظ الحجۃ اور علامہ ابن حجر نے ثقہ و حافظ کہہ کر ان کا تعارف کرایا ہے[3]۔ احمد بن یسار فرماتے ہیں کہ وہ صاحب سنت اور ضبط و اتقان اور صدق و عدالت کے لئے مشہور تھے، ابو حاتم نے صدوق اور ابن حبان نے ثقہ و متقن کہا ہے اور علامہ خلیلی کا خیال ہے کہ ان کی ثقاہت و اعتبار پر اتفاق ہے[4]۔

اعتراف | اہل علم اور محدثین نے ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے، علامہ سمعانی نے عالم بخاری اور دوسرے علماء نے امام حدیث لکھا ہے، حاکم کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں بخاری کے استاد اور ماوراء النہر کے امام تھے، حسن بن شجاع نے ایک بار امام بخاری کی ایک حدیث سے ناواقفیت دیکھ کر حیرت سے فرمایا کہ آپ خزانہ حدیث یعنی ابو جعفر مسندی کے پاس جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس حدیث سے ناواقف ہیں[5]۔

وفات | ان کی وفات ان کے وطن بخارا میں ذیقعدہ ۲۲۹ھ میں ہوئی[6]۔

حلیہ | خوش قامت اور موزوں اندام تھے۔ بڑھاپے کی وجہ سے سر اور داڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے[6]۔

تصنیفات | ان کی تصنیفات میں ایک مسند کا ذکر ملتا ہے، ماوراء النہر میں سب سے پہلے ان ہی کو مسند کی جمع و تدوین کی سعادت حاصل ہوئی، حاکم کا بیان ہے کہ انہیں مسندی کہے جانے کا سبب یہ ہے کہ ماوراء النہر میں صحابہؓ کے ناموں کی ترتیب پر سب سے پہلے انہی نے احادیث جمع کی تھیں[7]، یہ مسند بھی اپنی صحت قدامت کی وجہ سے مشہور اور اہم سمجھی جاتی ہے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و شذرات الذہب ج ۲ [2] شذرات الذہب ج ۲ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و تقریب التہذیب [3] تہذیب جلد ج ۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [4] تذکرہ ج ۲ و کتاب الانساب [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و تہذیب التہذیب ج ۹ [6] تہذیب التہذیب ج ۹ [7] ایضاً۔

امام ابوبکر بن ابی شیبہ

(متوفی ۲۳۵ھ)

نام ونسب | عبداللہ نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان بن خواستی۔

ولادت، خاندان اور وطن | ابن ابی شیبہ ۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے، ان کا وطن واسط ہے اور وہ قبیلہ بنو عبس کے موالی تھے۔ ان کا خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے دادا ابو شیبہ جن کے نام کی نسبت سے وہ مشہور ہوئے، ایک صاحب علم بزرگ تھے، اور تیئیس سال تک منصور کے زمانہ میں واسط میں منصب قضا پر فائز رہے۔ ابو شیبہ کے فرزند محمد کو بھی علم وفن سے اشتغال تھا، وہ فارس کے قاضی تھے، ان کے تین صاحبزادے، عبداللہ، عثمان اور قاسم اکابر محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں، ابوبکر کا خاندان بعد میں کوفہ میں آباد ہو گیا تھا، اس لئے بعض لوگوں نے ان کو کوفہ کا باشندہ بتایا ہے، کوفی، واسطی اور عبسی ان کی مشہور نسبتیں ہیں[1]۔

اساتذہ اور شیوخ | ابوبکر نے جن نامور محدثین سے اکتساب فیض کیا تھا ان میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں:

ابن ابی زائدہ، ابن شریح، ابوبکر بن عیاش، اسماعیل بن علیہ، اسماعیل بن عیاش، جریر بن عبد الحمید،

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ و تذکرة الحفاظ ج ۲ و تہذیب ج ۶ و کتاب الانساب و بستان المحدثین

حفص بن غیاث، ابو اسامہ حماد بن سلمہ، خلف بن خلیفہ، سفیان بن عیینہ، ابوالاحوص سلام بن سلیم، ابو خالد الاحمر سلیمان بن حیان، شریک بن عبداللہ نخعی، عباد بن عوام، عبدالاعلیٰ بن عبدالاعلیٰ، عبداللہ بن ادریس، عبدالرحمن بن محمد محاربی، عبدالرحمن بن مہدی، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن نمیر، عمرو بن عبید، ابونعیم فضل بن دکین، محمد بن بشر عبدی، محمد بن حازم، محمد بن فضیل، ابومعاویہ مروان بن معاویہ، معتمر بن سلیمان، وکیع بن جراح، ہشیم بن بشیر، یحییٰ بن سعید قطان، یزید بن مقدام، یزید بن ہارون وغیرہ۔

تلامذہ نامور فقہا و محدثین میں امام احمد بن حنبل، ابوزرعہ، ابوحاتم اور بقی بن مخلد کے علاوہ صحاح ستہ کے مصنفین میں امام بخاری، مسلم اور ابن ماجہ کو براہِ راست اور امام نسائی کو بالواسطہ روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، دوسرے مشہور علماء میں ابراہیم بن اسحاق حربی، ابوبکر احمد بن ابی عاصم النبیل، جعفر فریابی، حسن بن علی معمری، زکریا ساجی، عباس بن محمد دوری، عبداللہ بن احمد بن حنبل، عبداللہ بن احمد بن ابو القاسم، عبداللہ بن محمد بغوی، عثمان بن خرزاذ، محمد بن ابراہیم مزلع، محمد بن اسحاق صاغانی، محمد بن سعد، محمد عبدوس بن کامل، محمد بن عبیداللہ منادی، محمد بن عثمان بن ابی شیبہ، محمد بن محمد باغندی، موسیٰ بن اسماعیل انصاری، ہیثم بن خلف دوری، یعقوب بن شیبہ اور یوسف بن یعقوب نیشاپوری وغیرہ۔

رحلت و سفر ان کے بعض مشائخ کے علاوہ اکثر کا وطن کوفہ اور واسط ہے، لیکن دوسرے مراکز حدیث کے محدثین سے بھی انہوں نے استفادہ کیا ہے، چنانچہ بغداد میں ان کے قیام اور درس و تدریس کی تصریح بہت سے مورخین نے کی ہے[1]۔

اعتراف کمال ابن ابی شیبہ کے معاصر علماء اور نامور محدثین کو ان کے علم و فضل اور فوقیت میں تبحر اور جامعیت کا اعتراف ہے، ابوعبید قاسم بن سلام فرماتے ہیں کہ علم حدیث چار آدمیوں پر ختم ہوگیا ابوبکر بن ابی شیبہ حسن ادا، خوش سلیقگی اور حفظ مذاکرہ میں، امام احمد فقہ و معرفتِ حدیث میں، یحییٰ بن معین جامعیت و کثرت روایت میں، اور علی بن مدینی حدیث کے مخارج و علل سے واقفیت میں یکتائے روزگار تھے، امام احمد کا ارشاد ہے کہ ابوبکر بن ابی شیبہ میرے نزدیک اپنے بھائی عثمان سے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ و تہذیب التہذیب ج ۶۔

افضل و برتر ہیں، آپ کے صاحبزادہ عبداللہ نے عرض کیا کہ ابن معین عثمان کو فائق سمجھتے ہیں۔ فرمایا لیکن میں ابوبکر ہی کو زیادہ پسند کرتا ہوں[1]، علامہ ذہبی نے عدیم النظیر، الامام، احد الاعلام اور حافظ ابن کثیر نے احد الاعلام، وائمۃ الاسلام وغیرہ القاب سے ان کا ذکر کیا ہے[2]۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ "وہ حدیث کے امام تھے"[3]

حفظ و ضبط ان کے حفظ و ضبط کا علما نے اعتراف کیا ہے، عمرو بن علی فلاس فرماتے ہیں کہ "میں نے ان سے بڑا حافظ حدیث نہیں دیکھا"، صالح بن محمد جزرہ کا بیان ہے کہ "مذاکرے کے وقت ابن ابی شیبہ سے بہتر یادداشت کسی کی نہیں تھی"، حافظ ابو زرعہ کہتے ہیں کہ ان سے بڑا حافظِ حدیث میں نے نہیں پایا۔ احمد بن حمید سے کوفہ کے سب سے بڑے حافظ حدیث کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ابوبکر بن ابی شیبہ، ابن حبان لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں منقطع روایتوں کے سب سے بڑے حافظ یہی تھے۔

ثقاہت امام احمد ان کو صدوق، عجلی، ابوحاتم، ابن خراش اور ابن قانع، ثقہ و ثابت اور خطیب و ابن حبان نے متقن کہا ہے، علامہ ابن ناصر الدین اور حافظ ذہبی نے الثقۃ النحریر لکھا ہے، ابن معین سے دریافت کیا گیا کہ کوفہ کے کس آدمی سے حدیث بیان کی جائے فرمایا، ابوشیبہ کے دونوں بیٹوں ابوبکر اور عثمان سے، ایک مرتبہ ابن معین سے ان کے شریک سے سماع کا حال دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ ہمارے نزدیک سچے ہیں، اگر وہ شریک کے بجائے کسی اور متقدم سے بھی سماع کا دعویٰ کرتے تو ہم اس کو بھی مان لیتے، میں نے خود ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا کہ آپ نے شریک سے کب سماع کیا ہے؟ فرمایا کہ چودہ سال کی عمر میں جب میرا حافظہ اس وقت سے زیادہ اچھا اور پختہ تھا[4]

وفات ابن ابی شیبہ نے تقریباً چوہتر سال کی عمر میں ۸ محرم الحرام ۲۳۵ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا[5]

تصنیفات تصنیفی حیثیت سے ابن ابی شیبہ باکمال مصنف تھے، ابو عبید کا بیان ہے کہ "احسنہم وضعا"

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۶ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [3] بستان المحدثین [4] بستان المحدثین

[5] تاریخ بغداد جلد ۱۰۔

لکتاب ابن شیبہؒ، مصنفین اور تذکرہ نگاروں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی متعدد تصنیفات تھیں لیکن وہ سب معدوم اور نایاب ہیں، ابن ندیم نے ان کی حسب ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

کتاب السنن فی الفقہ، کتاب التفسیر، کتاب التاریخ، کتاب الفتن، کتاب صفین، کتاب الجمل کتاب الفتوح، اور کتاب المسند[2]۔

لیکن عام مورخین ان کی چار کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، مسند، تفسیر، کتاب الاحکام اور مصنف آخری دونوں کتابوں کا ابن ندیم نے ذکر نہیں کیا ہے، اس طرح ابن ابی شیبہ کی معلوم کتابوں کی تعداد دس ہو جاتی ہے، مسند کے متعلق ملا چلپی نے لکھا ہے کہ "وہ ایک بڑی اور ضخیم کتاب ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ ابوبکر بن ابی شیبہ کی سب سے مشہور کتاب مصنف ہے، اس کی بدولت ان کو لازوال شہرت نصیب ہوئی، یہ حدیث کی اہم اور بلند پایہ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور، اہم، جامع اور مبسوط یہی کتاب ہے، مصنف عبدالرزاق اس کے مقابلہ میں قدیم ضرور ہے لیکن یہ اس سے زیادہ ضخیم اور جامع ہے[3]۔

ترتیب محدثین کے طریقہ کے مطابق اس کو سندوں کے ساتھ فقہی کتابوں کی طرح ابواب و کتب پر مرتب کیا گیا ہے، اس کی ابتدا کتاب الطہارہ سے ہوتی ہے، یہ کئی اجزا پر مشتمل ہے۔

اہمیت حافظ ابن کثیرؒ نے اس کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ "ابوبکر بن ابی شیبہ لاجواب اور عدیم النظیر مصنف کے مرتب ہیں، ان سے پہلے اور بعد کسی زمانہ میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، شاہ ولی اللہ دہلوی نے حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں اس کا شمار کیا ہے۔ حافظ ابن حزم اندلسی نے اس کو مؤطا سے بھی بالاتر بتایا ہے[5]۔ یہ رائے مبالغہ سے خالی نہیں، لیکن اس سے مصنف کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

خصوصیات اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اکثر مرویات صحاح ستہ کی کتابوں میں موجود ہیں، امام بخاری نے تیس اور امام مسلم نے ایک ہزار پانچ سو چالیس روایات کی تخریج کی ہے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [2] الفہرست [3] کشف الظنون ج ۲ [4] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ و حجۃ اللہ البالغہ [5] وتذکرہ ج ۳۔

سنن ابی داؤد میں بکثرت اور سنن ابن ماجہ میں غالباً سب سے زیادہ اسی سے حدیثیں لی گئی ہیں[۱]۔

(۲) احکام و مسائل کا اس سے زیادہ جامع اور مستند کوئی مجموعہ نہیں ہے[۲]۔ اس میں وہی روایتیں شامل کی گئی ہیں، جن سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔

(۳) نقل احادیث غیر جانبدارانہ ہے اہل حجاز اور اہل عراق سب کے مرویات بلا ترجیح و تنقید ذکر کئے گئے ہیں۔

(۴) اس میں مرفوع و متصل روایات کے ساتھ مرسل، منقطع، اور موقوف حدیثیں بھی ہیں اور صحابہ کے آثار، تابعین کے فتاوے اور فقہاء وغیرہ کے آراء و اقوال بھی بیان کئے گئے ہیں، اس سے ہر حدیث کے متعلق سلف کے تعامل اور ائمہ کے اتفاق و اختلاف کا پتہ چل جاتا ہے۔

مصنف کا ایک باب **ھذا ما خالف بہ ابو حنیفۃ الاثر الذی جاء عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم**" کے عنوان سے امام ابو حنیفہؒ کے رد میں بھی ہے، اس کے جواب میں زاہد الکوثری نے **النکت الطریفۃ فی التحدث عن ردود ابن ابی شیبۃ علی ابی حنیفۃ** کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، جو قاہرہ کے مطبع انوار سے ۱۳۶۵ھ میں شائع ہوا ہے اور ۲۷۰ صفحے پر مشتمل ہے لیکن علامہ کوثری نے اعتراف کیا ہے کہ "اس رد کے باوجود مصنف ابن ابی شیبہ کا اہل عراق پر بڑا احسان ہے، کیونکہ ان کے فقہی دلائل کے لئے سب سے زیادہ جامع اور مستند ماخذ یہی ہے[۳]۔"

مصنف کے قلمی نسخے جرمنی، مدینہ منورہ کے مکتبہ محمودیہ اور خدیویہ مصر وغیرہ میں موجود ہیں[۴]۔ ہندوستان میں، مکتبہ سندیہ، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ مولانا عبدالحی لکھنوی اور بعض دیگر کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں[۵]۔ اس کے بعض اجزا ملتان سے شائع ہوتے ہیں، چوتھا جز دو سو چار صفحات پر مشتمل ہے اس میں کتاب الزکوٰۃ، کتاب الجنائز، کتاب الایمان، والنذور و الکفارات شامل ہیں۔

---

[۱] تہذیب جلد ۲ [۲] امام ابن ماجہ اور علم حدیث [۳] النکت الطریفۃ [۴] مقدمہ تحفۃ الاحوذی بحوالہ بالا الحفاظ فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر [۵] تذکرۃ النوادر بحوالہ مکتوبات شاہ احسان اللہ سندی نمبر ۔ فہرست کتب خانہ آصفیہ

امام اسحاق بن راہویہ

(متوفی ۲۳۸ھ)

نام ونسب اسحاق نام، ابو یعقوب کنیت اور ابن راہویہ لقب تھا، شجرۂ نسب یہ ہے: اسحاق بن ابراہیم بن مخلد بن ابراہیم ابن مطر بن عبد اللہ بن غالب بن عبد الوارث بن عبید اللہ بن عطیہ بن مرہ بن کعب بن ہمام بن اسد بن مرہ بن عمرو بن حنظلہ بن مالک بن زید بن مناۃ بن تمیم۔

اسحاق کے والد ابراہیم بطن مادری میں تھے کہ ان کی والدہ نے مکہ معظمہ کا سفر کیا، اسی سفر میں کسی مقام پر ان کی ولادت ہوئی۔ اس لئے اہل مرو انہیں راہوی یا راہویہ یعنی راستہ والا کہتے تھے، اسحاق کا بیان ہے کہ میرے والد کو جب لوگ راہویہ کہتے تھے تو ان کو ناگوار ہوتا تھا، لیکن مجھے ابن راہویہ کہا جاتا ہے تو کوئی ناگواری نہیں ہوتی[1]۔

ولادت ابن راہویہ بروایت صحیح ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے ۱۶۶ھ اور ۱۶۳ھ کی روایتیں بھی کی گئی ہیں[2]۔

خاندان ووطن ان کا وطن خراسان کا مشہور شہر مرو تھا، لیکن انہوں نے نیشاپور میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی[3] اس لئے مروزی اور نیشاپوری کہلاتے تھے، تمیمی اور حنظلی کی نسبتوں سے ان کا عربی النسل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

---

[1] تاریخ بغداد ج۶، تاریخ ابن عساکر ج۲، طبقات الشافعیہ ج۱، تاریخ ابن خلکان ج۱ [2] تہذیب ج۱ [3] ایضاً، الانتقاء لابن عبد البر۔

Marfat.com

اساتذہ | ان کے مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں :-

ابواسامہ، ابوبکر بن عیاش، ابومعاویہ، اسباط بن محمد، اسماعیل بن علیہ، بشر بن مفضل، بقیہ بن ولید، جریر بن عبدالحمید رازی، حاتم بن اسماعیل، حفص بن غیاث، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن نافع عبدی، سوید بن عبدالعزیز شعیب بن اسحاق، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبدالرزاق بن ہمام، عبدالعزیز دراوردی، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن وہب، عبدہ بن سلیمان، عبدالوہاب ثقفی، عتاب بن بشیر جزری، عمر بن ہارون، عیسیٰ بن یونس، غندر فضیل بن عیاض، محمد بن بکر برسانی، محمد بن سلمہ حرانی، معاذ بن ہشام، معتمر بن سلیمان، نضر بن شمیل، وکیع بن جراح، ولید بن مسلم اور یحییٰ بن واضح وغیرہ،

تلامذہ | ابن راہویہ کے تلامذہ کے مختلف طبقے ہیں۔ ان کے بعض اساتذہ بقیہ بن ولید، محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن آدم وغیرہ اور معاصرین میں احمد بن حنبل، اسحاق بن منصور کوسج، محمد بن رافع اور یحییٰ ابن معین اور عزیزوں میں فرزند محمد نے بھی استفادہ کیا ہے، اور صحاح ستہ کے مصنفین میں امام ابن ماجہ کے علاوہ سب کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے، بعض اور ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے نام حسب ذیل ہیں۔

ابراہیم بن ابی طالب، احمد بن سلمہ، اسحاق بن ابراہیم نیشاپوری، جعفر فریابی، حسن بن سفیان، ذکریا سنجری، ابوالعباس سراج، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، عبداللہ بن محمد بن شیرویہ، محمد بن افلح، محمد بن نصر مروزی اور موسیٰ بن ہارون وغیرہ[1]

طلب حدیث کے لئے سفر | علامہ ابن عساکر اور حافظ ابن حجر نے آپ کے کثرت سفر (طاف البلاد لجمع الحدیث) حدیث کی طلب و تحصیل کے لئے مختلف شہروں میں پھرے، کہہ کر ذکر کیا ہے اور خطیب نے لکھا ہے کہ حجاز، عراق، یمن اور شام وغیرہ مراکز حدیث کا سفر کیا، اور بغداد کئی بار تشریف لائے، عراق کا سفر تئیس سال کی عمر میں ۱۸۴ھ میں کیا تھا۔[2]

علم و فضل کا اعتراف | اسحاق بن راہویہ بلند پایہ علمائے اسلام میں تھے، معاصرین علماء اور

[1] تاریخ بغداد ج ۶، ابن عساکر ج ۲ و طبقات الشافعیہ ج ۱ و تہذیب ج ۱۔ [2] تاریخ ابن عساکر ج ۲ و تہذیب ج ۱ و تاریخ بغداد ج ۶ و طبقات الشافعیہ ج ۱۔

اساطین فن نے ان کے فضل وکمال اور علمی عظمت وبلند پائیگی کا اعتراف کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل جو ان کے بڑے مداح اور قدر دان تھے فرماتے ہیں "خراسان وعراق میں ان کا کوئی ہمسر نہیں، بغداد کے اس پل کو ان سے زیادہ عظیم وبرتر کسی آدمی نے عبور نہیں کیا، گو بعض مسائل میں ہمارا اور ان کا اختلاف ہے، اور اہلِ علم کے درمیان تو اختلافات ہوا ہی کرتے ہیں" ایک مرتبہ اسحاق کے صاحبزادے محمد ان کی خدمت میں حصولِ علم کے لئے حاضر ہوئے تو ارشاد ہوا کہ تمہارا اپنے والد سے وابستہ رہنا زیادہ مفید اور بہتر ہے، ان سے زیادہ پُرعظمت آدمی تمہاری آنکھوں نے نہ دیکھا ہوگا، امام احمد ان کی عظمت کے اس حد تک قائل تھے کہ اگر ان کے سامنے کوئی انہیں ابن راہویہ کہتا تو ناگواری کا اظہار کرتے اور فرماتے کہ اسحاق بن ابراہیم حنظلی کہا کرو!

محمد بن اسلم کہتے ہیں کہ اگر امام ثوری زندہ ہوتے تو اسحاق کے علم وفضل سے بے نیاز نہیں رہتے احمد بن سعید رُباطی کا قول ہے کہ اور ابن عیینہ اور حماد بھی ان کے محتاج ہوتے، محمد بن یحییٰ صفار نے سُنا تو کہا کہ اگر حسن بصری زندہ ہوتے تو اکثر چیزوں میں ان کو اسحاق کی جانب رجوع کرنا پڑتا، ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ اگر وہ تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو وہ لوگ بھی ان کے علم وفضل کے معترف ہوتے، نعیم بن حماد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی خراسانی اسحاق بن راہویہ کے علم وکمال میں کلام یا نکتہ چینی کرے تو اسے متہم فی الدین سمجھو! سعید بن ذوئیب فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر اسحاق کے مانند میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا، ابو یحییٰ شعرانی کا بیان ہے کہ علمی مذاکرہ کے وقت وہ یکتا اور یگانہ معلوم ہوتے تھے، یحییٰ بن یحییٰ کا بیان ہے کہ خراسان میں علم کے دو خزانے تھے، ایک محمد بن سلام بیکندی کے پاس، دوسرا اسحاق بن راہویہ کے پاس ہے، حسین بن منصور بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں، یحییٰ اور اسحاق کے ہمراہ ایک شخص کی عیادت کرنے گیا۔ جب ہم لوگ ان کے گھر کے پاس پہنچے تو اسحاق پیچھے ہوگئے اور یحییٰ سے کہا پہلے آپ داخل ہوں کیونکہ آپ ہم سے عمر میں بڑے ہیں، انہوں نے کہا بے شک میں عمر میں بڑا ہوں لیکن علم وفضل میں آپ فائق ہیں اس لئے پہلے آپ ہی چلیں۔ حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں وہ "جلیل القدر علمائے اسلام اور نامور محدثین حفاظ عالم میں سے تھے۔

شرفِ امامت | اسحاق بن راہویہ کا شمار ان آئمہ میں ہوتا ہے جو صاحب مذہب فقیہ و مجتہد تھے مگر اب ان کا فقہی اور اجتہادی مذہب مٹ چکا ہے لیکن ایک زمانہ میں یہ بھی مسلمانوں کا معمول بہ مسلک رہا ہے۔ امام احمد اور امام نسائی ان کے متعلق فرماتے ہیں۔ امام من ائمۃ المسلمین یعنی مسلمانوں کے ایک امام یہ بھی ہیں، ایک مرتبہ امام احمد سے ان کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ مسلمانوں کے امام ہیں، ہمارے نزدیک شافعی، حمیدی اور اسحاق تینوں امام ہیں۔ محمد بن یحییٰ ذہلی کا بیان ہے کہ دن بغداد کے مقام رصافہ میں ائمہ محدثین امام احمد اور یحییٰ بن معین وغیرہ جمع تھے لیکن مجلس صدارت پر اسحاق بن راہویہ رونق افروز تھے اور وہی اس مجلس کے خطیب بھی تھے، محمد بن نصر فرماتے ہیں وہ ہمارے اور ہمارے مشائخ کے شیخ و بزرگ تھے، فضل شعرانی کہتے ہیں وہ بلاشک و شبہ خراسان کے امام تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں احد الاعلام وعلماء الاسلام، علامہ ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں۔

احد ائمۃ الدین واعلام المسلمین وھداۃ المومنین

دوسرے مورخین نے بھی ان کو احد ائمۃ الاسلام احد ائمۃ المسلمین وعلماء من اعلام الدین امام مشرق اور عالم نیشاپور وغیرہ لکھا ہے۔[1]

علم حدیث میں کمال و امتیاز | علم حدیث سے ان کو خاص تعلق تھا اور وہ اکابر محدثین اور نامور حفاظ میں شمار کئے جاتے ہیں خلیلی کا بیان ہے کہ "وہ شہنشاہ حدیث تھے" حدیثوں کی نشر و اشاعت، درس و مذاکرہ، حفظ و ضبط اور حزم و احتیاط کے لئے ان کی ذات بڑی اہمیت اور شہرت رکھتی ہے، ذیل میں ان کی ان خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حفظ و ضبط | اسحاق بن راہویہ کا حافظہ غیر معمولی اور یادداشت حیرت انگیز تھی۔ ابن حبان، خطیب بغدادی اور ابن عساکر وغیرہ نے حافظہ میں ان کی ہمایت کا اعتراف کیا ہے، علامہ ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اگر اسحاق تابعین کے عہد میں ہوتے تو وہ لوگ بھی ان کے حافظہ کے معترف ہوتے، قتیبہ بن سعید کا بیان ہے کہ خراسان کے نامور حفاظ میں اسحاق بن راہویہ اور ان کے بعد امام دارمی اور امام بخاری تھے

---

[1] حوالہ مذکور باختلاف صفحات و تاریخ ابن خلکان ج ۱، والبدایہ ج ۱۰، میزان الاعتدال ج ۱، والعبر ج ۱، ومراۃ الجنان ج ۲، وشذرات الذہب ج ۲

ابویحیی شعرانی کہتے ہیں کہ میں نے ان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی وہ ہمیشہ یادداشت سے حدیثیں بیان کرتے تھے۔ ان کا خود بیان ہے کہ میں نے کبھی کوئی چیز قلمبند نہیں کی، جب بھی مجھ سے کوئی حدیث بیان کی گئی میں نے اسے یاد کر لیا، میں نے کسی محدث سے کوئی حدیث کبھی دوبارہ بیان کرنے کے لئے نہیں کہا، یہ کہنے کے بعد انہوں نے پوچھا کیا تم لوگوں کو اس پر تعجب ہے؟ لوگوں نے کہا جی ہاں! یہ حیرت کی بات ہے۔ انہوں نے کہا جس چیز کو میں ایک مرتبہ سن لیتا ہوں وہ مجھے یاد ہو جاتی ہے، ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں ہر وقت میری نگاہ کے سامنے رہتی ہیں اور میں ان کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ وہ کتاب میں کس جگہ ہیں؟ ابوداؤد خفاف کی روایت کے مطابق انہوں نے ایک لاکھ حدیثوں کے متعلق کہا کہ وہ میری نظر کے سامنے ہیں، میں ان کا مذاکرہ کر سکتا ہوں۔ ایک دفعہ انہوں نے گیارہ ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں اور پھر دوبارہ کتاب سے ان کی قرأت کی تو ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں نکلی۔ احمد بن سلمہ کہتے ہیں کہ انہوں نے پوری مسند کا زبانی املاء کرایا۔ ابوحاتم رازی نے ابوزرعہ سے اسحاق بن راہویہ کے حفظِ اسانید و متون کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں دیکھا گیا۔ احمد بن سلمہ نے ابوحاتم کو بتایا کہ انہوں نے یادداشت سے اپنی تفسیر کا املا کرایا ہے تو ابوحاتم نے کہا یہ اور زیادہ حیرت انگیز بات ہے کیونکہ مسند حدیثوں کا ضبط، تفسیر کے اسناد و الفاظ کے ضبط کے مقابلے میں آسان ہے، امیر خراسان عبداللہ بن طاہر نے ایک مرتبہ ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ اس کے متعلق سنت یہ ہے اور یہی اہلِ سنت کا قول ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کی رائے اس سے مختلف ہے، ابراہیم بن ابی صالح وہاں موجود تھے بولے امیر المومنین اسحاق غلط کہتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ کا مسلک اس سے مختلف نہیں ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھ کو یہ مسئلہ یاد ہے فلاں کتاب کا فلاں جزء لائیے، کتاب لائی گئی اور ابن طاہر نے اس کو الٹنا شروع کیا تو اسحاق نے کہا امیر المومنین گیارہویں ورق کی نویں سطر میں ملاحظ فرمائیے چنانچہ اس کے اندر وہ مسئلہ اسحاق کے بیان کے عین مطابق نکلا۔ امیر نے کہا ہم کو معلوم تھا کہ آپ کو مسائل ازبر ہیں، لیکن حافظہ کا یہ مشاہدہ ہمارے لئے یقیناً حیرت انگیز ہے[1]۔

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۶، تاریخ ابن عساکر ج ۲، طبقات الشافعیہ ج ۱، تہذیب التہذیب ج ۱، میزان الاعتدال ج ۱، ابن خلکان ج ۱۔

Marfat.com

صدق وثقاہت اس غیر معمولی حفظ کے ساتھ اسی درجہ کا صدق اور ثقاہت بھی تھی۔ ابوحاتم فرماتے ہیں کہ کثیر الحفظ ہونے کے باوجود اسحاق کا ضبط واتقان اور غلطیوں سے محفوظ ومصئون رہنا حیرت انگیز ہے، خطیب بغدادی وغیرہ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ وثقاہت دونوں کے جامع تھے، ذہبی نے ان کو ثقہ وحجت بتایا ہے اور ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے۔ امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ ومامون تھے، امام دارمی کا بیان ہے کہ اسحاق اپنے صدق کی وجہ سے اہل مغرب ومشرق کے سردار بن گئے تھے۔ امام احمد کو ان کے صدق وثقاہت پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک دفعہ انہوں نے ان سے کوئی حدیث پوچھی، جب اسحاق نے اسے بیان کیا تو ایک شخص نے اعتراضاً کہا کہ وکیع نے یہی روایت اس سے مختلف طریقہ پر بیان کی ہے، امام احمد نے برافروختہ ہوکر کہا کہ خاموش رہو۔ جب ابو یعقوب جو امیر المومنین فی الحدیث ہیں کوئی روایت بیان کریں تو اسے بلا تامل قبول کرلینا چاہیئے۔[1]

حزم واحتیاط اس حفظ حدیث کے ساتھ اتنے محتاط تھے کہ بچپن میں انہوں نے عبداللہ بن مبارک سے حدیثیں سنی تھیں مگر ان کو روایت نہیں کرتے تھے، کہ احتیاط کے خلاف ہے۔[2]

حفاظت واشاعت حدیث ان کی ذات سے حدیث نبوی کی بڑی اشاعت اور سنت نبوی کا بڑا احیا ہوا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اسحاق بن راہویہ نے سنتوں کا دفاع اور مخالفین حدیث کا قلع قمع کیا۔ وہب بن جریر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ اسحاق، صدقہ اور یعمر کو ان کی اسلامی خدمات کا صلہ عطا فرمائے۔ ان لوگوں نے مشرق کی سرزمین میں حدیثوں کی اشاعت اور سنت نبوی کا احیا کیا۔

فقہ واجتہاد حدیث کی طرح فقہ واجتہاد کے بھی ماہر تھے، ابو اسحاق شیرازی، حاکم صاحب مستدرک اور خطیب نے ان کو فقہ واجتہاد میں جامع اور اکابر فقہا میں شمار کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے **احد المجتہدین من الائمہ** اور ابن حبان نے نامور وممتاز فقہاء میں ان کا شمار کیا ہے ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل سے ان کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ اسحاق کے مانند کون ہوسکتا ہے؟ ایسے ہی لوگوں سے مسائل دریافت کرنا چاہیئے۔ ہم لوگ بھی ان سے فتوے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶، تاریخ ابن عساکر ج ۲، طبقات الشافعیہ ج ۱، تہذیب ج ۱۔ [2] تاریخ بغداد ج ۶، تاریخ ابن عساکر ج ۲۔

پوچھتے ہیں۔[1]

غرض فقہی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا اور وہ مسلمہ امام اور صاحب مذہب فقہاء میں ہیں اور متعدد علماء نے ان کا محدث کے بجائے فقیہ و مجتہد ہی کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ کتب خلاف میں ان سے اقوال و فتاوی اور فقہی و اجتہادی تخریجات موجود ہیں۔ ابن رشد مالکی نے اپنی کتاب بدایۃ المجتہد میں اکثر امام احمد کے ساتھ اسحاق کے اقوال بھی نقل کئے ہیں۔ ایک زمانہ تک مسلمانوں میں اسحاق کا مذہب رائج رہا۔

ابن راہویہ کے فقہی اصول اور بنیادیں فقہ و حدیث میں امام احمد بن حنبل اور اسحاق کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے دونوں بزرگوں کی فقہ و اجتہاد کا دارومدار حدیث پر ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے رسالۂ الانصاف میں لکھا ہے کہ ان کے مسائل کی بنیاد احادیث اور اقوال صحابہ پر زیادہ ہے۔ ابو حاتم سے پوچھا گیا کہ آپ کا میلان دونوں کی جانب زیادہ ہے، فرمایا مجھے ان سے زیادہ پرعظمت شخص نظر نہیں آتا، ان دونوں نے احادیث قلمبند کیں۔ ان کا مذاکرہ کیا، اور ان پر تصنیفات کیں۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں و فرع علی السنن یعنی ان کی فقہی تفریعات سنن و احادیث پر مبنی ہوتی ہیں، لیکن امام احمد کے برخلاف ان کا میلان امام مالک کی طرف زیادہ ہے، جن کا اصل ماخذ اہل مدینہ کے اقوال ہوتے ہیں، اور امام احمد زیادہ تر آثار و روایات پر اعتماد کرتے ہیں۔

فقہ و اجتہاد میں ان کے کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے امام شافعی جیسے عظیم المرتبت امام و مجتہد سے دو مرتبہ مناظرہ کیا اور صالح بن احمد روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مناظرہ کے موقع پر میرے والد بھی موجود تھے، ان کا بیان ہے کہ اسحاق امام شافعی کے مقابلہ میں غالب نظر آرہے تھے۔[2]

پہلا مناظرہ پہلی مرتبہ جب وہ امام احمد کے اصرار پر امام شافعی سے ملے تو انہوں نے مکہ کے مکانات کو کرایہ پر دیئے جانے کے متعلق ان سے مناظرہ کیا اور اسحاق کرایہ پر دینا جائز نہیں سمجھتے تھے اور امام شافعی جائز سمجھتے تھے، ان کا استدلال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶، تاریخ ابن عساکر ج ۲، البدایہ والنہایہ ج ۱۰، [2] تاریخ ابن عساکر ج ۲ و تہذیب التہذیب ج ۱، تاریخ بغداد ج ۶۔

للفقراء المهاجرین الذین اخرجوا من دیارھم ۔ (حشر۔ ع ۱)
واسطے ان مفلسوں وطن چھوڑنے والوں کے جو نکالے ہوئے آئے ہیں اپنے گھروں سے

من دیار کی نسبت مالکوں کی طرف کی گئی ہے یا غیر مالکوں کی طرف۔ فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من اغلق بابہ فھو امن ومن دخل دار ابی سفیان فھو امن ۔
جس نے اپنا دروازہ بند کر لیا اور جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو گیا اس کو امان ہے۔

یہاں دار و باب کی نسبت جس کی جانب کی گئی ہے کیا وہ اس کا مالک تھا یا نہیں؟ حضرت عمرؓ نے قید خانہ کے لئے جو مکان خریدا تھا۔ وہ اس کے مالک یا غیر مالک سے خریدا تھا؟ اسی طرح رسول کریمؐ نے فرمایا

وھل ترک لنا عقیل من دار ۔
یعنی کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی گھر چھوڑا ہے

اسحاق کی دلیل یہ بھی کہ ان کی رائے کی تائید بعض تابعین سے منقول ہے، امام شافعی کا جواب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کسی شخص کی رائے حجت نہیں ہو سکتی۔ اسحاق کی دوسری دلیل یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ" سواء العاکف فیہ والباد " یعنی مسجد حرام میں مکہ کے باشندے اور باہر کے لوگوں دونوں کا برابر حق ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ حکم مسجد حرام کے ساتھ خاص تھا، امام شافعیؒ کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مکہ کی زمین لوگوں کے لئے مباح ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یترک لنا عقیل سکنا کے بجائے یہ فرماتے کہ جو جگہ ہم کو مل جائے یا جس شخص کے گھر میں بھی ہم لوگ اتر پڑیں وہ گھر اور جگہ ہمارے لئے مباح ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ کی زمین لوگوں کی ملکیت بن سکتی ہے اس لئے اس کو کرایہ پر بھی دیا جا سکتا ہے۔ آخر میں اسحاق کو امام شافعی کی اصابت رائے کا اعتراف کرنا پڑا اور وہ امام شافعیؒ کی عظمت اور علم وفضل کے معترف ہو گئے اور جب کبھی ان کا ذکر کرتے تو تعریف و توصیف کرتے اور اپنی بات پر نادم بھی ہوتے۔[1]

دوسرا مناظرہ | دوسرے مناظرے میں امام احمد بھی شریک تھے، اور غالباً اسی کے متعلق ان سے روایت ہے کہ اس میں امام شافعیؒ کے مقابلہ میں اسحاق کی رائے وزنی معلوم ہوتی تھی چنانچہ وہ اس مسئلہ

[1] طبقات الشافعیہ ۱۵۔

میں اسحاق کے ہمنوا بھی ہوگئے تھے، اس مناظرہ کا موضوع بحث مردار کی کھال تھی، امام کے نزدیک وہ دباغت کے بعد پاک ہوجاتی ہے، اسحاق نے دلیل طلب کی تو انہوں نے حضرت میمونہ کی یہ حدیث بیان کی۔ ان النبی مر بشاة میتة فقال هلا انتفعتم بجلدها (آپ نے ایک مردہ بکری دیکھ کر فرمایا کہ کیوں نہیں تم لوگوں نے اس کی کھال سے فائدہ اٹھایا) اسحاق نے اس کے جواب میں ابن حکیم کی یہ حدیث بیان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ لکھا کہ لا تنتفعوا من المیتة باهاب ولا عصب یعنی مردار کے غیر مدبوغ اور مدبوغ کسی قسم کے چمڑے سے انتفاع نہ کرو۔ اور یہ تحریر آپ کی وفات سے صرف ایک ماہ پہلے کی ہے اس لئے میمونہ کی روایت اس سے منسوخ ہوجاتی ہے، امام شافعیؒ نے فرمایا کہ میں تو سماعی حدیث بیان کرتا ہوں اور آپ تحریر کا تذکرہ کرتے ہیں، اسحاق نے جواب دیا کہ رسول اللہ نے قیصر وکسریٰ کے نام جو خطوط لکھے تھے وہ تحریری تھے اور اللہ کے یہاں ان کے خلاف حجت ہوں گے، اس جواب پر امام شافعیؒ خاموش ہوگئے۔

مذہب و مسلک اسحاق بن راہویہ خود صاحب مذہب مجتہد تھے، اس لئے چاروں مشہور اجتہادی مذاہب میں وہ کسی مذہب سے وابستہ نہ تھے البتہ امام دارقطنی نے ان کو امام شافعیؒ کے راویوں میں اور امام بیہقی نے ان کے اصحاب میں ذکر کیا ہے، اسی طرح ابن خلکان نے لکھا ہے کہ مناظرہ کے بعد جب ان کو امام شافعیؒ کے علم وفضل کا اندازہ ہوا تو وہ ان کے اصحاب میں داخل ہوگئے اور ان کی کتابوں کو جمع کر کے نقل کیا[1] لیکن ان آراء و اقوال سے ان کا شافعی المذہب ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف امام شافعیؒ سے تلمذ اور تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں "امام شافعیؒ سے ان کا صرف اس حد تک تعلق ثابت ہے کہ اسحاق نے ان کی کتابیں لکھیں اور ان کی صحبت میں رہے، لیکن امام ابو ثور کی طرح ان کے بھی مختارات واجتہادات ہیں، البتہ ان کا رجحان امام احمد کی طرح حدیث و اتباع سلف کی جانب زیادہ تھا۔[2]

عقیدہ و کلام اسحاق بن راہویہ اتباع سنت اور طریقہ سلف کی پیروی میں نہایت متشدد تھے اس لئے کلام وعقائد کے غیر ضروری مسائل میں بحث وتدقیق اور غور وخوض ناپسند کرتے تھے۔ ان کے زمانہ میں خلق قرآن کا معرکۃ الآراء مسئلہ پیش آیا، گو انہوں نے امام احمد کی طرح اس میں اولوالعزمی اور ثابت قدمی

---

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۱۔ [2] الانتقاء۔

نہیں دکھائی مگر وہ بھی قرآن کو خدا کا کلام اور غیر مخلوق سمجھتے تھے، احمد بن سعید رباطی کا شعر ہے۔

لم یجعل القرآن خلقا کما　　　قد قالہ زندیق فساق[1]

ترجمہ:۔ اسحاق بن راہویہ نے فاسق اور زندیق شخص کی طرح قرآن کو خدا کی مخلوق قرار نہیں دیا۔

زہد و اتقا امام ابن راہویہ کے زہد و اتقا کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ وہ حدیث و فقہ اور حفظ و صدق کی طرح ورع و تقویٰ کے بھی جامع تھے محمد بن اسلم طوسی نے ان کی وفات کے وقت فرمایا "میں نے ان سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا) یعنی اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں[2]۔

وفات مشہور روایت کے مطابق انہوں نے ستتر سال کی عمر میں بروز یک شنبہ ۱۴ یا ۱۵ شعبان ۲۳۸ھ کو انتقال کیا، ۲۳۷ھ بھی روایت کی گئی ہے۔ ایک شاعر کے مرثیہ کا شعر ہے۔

یا ھدۃ ماھدت لیلۃ الاحد　　　فی نصف شعبان لاتنسی مدی الابد

(ترجمہ) جس سانحہ عظیم سے ہم لوگ اتوار کی رات میں ۱۵ شعبان کو دوچار ہوئے اس کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

آپ کی قبر زیارت گاہ خلائق ہے۔ بعض بزرگوں نے آپ کی بخشش و مغفرت کے خواب بھی دیکھے[3]

اولاد آپ کی اولاد میں تین صاحبزادوں کا نام ضمناً ملتا ہے، ابوالحسن علی (۲) محمد (۳) یعقوب[4]۔

تصنیفات علمائے طبقات و تراجم نے ان کو صاحب تصانیف کثیرہ لکھا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب ضائع ہوگئیں جن تصنیفات کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) **کتاب السنن فی الفقہ**[5]۔ اس کے نام سے موضوع ظاہر ہے۔

(۲) **کتاب التفسیر**۔ علامہ سیوطی نے عہد تابعین کے بعد کی جن تفسیروں کو اہم اور اقوال صحابہ و تابعین کی جامع قرار دیا ہے۔ ان میں سفیان بن عیینہ اور وکیع بن جراح وغیرہ کی تفسیروں کے ساتھ اس

---

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۲۔ طبقات الشافعیہ ج ۱ [2] تاریخ بغداد ج ۶ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ [3] تاریخ بغداد ج ۶ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ [4] تاریخ بغداد ج ۶ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ و طبقات الشافعیہ ج ۱ [5] الفہرست

کا بھی ذکر کیا ہے[1]۔ اس کو وہ خود با قاعدہ مرتب ومکمل بھی کر چکے تھے اور اس کا املار بھی کرایا تھا۔

(۳) **مسند**۔ یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف اور چھ جلدوں پر مشتمل ہے[2]۔ حاکم نیشا پوری نے دوسرے دور کی مسانید میں امام احمد کی مسند کے ساتھ اس کا نام بھی گنایا ہے[3]۔ اس کی ترتیب وتکمیل سے بھی وہ اپنی زندگی میں فارغ ہو چکے تھے اور اپنے شاگردوں کو زبانی اور پڑھ کر اس کا املار بھی کرایا تھا۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں۔

واسحاق یخرج امثل ماورد عن ذالك الصحابي فیما ذکرہ الرازی[4]	ابوزرعہ رازی کا بیان ہے کہ اسحاق ان ہی روایتوں کی تخریج کرتے تھے جو اس صحابی کی سب سے بہتر اور اچھی روایت ہوتی تھی۔

اس مسند کا ایک قلمی نسخہ علامہ سیوطی کے قلم کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ علامہ ذہبی نے اس کے رجال کے نقد میں ایک مستقل کتاب لکھی تھی۔ اس کو بھی سیوطی نے اس نسخہ کے حاشیے میں درج کیا ہے[5]۔

---

[1] الاتقان ج ۲ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۱ [3] المدخل فی اصول الحدیث [4] تدریب الراوی [5] مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔

امام احمد بن حنبلؒ

متوفی ۲۴۱ھ

نام ونسب احمد نام، ابو عبداللہ کنیت، شیخ الاسلام اور امام السنۃ القاب، شیبانی، ذہلی، بصری، مروزی اور بغدادی نسبتیں ہیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال بن اسد بن ادریس بن عبداللہ بن حیان بن عبداللہ بن انس بن عوف بن قاسط بن مازن بن شیبان۔

خاندان امام احمد خالص عربی النسل تھے۔ ان کا خاندانی سلسلہ بنی شیبان سے جو قبیلہ عدنان کی شاخ ہے ملتا ہے، یہ خاندان اپنی شجاعت، دلیری اور غیرت وحمیت کے لئے ہمیشہ سے مشہور تھا، آپ کے دادا حنبل امویوں کے عہد میں سرخس کے گورنر اور والد محمد ایک بہادر سپاہی تھے جن کا تیس سال کی عمر ہی میں جبکہ امام احمد صرف تین سال کے تھے انتقال ہو گیا، آپ کی والدہ ماجدہ نے پرورش وپرداخت کی۔

دنیوی وجاہت کی طرح علمی حیثیت سے بھی یہ خاندان بہت ممتاز تھا اور اس میں متعدد علماء، فضلاء، مقررین، شعراء اور ماہرین انساب گزرے ہیں[1]۔

ولادت امام احمد ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ بعض مورخین نے تصریح کی ہے کہ ربیع الاول کا مہینہ تھا[2]۔

مقام پیدائش امام صاحب شکم مادر ہی میں تھے کہ ان کی والدہ مرو سے بغداد تشریف لے آئیں۔ یہیں امام صاحب کی ولادت ہوئی، ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ مرو میں پیدا ہوئے تھے اور شیرخوارگی کے زمانے میں بغداد آئے[3]۔

---

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۲، تاریخ بغداد جلد ۴ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۷ [3] تاریخ ابن خلکان جلد ۱

وطن | آپ کا خاندان ایک عرصہ تک بصرہ میں آباد رہا، آپ کے دادا خراسان تشریف لائے یہاں روز اور مروشاہجہان نام کے دو شہر قریب ہی قریب آباد تھے، امام صاحب کا تعلق دوسرے مرو سے تھا جو ہر زمانہ میں اکابر علماء و فضلاء کا گہوارہ رہا ہے۔[1] لیکن امام صاحب کی نشو و نما بغداد میں ہوئی اور یہیں آپ کی عمر کا اکثر حصہ بسر ہوا۔ اس لئے اسی کو آپ کا اصلی وطن سمجھا جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم | امام صاحب کی تعلیم کا سلسلہ بچپن ہی میں شروع ہو گیا تھا، چار سال کی عمر میں انہوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ سات سال کی عمر میں حدیث پڑھنا شروع کر دی اور پندرہ سولہ سال کے سن میں اس کی باقاعدہ طلب و تکمیل میں مصروف ہو گئے۔

رحلت و سفر | امام صاحب عرصہ تک بغداد ہی میں رہ کر وہاں کے مشائخ سے سماع کرتے رہے اس کے بعد انہوں نے دوسرے مشہور مراکز حدیث کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ وغیرہ کا رخ کیا۔[2]

شیوخ و اساتذہ | امام احمد نے آنکھیں کھولیں تو بغداد علماء و فضلا کا مرکز اور دینی علوم کا گہوارہ بنا ہوا تھا، اس لئے شروع میں وہ یہیں کے مشائخ اکابر کے دامن فیض سے وابستہ رہے، بغداد میں ان کی نظر سب سے پہلے مشہور محدث حافظ ہشیم بن بشیر واسطی (م ۱۸۳ھ) پر پڑی جو حضرت عبداللہ ابن عباس و ابن عمر (رضی اللہ عنہما) کی مرویات کے متبحر عالم تھے۔ چار سال تک اسی خرمن علم کی خوشہ چینی کرتے رہے، جب یہ آفتاب غروب ہو گیا تو دوسرے اساتذۂ فن کی جانب متوجہ ہوئے، بچپن میں امام ابو یوسف کے درس میں بھی شریک ہوئے تھے، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن داؤد طیالسی، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن نمیر، وکیع بن جراح اور یحییٰ بن سعید وغیرہ جیسے اکابر محدثین اور ائمہ وقت سے بھی ان کو استفادہ کا موقع ملا۔[3] امام احمد کے اساتذہ میں سب سے زیادہ ممتاز اور باکمال شخصیت امام شافعیؒ کی ہے، ان سے ان کے بڑے مراسم اور گوناگوں تعلقات تھے فقہ کے علاوہ حدیث و انساب کا علم بھی ان سے حاصل کیا تھا، امام شافعیؒ جب تک بغداد میں رہے

---

[1] معجم البلدان ج ۸ [2] تاریخ بغداد ج ۴ و تہذیب الاسماء نووی ج ۱ [3] البدایہ والنہایہ ج ۱۰۔

وہ ان کے حلقۂ درس میں وابستہ رہے، جب مصر تشریف لے گئے تو امام احمد نے بھی وہاں جانا چاہا مگر عسرت و ناداری کی بنا پر اس کا موقع نہیں ملا، امام احمد کو امام شافعیؒ کی ذات سے بڑی عقیدت اور شیفتگی تھی اور وہ ان کا ہمیشہ بڑا احترام کرتے تھے، امام شافعیؒ سوار ہوتے تو یہ ان کے پیچھے پیچھے پیدل ان سے سوالات کرتے جاتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ میں نے تیس سال سے کوئی ایسی نماز نہیں پڑھی جس میں امام شافعیؒ کے لئے دعا نہ کی ہو[1]۔ شفیق استاد کو بھی اپنے لائق شاگرد سے بڑی محبت اور ان کے علم و فضل اور دیانت و تقویٰ پر بڑا اعتماد تھا۔ ان سے روایت بھی کرتے تھے۔ امام احمد کا خود بھی بیان ہے کہ امام شافعیؒ نے جتنا استفادہ ہم سے کیا اتنا ہم ان سے نہیں کر سکے، عبداللہ بن احمد کا بیان ہے کہ امام شافعیؒ کی کتاب میں حدثنی الثقہ یا اخبرنی الثقہ سے میرے والد ہی مراد ہیں امام شافعیؒ فتوے دیتے تو ان سے بھی مشورہ لیتے تھے، فرط تعلق کی بنا پر اکثر ان کے گھر بھی تشریف لے جایا کرتے تھے[2]۔

تلامذہ | امام احمد کے تلامذہ کے مختلف طبقے ہیں، آپ کے اساتذہ میں حسن بن موسیٰ اشیب، زیاد بن ایوب، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبدالرزاق بن ہمام، محمد بن ادریس شافعی، وکیع بن جراح، ہشام بن عبدالملک طیالسی، یحییٰ بن آدم اور یزید بن ہارون وغیرہ نے آپ سے استفادہ کیا ہے۔ خلفؒ بن ہشام داؤد بن عمرو ضبی اور قتیبہ بن سعید ثقفی نے عمر میں بڑے ہونے کے باوجود آپ سے روایت کی ہے ہمعصروں میں احمد بن ابی الحواری حسین بن منصور، عبدالرحمٰن بن ابراہیم، عبیداللہ بن سرخسی، علی بن عبداللہ مدینی، محمد بن رافع قشیری، محمد بن یحییٰ بن ابی سمینہ اور یحییٰ بن معین وغیرہ کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے اعزہ میں آپ کے چچیرے بھائی حنبل بن اسحاق اور صاحبزادگان صالح اور عبداللہ کو آپ سے روایت کرنے کا فخر حاصل ہے۔ صحاح ستہ کے مصنفین میں امام بخاریؒ، مسلم اور ابوداؤد بلا واسطہ اور امام ترمذی نسائی اور ابن ماجہ بالواسطہ آپ کے شاگرد ہیں، عام تلامذہ کی تعداد جن میں سے اکثر امام وقت سمجھے جاتے تھے بے شمار ہے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۔ [2] احمد بن حنبل والمحنہ۔ حافظ ابن حجر نے ان کو بھی امام احمد کا استاد بتایا ہے۔ تہذیب جلد ۲۔ [3] محمد بن طاہر مقدسی

اہلِ علم کا اعتراف اور شہادتیں امام احمدؒ کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے متعلق ان کے اساتذہ، معاصرین اور تلامذہ کے بکثرت اقوال طبقات و تراجم کی کتابوں میں موجود ہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ بغداد کو جب میں نے چھوڑا تو وہاں امام احمد سے زیادہ صاحبِ علم و فضل اور متدین و متورع کوئی شخص نہیں تھا۔ امام ابو ثور فرماتے ہیں کہ وہ سفیان ثوری سے بڑے عالم و فقیہ اور ہمارے شیخ و امام ہیں۔ یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ "میں نے ان سے بہتر آدمی نہیں دیکھا، ان کی توصیف و تعریف میں مبالغہ بُرا نہیں،، علی بن مدینی سے جب کہا گیا کہ امام احمد کا اس زمانہ میں وہی حال ہے جو سعید بن مسیب کا ان کے زمانہ میں تھا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں سعید بن مسیب کے زمانہ میں ان کی طرح کے لوگ موجود تھے مگر موجودہ دور میں امام احمد کی کوئی مثال نہیں۔ ابو عبید فرماتے ہیں کہ حدیث و سنت میں نہ امام احمد سے بڑا کوئی عالم ہے اور نہ علمائے اسلام میں ان کا کوئی مقابل۔[۱]

امام صاحب کے مشہور شاگرد ابراہیم حربی فرماتے ہیں کہ ان کو اللہ نے سلف و خلف کے علوم کا مخزن بنایا تھا، علی بن مدینی کا ارشاد ہے کہ وہ ہمارے اور اللہ کے درمیان حجت ہیں، جب کسی مسئلہ میں مجھ کو ان کا فتویٰ مل جاتا ہے تو میں بے تکلف اس پر عمل کرتا ہوں۔ ابو نصر بن ماکولا کہتے ہیں کہ ان کو صحابہؓ و تابعینؒ کے مذاہب سے سب سے زیادہ واقفیت تھی۔

امام احمد کی عظمت اس سے بھی ظاہر ہے کہ علمائے امت نے ان کی مدح و توصیف کو تقویٰ و دیانت کا ثبوت اور ذم و تنقیص کو ایمان کے منافی اور نفاق کی علامت قرار دیا ہے۔ سفیان بن وکیع فرماتے ہیں کہ "امام احمد کی عیب جوئی کرنے والا فاسق و فاجر ہے" احمد دورقی کا بیان ہے کہ امام احمد کی مذمت کرنے والے کو بے دین سمجھنا چاہیئے،، ابو حاتم اور قتیبہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "امام سے محبت و عقیدت رکھنے والا متبع سنت اور غیر مبتدع ہے۔ ابن اعین نے ان دو شعروں میں یہ

فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے امام احمد سے کتاب المغازی کے آخر میں مسند بریدہ کے اندر احمد بن حسن ترمذی کے واسطے سے ایک حدیث کی روایت ہے کتاب الصدقات میں محمد بن عبداللہ انصاری سے روایت کرنے کے بعد لکھا ہے کہ وزادنی احمد بن حنبل عن محمد بن عبداللہ انصاری اور کتاب النکاح میں حدثنا و اخبرنا کے بجائے قال لنا احمد بن حنبل تحریر کیا ہے (کتاب الجمع فی رجال الصحیحین) ۱؎ طبقات الشافعیہ، طبقات الفقہاء شیرازی، تاریخ ابن عساکر و ذہبی

حقیقت بیان کی ہے۔

اضحی ابن حنبل محنۃ مامونۃ　　　وبحب احمد یعرف المتنسک

واذا رأیت لاحمد متنقصا　　　فاعلم بان ستورہ ستھتک[1]

ترجمہ :- احمد کی ذات ایک بہترین کسوٹی ہے۔ ان کی محبت دینداری کی علامت ہے۔ اگر کوئی شخص ان کی مذمت کرتا ہے تو یقین مانو اس کی قلعی کھل کر رہے گی۔

فضل وکمال احمد بڑے بلند پایہ محدث اور ان تمام اوصاف وکمالات سے متصف تھے جو ایک امام حدیث میں ہونے چاہئیں۔

حافظہ ان کی قوتِ حافظہ کا کمال اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے چار سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ ان کے پاس بارہ گھڑوں کے بقدر کتابیں تھیں اور وہ سب ان کو زبانی یاد تھیں۔ علی بن مدینی فرماتے تھے کہ ان سے بہتر کسی کا حافظہ نہیں تھا، احمد بن سعید دارمی کہتے ہیں امام احمد کی طرح باوجودیکہ وہ کمسن تھے کسی کو حدیثیں یاد نہیں تھیں۔ ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ ہمارے مشائخ میں ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں تھا۔ ان کو لاکھوں حدیثیں یاد تھیں۔

عدالت وثقاہت ان کی توثیق پر ائمہ فن کا اتفاق ہے، عجلی کا بیان ہے کہ وہ حدیث میں ثقہ وضابط تھے۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ "وہ ثقہ وثابت اور صدوق تھے" امام نسائی ان کو ثقہ ومعتمد قرار دیتے ہیں، حافظ ابن حجر نے ان کو متقن کہا ہے، ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ بغداد کی عجیب چیزوں میں ایک یہ نوجوان بھی تھا کمسنی کی وجہ سے جس کے بال بھی سیاہ نہیں ہوئے تھے مگر جب وہ حدثنا کہتا تھا تو ہر طرف سے صدوق کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔[2]

نقد وتمیز وہ حدیثوں کے معتبر ناقل وحافظ ہی نہ تھے بلکہ صحیح اور غلط روایتوں میں امتیاز میں بھی پورا

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۲ وتہذیب الاسماء ج ۱ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ والبدایہ ج ۱۰ وتاریخ بغداد ج ۴ [2] صفۃ الصفوۃ ج ۲ تہذیب الاسماء، طبقات سبکی ج ۱، تاریخ ابن عساکر ج ۲، تاریخ بغداد ج ۴، تہذیب التہذیب ج ۱، ثقات ابن سعد

ملکہ رکھتے تھے، ابوحاتم فرماتے ہیں کہ "امام احمد کو صحیح اور سقیم روایتوں کی معرفت میں بڑا کمال اور خاص امتیاز حاصل تھا" ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ "وہ حدیث و رجال میں سب سے بہتر مہارت اور اچھی پرکھ رکھتے تھے" امام شافعی کو ان کی بصیرت پر اس درجہ اعتماد تھا کہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "جب کوئی روایت تمہارے معیار پر صحیح و ثابت اُتر جائے تو مجھے بھی بتلا دو میں اس کو بے تکلف قبول کرلوں گا" عمر بن احمد ناقد کا بیان ہے کہ "حدیث میں احمد کی موافقت کے بعد مجھ کو دوسروں کی مخالفت کی پرواہ نہیں ہوتی"[1]

مسندِ درس چالیس سال کی عمر میں درس و تدریس کی مسند پر رونق افروز ہوئے۔ آپ کی مجلس درس بڑی باوقار، سنجیدہ اور شائستہ ہوتی تھی، لوگ ہمہ تن گوش رہتے اور مذاق و مزاح کا ایک کلمہ بھی زبان پر نہ لاتے، ابوعبید بیان کرتے ہیں کہ "میں امام ابویوسف، محمد بن حسن شیبانی، یحییٰ بن سعید اور عبدالرحمٰن بن مہدی وغیرہ باکمال محدثین و فقہاء کے درس میں شریک رہا ہوں لیکن امام احمد کی طرح مجھ پر کسی کی ہیبت و دہشت طاری نہیں ہوئی، ان کی مجلس نہایت بارعب اور پُر وقار ہوتی تھی درس میں حاضرین اور شرکاء کا جمِ غفیر ہوتا تھا۔ علمائے سیر کا بیان ہے کہ پانچ پانچ ہزار کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے"[2]

مرجعیت و مقبولیت شہرت و ناموری اور امامت و سیادت سے کنارہ کش رہنے کے باوجود عالمِ اسلام کا کوئی گوشہ بھی آپ کے آوازۂ شہرت سے خالی نہ تھا۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ عنفوانِ شباب ہی میں ان کو پوری شہرت حاصل ہوگئی تھی اور بڑھاپے میں تو ہر جگہ ان کا نام روشن ہوگیا تھا۔[3] آپ کے دروازے پر طلبہ کا ہجوم رہتا تھا، جب قید کئے گئے تو عالم اسلام میں کہرام مچ گیا، بیمار ہوئے تو مزاج پرسی کے لئے لوگوں کا ایک جمِ غفیر ہر وقت موجود رہتا، جنازہ میں شرکت کرنے والے بے شمار تھے وہ عوام و خواص ہر طبقہ میں یکساں مقبول اور ہر دلعزیز تھے، ادریس بن عبدالکریم مقری فرماتے ہیں کہ اکابر علماء و فقہاء اور نامور محدثین بھی ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور سلام کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ عوامی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص کے سوال پر اس کو کوئی چیز دی تو دوسرے

[1] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ قسم اول و تاریخ ابن عساکر ج ۲ و البدایہ والنہایہ ج ۱۰ [2] صفۃ الصفوۃ ج ۲ [3] البدایہ والنہایہ ج ۱۰

Marfat.com

شخص نے اسے بقیمت خریدنا چاہا، مگر پہلے شخص نے یہ کہہ کر دینے سے انکار کر دیا کہ "مجھ کو بھی تمہاری طرح اس سے برکت کی امید ہے"، حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ "امامت و سیادت آپ کے نام کا جز ہو گئی تھی"۔

عبادات و اعمال

نماز نماز باجماعت ادا کرتے تھے، آپ کا ارشاد ہے کہ اذان سے پہلے ہی نماز کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ جماعت کا اس قدر اہتمام تھا کہ جب خلق قرآن کے انکار کے جرم میں آپ کو کوڑے لگائے گئے اور بدن لہولہان ہو گیا اس وقت بھی ابن سماعہ کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ انہوں نے اعتراض کیا کہ خون سے لت پت ہونے کے باوجود آپ نے نماز پڑھی؟ جواب دیا کہ "قد صلی عمرؓ وجرحہ یثعب دما" یعنی قاتلانہ حملہ میں حضرت عمرؓ کا جسم بھی لہولہان ہو گیا تھا مگر انہوں نے اسی حالت میں نماز ادا کی تھی، نمازوں میں استغراق و محویت اور خشوع و خضوع کا یہ حال تھا کہ بقول عبدالرزاق "ان کی نمازوں سے سلف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی"۔

نوافل آپ کے صاحبزادہ عبداللہ کا بیان ہے کہ میرے والد روز و شب میں تین سو رکعتیں نفل پڑھتے تھے، ابتلا کے بعد ضعف کی وجہ سے ایک سو پچاس رکعتیں کر دی تھیں۔

تہجد عشا کے بعد تھوڑی دیر تک آرام فرماتے، پھر ساری رات نماز اور یاد الٰہی میں گذارتے بچپن ہی سے یہ معمول بن گیا تھا اور کبھی اس میں فرق نہ آنے دیتے، ابوبکر مروزی فرماتے ہیں کہ چار مہینے میں نے ان کے ساتھ قیام کیا، اس عرصہ میں کبھی انہوں نے تہجد ترک نہیں کیا۔[۳]

تلاوت تلاوت قرآن سے بڑا شغف تھا، شب میں قیام اور دن کا اکثر حصہ تلاوت قرآن میں بسر ہوتا، ہر ساتویں دن اور ایک روایت کے مطابق ہر روز ایک قرآن ختم کرتے تھے۔

دعا و استغفار خدا سے دعا و استغفار اور تضرع و گریہ زاری بھی معمولات میں داخل تھے، بڑے مستجاب الدعوات تھے، آپ کی دعاؤں میں برکت و تاثیر دیکھ کر اکثر لوگ آپ سے دعا کی فرمائش کرتے تھے، ایک دفعہ آپ کے ایک پڑوسی نے اپنی اپاہج ماں کے لئے دعا کی درخواست کی تو

[۱] مجموعۃ الرسائل [۲] صفۃ الصفوۃ ج ۲ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ [۳] البدایہ والنہایہ ج ۱۰

امام صاحب سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ ہم تو خود تم لوگوں کی دعاؤں کے زیادہ محتاج ہیں ؟ وہ آدمی اپنے گھر واپس لوٹ رہا تھا تو امام صاحب کی خادمہ نے راستہ میں آکر اس کو بتایا کہ تمہاری واپسی کے بعد سے وہ برابر تمہاری ماں کے لئے دعا کر رہے ہیں، اس نے آکر اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو خود اس کی ماں نے دروازہ کھولا اور بتایا کہ اب میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہوں[1]۔

صدقہ وخیرات | غربت و ناداری کے باوجود طبیعت میں بڑی فیاضی تھی، جہاں تک ہو سکتا غریبوں کی امداد فرماتے، امراء و سلاطین کے تحائف قبول نہ فرماتے، اگر کبھی مجبوراً قبول بھی کرنا پڑتا تو اس کو محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔

روزہ | روزوں کے اہتمام کا یہ حال تھا کہ قید خانہ میں سحری اور افطار کا انتظام نہ ہونے کے باوجود پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھتے، ایک دن جب معتصم باللہ کے جلاد کوڑے لگا رہے تھے تو کچھ لوگ ستو لائے اور کہا کہ اس ضعف و نقاہت کی حالت میں روزہ رکھنا ٹھیک نہیں ہے مگر آپ نے ان کی درخواست قبول نہ کی۔ فرض کے علاوہ مسنون اور مستحب روزے بھی اکثر رکھتے تھے، متوکل نے امام صاحب کے علاج کے لئے ابن ماسویہ طبیب کو بھیجا تو اس نے بتایا کہ امیرالمومنین انہیں کوئی بیماری نہیں، ان کی کمزوری اور بیماری کی وجہ کم خوری اور نمازوں کی زیادتی ہے۔

حج | پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تین دفعہ ناداری کی وجہ سے پاپیادہ تشریف لے گئے۔ تیسری اور چوتھی مرتبہ مجاورت بھی کی[2]۔

آخرت کا استحضار | آخرت کے تصور اور مواخذۂ الٰہی سے ان کا دل ہر وقت لرزہ براندام رہتا تھا۔ ان کی مجلسوں کا موضوع گفتگو یہی تھا۔ علی بن مدینی کو تاکید کی کہ "ہمیشہ آخرت کو پیش نظر رکھو"[3]۔

دنیا سے بے رغبتی | امام صاحب کی مجلس میں دنیا اور اس کے مزخرفات کا تذکرہ نہیں ہوتا

---

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۲ و تاریخ ابن عساکر ج ۲۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۲، و تاریخ ابن عساکر ج ۲۔ صفۃ الصفوۃ ج ۲ و تہذیب الاسماء [3] ج ۱۰۔

تھا، اگر کوئی اس قسم کا تذکرہ کرتا تو آپ خاموش رہتے، مامون، معتصم، واثق اور متوکل ہر ایک نے مال و دولت کا انبار آپ کے قدموں پر نچھاور کرنا چاہا مگر آپ نے دنیا کے چند خزف ریزوں کی خاطر دین کا سودا نہیں کیا، آپ کے سامنے ابن ابی شیبہ، عبدالاعلیٰ اور دوسرے محدثین کے عیش و عشرت کا ذکر کیا جاتا تو فرماتے کہ دنیا چند روزہ ہے، اس سے کوئی بڑی مراد حاصل نہیں ہو سکتی، کل آخرت میں جو کامیاب ہوگا کامیابی اسی کی ہے۔ ایک مرتبہ مامون نے محدثین میں زر و جواہر تقسیم کرنے کے لئے بھیجا تو آپ کے علاوہ کسی نے لینے سے انکار نہیں کیا۔ فرماتے تھے کہ مجھے سب سے زیادہ اس دن آرام ملتا ہے جس دن میرے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی۔[۱]

اتباعِ سنت اور محبت رسول امام کی زندگی کا مشن ہی سنت کی تائید و حمایت اور بدعات کا ابطال تھا، خلافِ سنت کاموں کو دیکھ کر سخت برہم ہوتے تھے اور سنت کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ نشست و برخاست کو ناپسند کرتے تھے، خود کبھی قصداً سنت ترک نہیں کی اور جب اپنے کسی عمل کے خلافِ سنت ہونے کا علم ہو جاتا تو فوراً اس سے باز آجاتے تھے، مرض الموت میں شدتِ الم کے باوجود کراہنا اس لئے پسند نہیں کیا کہ وہ خلاف سنت ہے، اکثر دعا فرماتے تھے کہ "اَمتنا علی الاسلام والسنۃ" (اے اللہ اسلام اور سنت پر ہمارا خاتمہ کر)

رسول کی ظاہری عقیدت و محبت سے بھی آپ کا دل معمور تھا، قید خانہ میں آپ کو تین بال دیئے گئے اور بتایا گیا کہ یہ موئے مبارک ہیں، آپ نے ان کو حرز جان بنائے رکھا اور انتقال کے وقت وصیت کی کہ قبر میں ان کو میری دونوں آنکھوں اور زبان پر رکھ دیا جائے۔[۲]

جاہ و منصب سے گریز آپ کی استغنا و بے نیازی نے کبھی کسی منصب و اعزاز کو قبول کرنا گوارا نہیں کیا۔ خلفاء و سلاطین نے مقرب بارگاہ بنانا اور انعام و اکرام سے نوازنا چاہا مگر آپ نے ہمیشہ رد فرما دیا، امام شافعیؒ نے خلیفہ ہارون سے یمن کی بدنظمی کا ذکر کر کے ایک مناسب اور بہتر قاضی کے تقرر کی

---

[۱] صفۃ الصفوۃ ج ۲ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ و البدایہ والنہایہ ج ۱۰۔ [۲] صفۃ الصفوۃ ج ۲ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰۔

فرمائش کی، خلیفہ نے کہا آپ کے حلقہ میں جو موزوں شخص ہو اس کا انتخاب کرکے مجھے مطلع کیجئے، امام شافعیؒ کی نگاہِ انتخاب امام احمد پر پڑی، جب ان سے اس کا ذکر کیا تو امام احمد نے جواب دیا کہ میں تو آپ کے پاس طلب علم کے لئے حاضر ہوتا ہوں اور آپ مجھ کو عہدہ قضا قبول کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں، اگر آپ کے پاس علم کی دولت نہ ہوتی تو اب میں آپ سے رسم و راہ ترک کر دیتا۔ امام شافعیؒ یہ سن کر نہایت نادم و پشیمان ہوئے[1]۔

امراء و سلاطین سے بے تعلقی امراء و سلاطین سے ہمیشہ بے تعلق رہے، خلفاء نے آپ کے سامنے مختلف قسم کی پیش کشیں کیں مگر انہوں نے ان کو ٹھکرا دیا، امیر المومنین عبداللہ ابن طاہر نے اپنی جانب سے سلام کہلایا اور ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ "یہ مجھے پسند نہیں ہے اور امیر سے مجھ کو توقع ہے کہ وہ ایک ناگوار کام کی مجھ کو زحمت نہ دیں گے، ابن طاہر کا خود بیان ہے کہ میں دو آدمیوں (یحییٰ اور احمد) کو نہایت عزیز رکھتا ہوں لیکن دونوں نہ کبھی میرے یہاں آئے اور نہ دوسرے امراء کے قریب پھٹکتے ہیں" آپ کے چچا اسحاق نے آپ سے کہا کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کے لئے امراء کے یہاں جایا کریں اور اسحاق بن راھویہ کو مثال میں پیش کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ عم محترم! آپ اسحاق کے طرزِ عمل کو پیش کرتے ہیں، اگر میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں ان کو بھی ضرور منع کروں گا، سلاطین و امراء کی صحبت فتنہ ہے۔ جب ہم ان سے دور رہ کر اپنے کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو قریب ہونے کے بعد کیا حال ہوگا، متوکل اپنے پیشروؤں کی غلطیوں کی تلافی کے لئے ہر وقت آپ کی دلجوئی کی فکر میں رہتا۔ روزانہ قاصد بھیج کر خیریت دریافت کرتا، معاملات سلطنت اور مہمات امور میں مشورے طلب کرتا۔ مال و دولت اور انعام و اکرام سے مالا مال کرنا چاہتا مگر اس کا یہ التفات امام صاحب پر سخت بار ہوتا۔ آپ رو کر فرماتے سلمت من ھؤلاء حتی اذا کان فی اخر عمری بلیت بھم[2] (زندگی بھر میں ان لوگوں کی آلائشوں سے محفوظ رہا لیکن آخر عمر میں ان کے فتنوں سے دوچار ہو رہا ہوں) کبھی ارشاد فرماتے۔ ھذا امر اشد علی من ذالک (یہ نوازشات کا معاملہ تو میرے لئے اس ابتلاء و آزمائش سے بھی زیادہ سخت اور شاق ہے)

---

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۲ و البدایہ والنہایہ ج ۱۰۔ [2] صفۃ الصفوۃ ج ۲ و طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱، تاریخ ابن عساکر ج ۲ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰۔ احمد بن حنبل و المحنۃ

ان کے ہدایا و تحائف سے بھی سخت پرہیز تھا، ایک مرتبہ خلیفہ نے امیر بغداد عبداللہ بن اسحاق کو خط لکھا کہ امام صاحب کو کسی طرح دربار میں لائے۔ امام صاحب نے ضعف و نقاہت کا عذر کیا، متوکل کو معلوم ہوا تو اس نے لکھا کہ میں آپ کی دید اور قربت کا مشتاق اور دعا و برکت کا خواستگار ہوں اس لئے امام صاحب کو مجبوراً اس کے لشکرگاہ میں قیام کرنا پڑا، خلیفہ روزانہ آپ کے لئے پُرتکلف کھانے اور انواع و اقسام کے میوہ جات بھجواتا مگر آپ نے کبھی ان کو تناول نہیں فرمایا۔ آٹھ روز تک مسلسل روزے رکھتے رہے۔ سولہ دنوں تک وہاں قیام رہا۔ اس مدت میں صرف ستو پر اکتفا فرماتے رہے، خلیفہ نے خلعت اور اپنی خاص سواری بھیج کر بلا بھیجا، آپ نے اس خیال سے واپسی کی اجازت مل جائے گی جانا منظور کر لیا لیکن ایک ٹٹو پر سوار ہو کر تشریف لے گئے، خادم نے ایک بیش قیمت جوڑا پہنایا، چند دنوں کے بعد واپسی کی اجازت ملی تو شاہی خلعت وہیں چھوڑ دی اور فرمایا کہ اس کو بیچ کر اس کی قیمت غرباء و مساکین میں تقسیم کر دی جائے، اس کے باوجود عرصہ تک اس واقعہ سے متاثر اور اس کی اذیت محسوس کرتے رہے، اپنے اعزہ و متعلقین کو بھی امراء کے یہاں آمد و رفت اور ان کے ہدیے قبول کرنے سے منع فرماتے تھے، بعض اعزہ کے یہاں آمد و رفت بھی اس لئے ترک کر دی تھی کہ وہ سلاطین کے یہاں نشست و برخاست رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ خلیفہ نے آپ کے اہل و عیال کے لئے چار ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے انکار کرنا چاہا تو خلیفہ نے کہلایا کہ یہ تو اہل و عیال کے لئے ہے۔ امام صاحب سن کر خاموش ہو گئے۔ لیکن متعلقین کو ملامت اور ان کے سامنے دنیوی زندگی کی بے ثباتی اور آخرت کی حیاتِ سرمدی کا ذکر فرماتے رہے، ان لوگوں نے عرض کیا کہ حدیث میں ہے کہ اس مال کو لینے میں کوئی قباحت نہیں جو بلا طلب مل جائے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابن عباس بھی امراء کے تحائف قبول فرماتے تھے آپ نے فرمایا کہ اس میں اور ان بزرگوں کے معاملہ میں بڑا فرق ہے اگر مجھ کو بھی معلوم ہو جائے کہ یہ مال ظلم و جور سے حاصل نہیں کیا گیا ہے تو لینے میں تامل نہ ہوگا۔

ایک دفعہ تین روز کا فاقہ تھا اپنے کسی شاگرد سے آٹا قرض لیا، گھر والوں نے بھوک کی شدت کا

خیال کر کے فوراً روٹی پکا کر حاضر کر دی، دریافت فرمایا کہ اس قدر جلد کس طرح روٹی پک گئی. بتایا گیا کہ صالح کے یہاں آگ جل رہی تھی وہیں پکالی گئی، صالح امراء و سلاطین کے تحفے قبول کرتے تھے اس لئے آپ نے ان کے چولہے پر پکی ہوئی روٹیاں کھانے سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ صالح کے گھر جانے کا دروازہ بند کر دیا جائے۔

متوکل نے امام صاحب کے اخراجات کے لئے یعقوب بن قوصرہ کے ہاتھ دس ہزار درہم بھجوائے امام صاحب نے لینے میں لیت ولعل کیا۔ یعقوب نے کہا کہ اگر آپ اسے قبول نہیں فرماتے تو خلیفہ کو آپ سے بدگمانی ہوگی اور روپے رکھ کر چلے گئے، رات کے آخری پہر میں امام صاحب نے اپنے بیوی بچوں اور دوسرے متعلقین کو اکٹھا کر کے فرمایا کہ ان روپیوں کی وجہ سے مجھے رات بھر نیند نہیں آئی اس لئے ان کو ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اسی وقت بصرہ و بغداد کے محتاج اور ضرورتمند محدثین کی ایک فہرست تیار کی اور صبح ہوتے ہی ساری رقم تقسیم کر دی گئی۔[1]

خودداری احباب اور مخلصین سے بھی کسی قسم کا انتفاع خودداری کے منافی سمجھتے تھے، حسن بن عبدالعزیز نے ایک مرتبہ ایک ہزار دینار کی تین تھیلیاں بھیجیں اور کہلایا کہ "یہ حلال وطیب مال ہے اس کو قبول فرمایئے اور اہل و عیال کو اس سے فائدہ اٹھانے دیجئے۔ امام صاحب نے واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ "ہم کو اس کی ضرورت نہیں، بحمداللہ ہم آرام و راحت سے ہیں، عبدالرزاق کے سامنے امام احمد کا ذکر کیا گیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا کہ ایک دفعہ وہ میرے پاس آئے مجھے معلوم تھا کہ ان کے پاس خرچ نہیں ہے اس لئے میں نے خلوت میں لیجا کر دس ہزار دینار نذر پیش کی، مسکرا کر فرمایا۔ میں نہایت آرام سے ہوں، آپ نے ناحق زحمت گوارا کی۔ اگر میں اور لوگوں سے اس قسم کی رقمیں لیتا ہوتا تو اس کے قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا۔[2]

انکسار و تواضع طبعاً بڑے متواضع اور منکسر المزاج تھے، خاندانی نجابت، علمی برتری، مذہبی

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۲ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰۔ [2] تاریخ ابن عساکر ج ۲ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰۔ ایضاً باختلاف صفات صفۃ الصفوۃ ج ۲۔

عظمت اور غیر معمولی شہرت و مقبولیت کے باوجود اُن میں کبر و غرور کا شائبہ بھی نہ تھا، یحییٰ ابن معین فرماتے ہیں کہ میرا اور ان کا پچاس سال سے سابقہ ہے مگر انہوں نے اپنے خیر و صلاح اور خاندانی وجاہت پر فخر و برتری کا اظہار نہیں کیا، ایک شخص نے کہا آپ عربی النسل ہیں، ارشاد ہوا کہ ہم مسکین اور فقیر لوگ ہیں۔ محمد بن حسن فرماتے ہیں کہ جب وہ راستہ چلتے تو کوئی آگے پیچھے نہ ہوتا، اس کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے، ابو عوانہ کے درس میں شریک ہونے کے لئے گئے تو لوگوں نے ممتاز جگہ پر بٹھانے کی کوشش کی آپ نے کہا میں شیخ کے سامنے بیٹھوں گا، ہم کو معلمین کے سامنے تواضع سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، صالح کا بیان ہے کہ میرے والد کبھی دوسروں سے وضو کا پانی تک نہیں لانے کے لئے کہتے تھے بلکہ خود ہی کنوئیں سے پانی نکال کر وضو کرتے تھے، وفات سے دو دن پہلے عیادت کے لئے حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ کے غلام نے آپ کو پنکھا جھلنا چاہا آپ نے روک دیا، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام احمد پر خدا کی رحمت ہو نہایت متواضع اور خلیق بزرگ تھے[1]

شرافت و حسن خلق امام احمد شرافت اور حسن خلق کا پیکر تھے کبھی کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی، اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تو آپ اس کا اور بہتر بدلہ پانے کی فکر کرتے، کوئی ناگوار خاطر بات کہتا تو خندہ پیشانی سے اس کو انگیز کر لیتے، زبان پر شکایت یا ملامت کا لفظ نہیں آنے دیتے۔ طالب علمی کے زمانے میں یمن تشریف لے گئے اور ابن ساعد کے مکان میں قیام کیا، اتفاقاً ایک دن ان کے کپڑے اور جملہ سامان چوری ہو گیا، قیام گاہ پر واپس آئے تو ابن ساعد کی والدہ نے اس کی خبر کی۔ آپ خاموش رہے اور صرف اس قدر فرمایا کہ میری تختیاں کیا ہوئیں جن پر میں حدیثیں لکھتا تھا[2]

وقار و متانت طبیعت میں وقار تھا اس لئے عام لوگوں سے ملنا جلنا، خواص کے یہاں آمد و رفت، بازاروں میں چلنا پھرنا ناپسند تھا، لطف و تفریح کے کاموں سے اس لئے پرہیز کرتے تھے کہ اس سے علم کی عظمت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کبھی متوکل کے دربار میں حاضر ہونا پڑا تو علم کی آن بان اور شان و شکوہ میں

---

[1] ایضاً باختلاف صفحات و تاریخ بغداد ج ۴ ص ۔ تاریخ ابن عساکر ج ۲

فرق نہ آنے دیا[1]۔

آپ کی متانت پر مزاح بھی بار ہوتا تھا اس لئے آپ کے اساتذہ بھی اس کا لحاظ کرتے تھے، ایک دن یزید بن ہارون نے اپنے شاگردوں کے سامنے مزاح کی کوئی بات کہی، بعد میں ان کو معلوم ہوا کہ امام احمد بھی موجود تھے تو سخت شرمندہ ہوئے اور سر پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اگر تم لوگوں نے بتا دیا ہوتا کہ وہ موجود ہیں تو میں مذاق نہ کرتا۔ ایک روز اسماعیل بن علیہ کے شاگرد کسی بات پر ہنسے تو وہ سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ امام احمد کی موجودگی میں تم لوگ ہنسی، مذاق اور بے شرمی کی باتیں کرتے ہو۔

خلوت پسندی خلوت پسند تھے اژدہام اور ہنگامہ آرائی کو سخت ناپسند کرتے تھے، جنازہ، جماعت اور عیادت کے علاوہ گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے مگر ان کے فضل و کمال نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا اس لئے ہر وقت طلبہ اور شائقین علم کا ہجوم رہتا تھا۔

نظافت و پاکیزگی طبیعت نظافت پسند تھی، گندگی سے سخت نفرت تھی، اکثر باوضو رہتے، ہمیشہ صاف ستھرے کپڑوں میں نظر آتے رہے[1]۔

ذریعہ معاش امام صاحب کی آمدنی کا اصل ذریعہ صرف ایک آبائی جائیداد تھی جس سے کل سترہ درہم ماہوار کرایہ ملتا تھا، اسی میں تنگی ترشی سے بسر کرتے اور خدا کا شکر بجالاتے، اتنی حقیر آمدنی اہل و عیال کے خرچ کے لئے بالکل ناکافی تھی اس لئے اکثر گھر میں فاقہ ہوتا تھا۔ کئی کئی دن تک چولہا جلنے کی نوبت نہ آتی، مگر فقر و فاقہ کا اثر کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے اور کسی کا تحفہ یا ہدیہ قبول کرتے۔ ایک مرتبہ آپ کی والدہ کے پاس کپڑا نہ تھا، ایک صاحب نے ہدیہ کرنا چاہا تو منظور نہیں کیا، آپ کے احباب آپ کی حالت دیکھ کر آپ کی خدمت کرنا چاہتے، مگر انکار کر دیتے، آپ کے صاحبزادہ صالح کا بیان ہے کہ وہ اکثر لوگوں کی پیش کش مسترد کر دیتے اور ہمیشہ یہی فرماتے کہ الحمد للہ ہم لوگ آرام و عافیت سے ہیں حالانکہ گھر میں ایک جبہ بھی نہیں ہوتا تھا، محنت مزدوری کر لینا پسند تھا مگر کسی کے سامنے دستِ طلب دراز کرنا گوارہ نہ تھا، ایک مرتبہ یمن میں تھے تو کپڑے چوری ہو گئے کئی دن گھر سے نہ نکلے، جب لوگوں کو تلاش

---

[1] العبر ج المقار تاریخ بغداد جلد ۴، تاریخ ابن عساکر ج ۲، صفۃ الصفوۃ ج ۲

ہوئی اور حال معلوم ہوا تو کچھ روپیوں کا انتظام کیا گیا مگر آپ نے صرف ایک دینار قبول کیا اور اس کے معاوضہ میں ایک تحریر لکھی، بعض اوقات ازار بند بُن کر فروخت کر کے اخراجات پورے کرتے تھے گھر میں پھٹا پرانا بوریا تھا اسی پر بیٹھتے تھے، انتقال کے وقت گھر میں چند چیتھڑوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا

غذا غذا بہت سادہ اور معمولی تھی، خشک روٹی کا ٹکڑا پانی سے تر کر کے نمک سے کھایا کرتے، پھلوں میں خربوزے سے شوق تھا، اکثر سرکہ کا استعمال کرتے، ایک درہم کی چربی مہینہ بھر کے لئے کافی ہوتی، آخر عمر میں چربی کھانا بھی چھوڑ دیا تھا، بیماری کے دنوں میں بھی نمک، سرکہ، اچار اور روٹی آپ کی خوراک تھی، ایک مرتبہ روزہ سے تھے، شام کو گھر سے افطار آیا امیر بغداد نے کہا ذرا میں بھی دیکھوں دیکھا تو چند روٹیاں اور کھیرا نکلا، اس نے کہا یہی سادگی اور قناعت تو آپ کو ہماری دعوتیں قبول کرنے نہیں دیتی، متوکل کے یہاں سے پُر تکلف کھانا آتا مگر آپ ستو پر قناعت کرتے، اس نے ایک دفعہ دس ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے سب صدقہ کر دیا۔ علی بن جہم نے کہا امیر المومنین ان کو مال و دولت سے کیا سروکار، ان کے لئے تو ایک نان جویں کافی ہے، خلیفہ نے کہا تم صحیح کہتے ہو[1]۔

لباس آپ کا عام لباس قمیض اور ازار تھا، سر پہ عمامہ بھی باندھتے تھے، موٹا جھوٹا مگر سفید اور صاف ستھرا کپڑا زیب تن فرماتے تھے۔

حُلیہ رنگ ملیح مائل بہ سپیدی تھا، مگر چہرہ نہایت خوبصورت اور بارونق تھا، قد ایک روایت کے مطابق لانبا اور دوسری روایت کے مطابق میانہ اور درمیانی تھا۔ آخر میں داڑھی کے چند بال سفید ہو گئے اس لئے حنا کا خضاب لگاتے تھے[2]۔

---

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۲، صفوۃ الصفوہ ج ۲ [2] تاریخ ابن عساکر ج ۲ وتاریخ ابن خلکان۔ ج ۱

Marfat.com

ابتلا اور آزمائش

عباسی خلفاء کے دور میں عجمی روح کی کارفرمائی اور یونانی منطق و فلسفہ کے اثرات نے عربوں کے سادہ مذاق طبیعت کو بدل دیا اور وہ سادہ و سہل دین حنیف پر عقیدہ رکھنے کے بجائے لایعنی موشگافیوں اور فلسفہ و کلام کے غیر ضروری مباحث میں الجھ کر مختلف گروہوں میں بٹ گئے، ان میں فرقہ معتزلہ زیادہ مشہور اور ممتاز ہے، اس نے دین کی حفاظت و خدمت کا کام بھی انجام دیا لیکن اس کی بدولت مذہب میں نئے نئے اور بے بنیاد مسائل بھی پیدا ہو گئے، اس لئے محدثین جن کا مقصد زندگی احیائے سنت اور رد بدعت تھا معتزلہ کے عقائد و افکار کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ معتزلہ کے ان مسائل میں خلق قرآن کا مسئلہ بھی تھا۔

ہارون رشید کے زمانہ تک اس عقیدہ کو ماننے والے بہت تھوڑے لوگ تھے اور وہ بھی اپنے عقیدہ کا اعلان نہیں کرتے تھے، بشر مریسی کے متعلق جب خلیفہ کو معلوم ہوا کہ وہ اس عقیدہ کا قائل ہے تو اس نے قسم کھائی کہ اگر یہ شخص مجھ کو مل گیا تو میں اسے نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالوں گا[1]

اس کے بعد مامون خلیفہ ہوا وہ بڑا علم و ادب نواز اور علماء و شعراء کا قدرداں تھا، بچپن ہی میں اس کو برامکہ کی صحبت میسر آئی، فلسفہ کے مطالعہ اور مختلف زبانوں کی تعلیم اور غیر قوموں کے علماء کی صحبت و معاشرت کے اثر سے وہ عقل پرست اور آزاد خیال ہو گیا، اس لئے ہارون الرشید کے زمانہ میں جو معتزلہ گوشہ گیر تھے وہ اس کے زمانہ میں کھل کر میدان میں آ گئے اور رفتہ رفتہ اس کے دربار سے وابستہ ہو گئے مامون کی تائید و سرپرستی نے معتزلہ کے اثر و رسوخ کو بہت بڑھا دیا اور انہوں نے بزور شمشیر لوگوں سے خلق قرآن کا اقرار کرانا چاہا، اس کا مقابلہ کرنے کے لئے محدثین و فقہا کی ایک جماعت جس کے سربراہ امام احمد بن حنبل تھے آگے بڑھی، معتزلہ کی قیادت احمد بن ابی داؤد (م ۲۴۰ھ) کے ہاتھ میں تھی جو نہایت فاضل و لائق شخص تھا، شروع میں مامون کو اس مسلک کی جبری تبلیغ و اشاعت میں تامل تھا[2] بلکہ باقاعدہ اس

۱؎ احمد ابن حنبل، المحنۃ ۲؎ حیوۃ الحیوان دمیری ج ۱۔

کے اظہار میں بھی پس و پیش تھا لیکن احمد بن ابی داؤد کی حکمت و فراست نے اس کو اس پر آمادہ کر دیا اور ۲۱۸ھ میں اس نے اعلان کیا کہ جو لوگ خلق قرآن کا اقرار نہ کریں گے انہیں سخت سزا دی جائے گی۔

اس مسئلہ میں اس کو اتنی ضد پیدا ہو گئی کہ اسی زمانہ میں اس کو رومیوں سے جنگ کرنے کے لئے طرسوس جانا پڑا تو وہاں سے والی بغداد اسحاق بن ابراہیم کو تاکیدی خطوط لکھے کہ لوگوں سے زبردستی اس عقیدہ کا اقرار کرایا جائے اور ممالک اسلامیہ کے تمام علماء و فقہاء اور مذہبی راہنماؤں سے اس مسئلہ میں ان کی رائیں دریافت کر کے مجھ کو مطلع کیا جائے۔ اس حکم کی تکمیل میں امام صاحب بھی طلب کئے گئے اور ان سے خلق قرآن کے متعلق سوال کیا گیا، آپ اسحاق کے رد و کد کے باوجود صرف یہی فرماتے رہے کہ "قرآن خدا کا کلام ہے، میں اس کو مخلوق نہیں کہہ سکتا۔"

اسحاق نے امام احمد اور دوسرے علماء کے بیانات قلمبند کر کے مامون کے پاس بھیج دیئے مامون نے اس کے جواب پر پر حقارت آمیز تنقید کی تھی اور امام احمد کے بارے میں لکھا تھا کہ "ان کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا امیر المومنین نے اسے پڑھا، احمد کو بتا دو کہ امیر المومنین اس کے مفہوم و منشا سے پورے طور پر واقف ہیں اس مسئلہ میں ان کے جاہلانہ عقیدہ سے مطلع ہوئے اس کا خمیازہ بہرحال ان کو بھگتنا پڑے گا۔

خط کے آخر میں یہ حکم بھی تھا کہ "بشر بن ولید اور ابراہیم بن مہدی کو تو قتل کر دو اور باقی لوگوں میں جن کو اپنی رائے پر اصرار ہو پابزنجیر میرے پاس بھیج دو، میں خود ان لوگوں کی موت و حیات کا فیصلہ کروں گا۔" یہ فرمان جب مجمع عام میں پڑھ کر سنایا گیا تو اس کی ہیبت نے بڑے بڑے لوگوں کے عزم کو متزلزل کر دیا اور وہ مامون کے ہمزبان ہو گئے، علامہ قواریری اور سجادہ نے کسی قدر استقلال دکھایا مگر جب پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں تو دوسرے دن سجادہ اور تیسرے دن قواریری نے بھی اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور صرف امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح آخر وقت تک ثابت قدم رہے اس لئے ان کو مامون کے پاس پابجولاں بھیج دیا گیا مگر ابھی یہ لوگ راستہ ہی میں تھے [illegible]

لہ احمد بن حنبل والمحنۃ ص [illegible]

Marfat.com

مامون مرتے وقت ہونے والے خلیفہ کو وصیت کر گیا تھا کہ وہ عقیدۂ خلق قرآن کا لوگوں سے اقرار کرائے اور قاضی احمد بن ابی داؤد کو اپنے دربار سے وابستہ رکھے اور جملہ معاملات میں ان کی رائے و مشورہ عمل کرے۔ معتصم باللہ نے اس وصیت پر پورا پورا عمل کیا اور اس معاملہ میں اپنے پیشرو سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوا۔

امام احمد مامون کی وفات کے بعد طرسوس سے قید و بند کی حالت میں بغداد لائے گئے، راستہ میں کے رفیق محمد بن نوح کا انتقال ہوگیا۔ امام صاحب نے ان کی تجہیز و تکفین کی اور نماز جنازہ پڑھائی۔[1] اور وہ اگ رمضان کے مہینے میں بغداد پہنچے اور پیروں میں کئی بھاری بیڑیاں پہنا کر داخل زنداں کئے گئے اور پھر مس کے لئے معتصم باللہ کے سامنے پیش کئے گئے، اس موقع پر لوگوں نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اور ک آپ کے ساتھیوں میں سے تو کسی شخص نے عزیمت کی یہ راہ اختیار نہیں کی، آخر آپ کیوں اس ق جوش و ہمت سے کام لے رہے ہیں"۔ تو آپ نے جواب میں صرف اس قدر فرمایا کہ للہ اس قسم کی با کرنے کے لئے بجائے کتاب اللہ اور سنتِ نبوی سے کوئی ثبوت پیش کرو، ان دو چیزوں کے علا میں کسی اور بات کا قائل نہیں۔ بعض لوگوں نے رخصت اور تقیہ کی حدیثیں پیش کیں، فرمایا لیکن حدیث حباب کے بارہ میں کیا کہتے ہو، جس میں ہے کہ "تم سے پہلے لوگوں کو آروں سے چیر دیا جاتا تھا گ لوگ اپنے دین سے روگردانی کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے"۔ آپ کے چچا اسحاق بھی آپ رہائی کے لئے کوشاں تھے، انہوں نے امام احمد سے کہا "تمہارے ساتھی تو اقرار کر کے چھوٹ گئے اور تم قید و بند کی مشقت جھیل رہے ہو، آپ نے فرمایا چچا جان" جاہل لوگ تو خیر ناواقف ہی ہ لیکن جب علماء تقیہ کا سہارا لیں تو آخر حق کس طرح واضح ہوگا"۔ اسحاق کا بیان ہے کہ ان نے مجھ کو بالکل لاجواب کر دیا۔[2]

معتصم باللہ کو اس مسئلہ سے اتنی دلچسپی اس لئے تھی کہ اول تو مامون کی وصیت تھی احمد بن ابی داود برابر اس کو سختی کرنے پر ابھارتے رہتے تھے ورنہ وہ امام صاحب کے معا

---

[1] طبقات الشافعیہ [2] احمد بن حنبل دا مہ

تھا اس نے بار بار آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اور یہاں تک کہا کہ احمد میں تم پر اپنے بیٹوں سے بھی
دہ شفیق اور مہربان ہوں، اگر تم ذرا بھی اقرار پر آمادہ ہو جاؤ تو تمہیں رہا کر دوں گا اور خود اپنے ہاتھوں
ے تمہاری ان بیڑیوں کو کھول دوں گا۔ ایک مرتبہ وہ امام صاحب کی گفتگو سے متاثر ہو گیا اور اس کی
ن میں بہت کمی آگئی، مگر ابو داؤد نے یہ کہہ کر پھر ورغلایا کہ اگر آپ نے ان کو سزا نہ دی تو لوگ کہیں گے
امون کے مسلک سے دستبردار ہو گئے اور احمد نے آپ کو زیر کر لیا، یہ سن کر پھر امام صاحب سے بگڑ
،، امام صاحب کی سزا کی تفصیل خود ان کی زبان سے سننے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جب میں معتصم
ے قریب گیا تو سلام کرنے کے بعد کچھ دیر خاموش رہا، پھر عرض کیا، امیر المومنین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ے کس چیز کی تعلیم دی ہے، اس نے کہا لا الہ الا اللہ کے اقرار و شہادت کی، میں نے عرض کیا کہ "میں تو اس
ا شہادت دیتا ہوں" پھر حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت بیان کی جس میں وفد عبدالقیس کا ایمان
ے متعلق سوال اور رسول اللہ کا جواب مذکور ہے، میری گفتگو کے بعد اس نے ابن داؤد سے کچھ باتیں
یں اور مجھ سے کہا گیا اگر تمہارا معاملہ میرے پیش رو خلیفہ کے زمانہ سے نہ چلا آتا تو میں تم سے تعرض
کرتا، اس کے بعد عبدالرحمن کو مجھ سے بحث و مناظرہ کرنے کا حکم دیا جس کا سلسلہ تین دن تک جاری
ہا میرے دلائل اور براہین کے سامنے سب کو عاجز اور خاموش ہو جانا پڑا، مگر وہ اپنی ضد اور
ہٹ دھرمی سے باز نہ آتے، بغداد کے گورنر اسحاق بن ابراہیم نے کہا، امیر المومنین یہ گمراہ اور کافر ہے
س کو رہا کرنا دانشمندی کے خلاف ہے، خلیفہ نے غضب ناک ہو کر کہا تم پر خدا کی لعنت ہو، مجھ کو
امید تھی کہ تم میری بات مان لوگے، اب اس نے میرے جسم کے کپڑے اتارنے اور مجھ کو گھسیٹنے کا حکم دیا
اور جلادوں کو طلب کیا، میں نے عرض کیا، امیر المومنین خدا سے ڈریئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا ارشاد ہے۔

لا یحل دم امرئ مسلم یشهد
ان لا اله الا الله الا باحدی
ثلاث

بجز تین صورتوں کے کسی حال میں بھی کسی
مسلمان کا جو لا الہ الا اللہ کا اقرار کرتا ہو خون
بہانا جائز نہیں۔

لہ طبقات الشافعیہ

دوسری حدیث میں نے یہ پڑھی۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ فاذا قالوھا عصموا منی دماءھم واموالھم۔

مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے تا آنکہ وہ لا الٰہ نہ کہہ دیں۔ جب انہوں نے لا الٰہ الا اللّٰہ کہہ دیا تو ان کی جان و مال محفوظ ہو گیا۔

اس لئے آپ میرے خون کو کیسے حلال سمجھ رہے ہیں؟ میں نے تو حلال کرنے والے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے، امیر المومنین جس طرح اس وقت میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں اسی طرح آپ کو بھی خدا کے سامنے کھڑا ہونا ہے، میرا خیال تھا کہ اب وہ باز آجائیں گے لیکن لوگ برابر ان کو اکساتے رہے اور مجھ کو کافر اور گمراہ بتاتے رہے۔ معتصم نے ان کی باتوں سے متاثر ہو کر جلادوں کو مجھے کوڑے مارنے کا حکم دیا، اس حکم پر ہر جلاد دو کوڑے پوری قوت سے لگاتا، اس طرح مجھ کو بہت سے کوڑے لگائے گئے، ہر کوڑے پر مجھے غشی طاری ہو جاتی تھی، جب کوڑے لگانا بند کر دیا جاتا تو ہوش میں آجاتا اور دیکھتا کہ معتصم میرے پاس موجود ہے اور کہہ رہا ہے، احمد کیوں نہیں لوگوں کی بات مان لیتے، دوسرے حاضرین کہتے کہ خلیفہ تم سے درخواست کر رہے ہیں، تم ان کی بات بھی ٹھکرا رہے ہو گر میں کسی بات پر دھیان نہ دیتا، میرا اصرار صرف اس قدر تھا کہ :۔

اعطونی شیئاً من کتاب اللّٰہ او سنۃ رسولہ حتی اقول بہ۔

میرے سامنے اللّٰہ کی کتاب یا اس کے رسول کی سنت سے کوئی دلیل لاؤ تب ہی میں تمہاری بات مان سکتا ہوں۔

اس پر مجھ کو زدو کوب کیا جاتا آخر میں مار کی شدت سے میرے ہوش و حواس بجا نہ رہے اور تکلیف کا احساس تک ختم ہو گیا، اس سے خلیفہ خوفزدہ ہو گیا اور اس نے رہائی کا فرمان جاری کر دیا اور پورے اسّی کوڑے زور و قوت سے لگائے جانے کے بعد میں ۲۵ رمضان کو رہا کر دیا گیا[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ و طبقات الشافعیہ ج ۱۔

Marfat.com

حافظ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ امام صاحب کو جب سزا دینے کے لیے لایا گیا تو بغداد میں ایک کہرام مچ گیا، اور جب پہلا کوڑا لگایا گیا تو آپ نے بسم اللہ کہا دوسری مرتبہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ کہا، تیسری بار فرمایا القرآن کلام اللہ غیر مخلوق اور چوتھی مرتبہ یہ آیت تلاوت کی۔ لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا۔ محمد بن اسماعیل روایت کرتے ہیں کہ ایک نوجوان کو میں نے یہ کہتے سنا کہ احمد کو اس کوڑے جتنے زور سے لگائے گئے تھے اگر کسی ہاتھی کو بھی اتنے زور سے مارا جاتا تو وہ چیخ اٹھتا۔[1]

رہائی کے وقت بھی ابن ابی داؤد نے مزاحمت کی مگر اس کا بس نہ چلا۔ معتصم باللہ نے ایک بہترین خلعت اور سواری دے کر روانہ کیا، آپ کے ہمراہ جم غفیر تھا، گھر آنے کے بعد آپ نے خلعت فروخت کر کے اس کی قیمت غرباء و مساکین میں تقسیم کر دی۔[2]

رہائی کے بعد معتصم باللہ کو امام صاحب کے ساتھ اتنی سختی برتنے پر ندامت ہوئی، اسحاق کو تاکید کی کہ امام صاحب کو خیریت سے برابر مطلع کرتا رہے، وہ ہر روز آپ کے گھر جا کر مزاج پرسی کرتا تھا، خلیفہ کی طرف سے طبی امداد بھی بہم پہنچائی گئی، جب امام صاحب صحت یاب ہو گئے تو وہ بہت خوش ہوا اور سارے مسلمانوں میں بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔[3]

ابتلا کے بعد امام صاحب بہت کمزور ہو گئے۔ پشت پر ضرب کے جو نشانات پڑ گئے تھے وہ ہمیشہ باقی رہے۔ کلائی میں ایسا کاری زخم لگا تھا کہ عمر بھر اس کی تکلیف محسوس کرتے رہے، آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "اللہ ابوالہیثم کی مغفرت کرے"۔ آپ کے فرزند عبداللہ نے دریافت کیا یہ کون شخص ہے؟ فرمایا جب مجھ کو کوڑے لگانے کے لیے جلادوں کے درمیان کھڑا کیا گیا تو ایک نوجوان نے پیچھے سے میرا دامن کھینچا، اور کہا مجھ کو جانتے ہو میں نے کہا نہیں اس نے بتایا کہ میں مشہور عیار و شاطر ڈاکو ابوالہیثم ہوں۔ مجھے دنیا کے چند معمولی خزف ریزوں کے لیے مختلف وقتوں میں اٹھارہ ہزار کوڑے لگائے گئے مگر میں اپنے شیطانی اعمال سے باز نہیں آیا۔ تم کو خدا کی راہ میں مارا جائے گا اس لئے تمہارے دل میں راہ حق سے انحراف کا خیال بھی نہیں آنا چاہئے۔ مجھ پر اس بات کا بڑا اثر ہوا اور اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ اب بھی جب ضرب کی شدت

---

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۲ [2] احمد و المقریزی [3] ایضاً۔

...دس ہوتی ہے تو اس شخص کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اور اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔[1]

امام احمد نے سوائے ابن ابی داؤد کے ان تمام لوگوں کو جنہوں نے آپ کے ساتھ یہ ظالمانہ برتاؤ کیا تھا معاف کر دیا۔ ابی داؤد کے بارہ میں فرماتے تھے کہ اگر وہ اس فتنہ کا داعی و محرک نہ ہوتا اور اپنی بدعتوں سے باز آجاتا تو اسے بھی معاف کر دیتا۔ واثق باللہ نے عفو خواہی کی تو ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ کے خاندان سے تمہاری قرابت داری و تعلق کی بناء پر میں نے اوّل روز سے ہی تمہیں معاف کر دیا تھا۔[2]

معتصم باللہ کے بعد واثق باللہ خلیفہ ہوا، یہ بھی اس مسئلہ میں بڑا سخت تھا، اس نے بہت سے محدثین اور علمائے حق کو قید و بند اور قتل کی سزائیں دیں، مشہور صاحب عزیمت بزرگ احمد بن نصر خزاعی کو تختہ دار پر چڑھایا، لیکن امام صاحب اس کے زمانہ خلافت بھر روپوش رہے، جمعہ و جماعت کے لئے بھی باہر نہیں نکلتے تھے۔[3]

اس کے بعد متوکل خلیفہ ہوا، اس نے ان تمام عقائد و خیالات کو جو کتاب و سنت کے خلاف تھے بالکل روک دیا، امام صاحب کو ابتلا سے نجات دلوائی اور ان کے اعزاز و اکرام کا فرمان جاری کیا اور یہ اعلان بھی کرا دیا کہ قرآن مخلوق نہیں ہے، اس کی خلافت سے معتزلہ کے زور و قوت کا خاتمہ اور ان کا اثر کم ہو گیا۔[4]

یہ فتنہ ۲۱۸ھ سے ۲۳۴ھ تک یعنی سولہ سال رہا اور امام احمد نے اٹھائیس اور تیس مہینے قید و بند اور مشقت و محن میں گزارے۔[5]

اس عظیم ابتلا سے جو امام احمد کی ہمت و عزیمت کا غیر معمولی نمونہ ہے، ان کی شہرت و مقبولیت میں بڑا اضافہ ہو گیا، امام صاحب کے دوسرے اوصاف و کمالات میں تو اور لوگ بھی شریک و سہیم تھے لیکن راہ حق میں یہ ثابت قدمی اور اولوالعزمی انہیں کا طغرائے امتیاز ہے۔ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: "امام احمد کی ذات گرامی صبر و ابتلا اور استقامت علی الحق کے لئے ضرب المثل ہے۔ تین جابر و قاہر بادشاہوں کے

---

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۲ [2] ایضاً [3] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ [4] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ و الطبقات الکبریٰ شعرانی ج ۱ [5] البدایہ والنہایہ ج ۱۰۔

Marfat.com

ظلم واستبداد اور غیر معمولی مشکلات و شدائد کے باوجود ان کی استقامت وعزیمت میں فرق نہ آیا، اور نہ وہ کتمانِ حق اور اخفائے علم کے مرتکب ہوئے اور نہ رخصتوں اور تقیہ کا سہارا لیا بلکہ ہر حال میں انہوں نے اپنے کو سنتِ نبوی اور آثارِ صحابہ سے وابستہ رکھا، اور دین کی اشاعت اور بدعات کا استیصال کرتے رہے، یہ وہ مخصوص فضل و کمال ہے جس میں امام صاحب کا کوئی معاصر صاحبِ علم ان کا شریک نہیں۔[1]

اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں "کہ امام احمد کی اس عظیم الشان قربانی نے اسلام کو ختم ہونے سے بچا لیا۔"

علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ اللہ نے اسلام کو دو آدمیوں کے ذریعہ اعزاز و غلبہ عطا کیا امت میں ان دونوں کی کوئی مثال نہیں، یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ جنہوں نے فتنہ ارتداد کے موقع پر اس کا مقابلہ اور اسلام کی مدافعت کی، دوسرے امام احمد جو فتنہ خلق قرآن کے زمانہ میں پیش پیش رہے۔

بعض بزرگوں نے آپ کی وفات کے بعد خواب دیکھا کہ آپ اس حق گوئی اور صبر و استقلال کی بنا پر خدا کے خاص فضل و انعام سے نوازے گئے۔[2]

علالت و وفات ۲ ربیع الاوّل بروز چہار شنبہ کو شدید بخار میں مبتلا ہونے نو دن تک علالت کا سلسلہ جاری رہا۔ بیماری کے زمانہ میں عیادت کرنے والوں کا بڑا ہجوم رہتا تھا، مسجدیں بھر جاتی تھیں، سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کا اتنا مجمع ہوتا تھا کہ آمد و رفت کے راستے بند اور خرید و فروخت دشوار ہو گئی تھی، لوگوں کو جب موقع ملتا تو جوق در جوق حاضر ہو کر سلام عرض کرتے، خلیفہ کو اس اژدہام کی خبر ہوئی تو اس نے گلیوں کے صدر دروازوں پر وقائع نگار مقرر کر دیئے جو لوگوں کو امام صاحب کے حال سے مطلع کرتے تھے، راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے زائرین چھپ کر دیواریں پھاند کر امام صاحب کی زیارت کرتے، آخری روز ایک بزرگ داخل ہوئے اور فرمایا، احمد خدا کے حضور

---

[1] مجموعۃ الرسائل [2] تاریخ بغداد ج ۴، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ و طبقات الشافعیہ جلد ۱۔ ابن خلکان ج ۱ تاریخ ابن عساکر ج ۲۔ تہذیب الاسماء ج ۱ قسم ۱۔

Marfat.com

حاضر ہونے کو یاد کرو تو بے اختیار چیخ نکلی اور آنسو رخسار پر ٹپک پڑے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بچوں کو بلوایا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور انگلیوں میں خلال کرانے کے لئے کہا وضو کرتے وقت برابر اللہ کو یاد کرتے رہے، وضو کرنے کے بعد روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، اس سے پہلے ایک مؤثر وصیت بھی کی تھی۔

تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ ہے۔ اس وقت ۷۷ سال کی عمر تھی۔ ابن خلکان نے ۱۱ ربیع الاول اور بعض مورخین نے رجب اور ربیع الآخر کا مہینہ بھی لکھا ہے، وفات کی خبر مشتہر ہوتے ہی صفِ ماتم بچھ گئی، گلیوں اور سڑکوں پر صرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے جو درد و غم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

محمد بن طاہر امیر بغداد نے اپنے بچوں اور حاجب کے ہمراہ کفن بھجوایا مگر امام صاحب کے متعلقین نے اس کو لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ امیر نے جب زندگی میں ان کو ناگوار کاموں سے معاف رکھا تو موت کے بعد بھی معاف رکھیں۔

جنازہ میں اتنا بڑا مجمع تھا کہ صحرائے ابی قراط سے جہاں جنازہ رکھا گیا تھا سوق رقیق اور قطیعہ کے پل تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، محمد بن طاہر نے نماز کے بعد شرکاء کا تخمینہ لگایا تو تقریباً آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں، ان کے علاوہ بے شمار آدمی سڑکوں، راستوں، چھتوں وغیرہ پر تھے عبدالوہاب وراق کا بیان ہے ۔۔۔۔۔ کہ جاہلیت اور اسلام کسی زمانہ میں اتنے زیادہ آدمی کسی کے جنازہ میں شریک نہیں ہوئے تھے[1]۔

امام کے فرزند عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا تھا کہ اہل بدعت اور ہمارے درمیان وجہ امتیاز جنازہ ہے، اللہ نے ان کی بات صحیح کر دی، بلاشبہ وہ امام سنت تھے، آپ کے سب سے بڑے حریف احمد بن ابی داؤد کی جو قاضی القضاۃ بھی تھے، موت کی ایک شخص کو بھی پرواہ نہیں ہوئی، صرف حکومت کے ارکان اور وابستگان کی ایک محدود جماعت جنازہ میں شریک ہوئی۔

---

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۲ و تاریخ بغداد ج ۴ و تاریخ ابن عساکر ج ۲۔

Marfat.com

تجہیز و تکفین کے دن مسجد رصافہ میں جن لوگوں نے عصر کی نماز ادا کی تھی۔ ان کی تعداد بھی بیس ہزار سے زیادہ تھی۔ حاضرین کی زیادتی کی وجہ سے جنازہ کی نماز کئی بار ہوئی اور عصر سے پہلے جسد مبارک کو قبر میں نہ رکھا جاسکا، تدفین کے بعد بھی نماز جنازہ کا سلسلہ جاری رہا، امیر بغداد محمد بن عبداللہ بن طاہر نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

باب حرب کے مقبرہ میں امام صاحب کو دفن کیا گیا۔ وفات کے بعد بھی ایک عرصہ تک لوگ قبر پر آتے اور کئی دنوں تک نماز جنازہ پڑھتے رہے۔ مزار مبارک اب تک زیارت گاہ خلائق ہے۔

امام صاحب کی وفات اور مغفرت کے متعلق بعض کرامتیں اور خواب بیان کئے جاتے ہیں، متعدد لوگوں نے آپ کی مغفرت اور عالم آخرت میں آپ کے اعزاز و اکرام کے خواب دیکھے۔

ازواج و اولاد امام احمد نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی عباسہ بنت فضل کے بطن سے بڑے صاحبزادہ صالح تولد ہوئے، ان کی وفات کے بعد ریحانہ سے شادی کی۔ ان کے بطن سے عبداللہ پیدا ہوئے، جب ریحانہ کا بھی انتقال ہوگیا تو ایک لونڈی کو خرید کر عقد میں داخل کیا۔ ان سے چار لڑکے حسن، حسین، محمد اور سعید اور ایک لڑکی زینب پیدا ہوئیں۔

ابوالفضل صالح یہ امام صاحب کے سب سے بڑے فرزند او ر۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے کم سنی ہی میں گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی وجہ سے ان کو امام صاحب سے نقل و روایت کا زیادہ موقع نہیں ملا تاہم ان کے واسطے سے امام صاحب کی حدیثوں کا بڑا حصہ مروی ہے، اور وہ فقہ حنبلی کے ناقلین میں بھی شمار کئے جاتے ہیں، آخر عمر میں اصبہان کے قاضی مقرر کئے گئے، جب عہدہ قضا پر مامور کئے گئے تو رو پڑے اور فرمایا کہ مجھے میرے والد یاد آگئے۔ اس لئے کہ زہد و تقویٰ وہ مجھ کو اس حالت میں دیکھنا پسند نہیں کرتے لیکن ندامت یہ ہے کہ میں نے قرضوں کی زیادتی اور اپنے والد کے اہل و عیال کی کفالت ہی کے خیال سے یہ منصب قبول کیا۔ رمضان ۲۶۶ھ میں وفات پائی۔[1]

ابوعبدالرحمٰن عبداللہ یہ نہایت ثقہ و ضابط اور بڑے بلند پایہ محدث تھے۔[2] ان کو امام احمد کے

---

[1] مقدمہ ثلاثیات مسند احمد، تاریخ ابن خلکان ج ۱، ص ۲۰۔ الفہرست ابن ندیم۔

Marfat.com

کے علاوہ بھی متعدد کبار محدثین سے روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، امام احمد صاحب کی روائتیں سب سے زیادہ ان ہی کے واسطہ سے مروی ہیں۔ انہوں نے امام کی اکثر کتابوں کی بھی روایت کی ہے۔ یکشنبہ ۲۲ جمادی الاولی ۲۹۰ھ کو انتقال کیا۔ آپ کے بھتیجے زہیر بن صالح نے جنازہ کی نماز پڑھائی، میت میں ایک بڑے مجمع نے شرکت کی۔ وفات سے پہلے دریافت کیا گیا کہ آپ کس جگہ دفن ہونا پسند کریں گے۔ فرمایا مجھے معتبر طریقے سے معلوم ہوا ہے کہ قطیعہ میں کوئی پیغمبر مدفون ہیں اس لئے اپنے والد کے مقابلہ میں پیغمبر کے قرب وجوار میں دفن ہونا مجھ کو زیادہ پسند ہے[۱]

سعید امام صاحب کی وفات سے پچاس روز قبل پیدا ہوئے تھے بعد میں کوفہ کے گورنر بھی مقرر ہوئے محمد امام کی بیماری کے زمانہ میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے[۲]

کلام وعقائد امام احمد فقیہ و مجتہد ہونے کے باوجود عملی اور اعتقادی مسائل میں فقہا اور متکلمین کی طرح زیادہ تحقیق و تدقیق نہیں کرتے تھے بلکہ محدثین کے مسلک کے مطابق جو کچھ ظواہر حدیث سے ثابت ہوتا تھا اسی پر عمل کرتے اور اعتقاد رکھتے تھے۔ اس لئے جب ان سے اس قسم کے سوالات کئے جاتے تو وہ خاموش رہتے اور ان میں غور و تفتیش کو بدعت بتاتے، ایک شخص نے کرابیسی سے قرآن کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا وہ اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے، اس نے پوچھا متکلم اور قاری قرآن کے جن الفاظ کو پڑھتا اور ادا کرتا ہے اس کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کرابیسی نے کہا قاری کی قرأت اور متکلم کا قول مخلوق ہے، امام احمد سے اس کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے کہا اس طرح کے غیر ضروری سوالات اور مباحث میں غور و فکر اور ان کی بحث و تفتیش بدعت اور سکوت افضل ہے[۳]۔ ایک دفعہ الفاظ قرآن کے بارہ میں آپ سے تین بار سوال کیا گیا آپ دو مرتبہ خاموش رہے تیسری مرتبہ امام بخاریؒ نے جواب دیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں، البتہ بندوں کے افعال مخلوق ہیں لیکن اس طرح کے مسائل میں پڑنا بدعت اور خلاف سنت ہے[۴]۔

گو امام احمد اس قسم کے مسائل عام مسلمانوں کے سامنے بیان کرنا پسند نہیں کرتے تھے تاہم اقتضاء ضرورت

---

[۱] مقدمہ ثلاثیات مسند احمد و تاریخ ابن خلکان ج ۱ [۲] مقدمہ ثلاثیات مسند احمد البدایہ والنہایہ ج ۱۰ [۳] احمد بن حنبل [۴] ایضاً

کی بنا پر ان سے اس طرح کے مسائل میں جو آرار منقول ہیں، ان میں بھی احتیاط پوری طرح ملحوظ ہے مثلاً

صفات الٰہی اور قرآن قرآن کے بارہ میں امام صاحب کی رائے گزر چکی ہے۔ ایک مرتبہ متوکل کو اس مسئلہ سے متعلق جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا "سلف صالحین قرآن کو کلام اللہ اور غیر مخلوق مانتے تھے اور یہی ہمارا بھی مسلک ہے، میں صاحب کلام نہیں اور نہ اس معاملہ میں کسی قسم کی بحث و تفتیش کو پسند کرتا ہوں، کتاب اللہ و سنت نبوی اور صحابہ کرام و تابعین عظام سے جو کچھ ثابت و منقول ہے اس سے زیادہ کد و کاوش کو میں معیوب سمجھتا ہوں[1]

وہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ان صفتوں سے جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہیں متصف مانتے ہیں لیکن ان کی ماہیت و حقیقت پر بحث و گفتگو کو ناپسند اور ان کی دور از کار تاویل کو بدعت سمجھتے تھے ان کے نزدیک جس طرح اللہ قدیم ہے، اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں اور کلام بھی خدا کی ایک صفت ہے اس لئے وہ قدیم ہے۔

تشبیہ اور جسمیت وہ اللہ کی تشبیہ اور جسمیت کے قائل نہیں ہیں اسی لئے "وجاء ربک" سے وجاء ثواب ربک مراد لیتے ہیں[2]

رویت باری عام اہل سنت والجماعت کی طرح امام احمد بھی عالم آخرت میں مومنین کے لئے اللہ کی رویت اور دیدار کے قائل ہیں۔ اس کے ثبوت میں متعدد قرآنی آیات واحادیث موجود ہیں۔ امام صاحب صہیب رومی کی ایک روایت سے بھی استدلال کرتے تھے جس میں للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ الآیۃ میں زیادۃ کی تفسیر رویت سے کی گئی ہے[3]

ایمان و اسلام امام احمد کے نزدیک ایمان قول و عمل دونوں سے عبارت ہے اور اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے[4] ان کا قول ہے کہ کار خیر سے ایمان میں اضافہ اور معاصی سے اس میں کمی ہو جاتی ہے۔ بڑے کاموں کے ارتکاب سے ایمان سلب ہو جاتا ہے لیکن اسلام باقی رہتا ہے، اسلام اس وقت ختم ہوتا ہے جب آدمی خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرتا یا فرائض میں کسی فرض کو تمرد کی وجہ سے ترک کر دیتا

---

[1] احمد بن حنبل [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ [3] ایضاً [4] ایضاً۔

ہے، غفلت اور کوتاہی سے اگر کوئی شخص فرض بجا نہ لائے تو یہ خدا کی مرضی پر موقوف ہے کہ اسے عذاب دے یا معاف کردے[1]

مرتکبین کبائر مرتکب کبائر کو کافر نہیں سمجھتے تھے، آپ کا قول ہے کہ "اہل توحید میں سے کوئی شخص کافر نہیں ہوسکتا خواہ وہ کبائر کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو[2]"

لیکن وہ تارک صلوٰۃ کو کافر سمجھتے تھے، اس بارہ میں ان کا امام شافعیؒ سے ایک مناظرہ بھی ہوا تھا۔

مسئلہ خلافت حضرت علیؓ کی ذات سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے تھے لیکن عام صحابہ کی عظمت و برتری کے بھی قائل تھے۔ خلفاء ثلاثہ اور حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ کسی صحابی کو سب وشتم کرنا ان کے نزدیک معصیت ہے۔ خلافت کے معاملہ میں ان کا وہی نقطہ نظر ہے جو عام اہل سنت والجماعت کا ہے۔ امام صاحب اس کی تائید میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت پیش کرتے تھے۔

ما راٰہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن وما راٰوہ سیئاً فھو عند اللہ سیئ۔	جس چیز کو جملہ مسلمان بہتر خیال کریں۔ وہ اللہ کے نزدیک بہتر ہے اور جس کو سب برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی برا ہے۔

فرماتے تھے کہ تمام صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہؐ کا خلیفہ منتخب کیا۔ اس سے ان کی فضیلت و بزرگی خود ہی ثابت ہوجاتی ہے، عمر بن عثمان حمصی نے خلافت کے متعلق آپ کی رائے دریافت کی تو فرمایا، پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ ہیں اس کے بعد حضرت عمرؓ پھر حضرت عثمانؓ اور سب سے آخری خلیفہ حضرت علیؓ ہیں، جو لوگ حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر ترجیح دیتے ہیں وہ درحقیقت ان اجلہ صحابہ اور اہل شوریٰ پر نکتہ چینی کرتے ہیں جنہوں نے حضرت عثمان کو مقدم قرار دیا تھا[3]۔

---

[1] المناقب ابن جوزی۔ [2] ایضاً۔ [3] البدایہ والنہایہ ج ۱۰۔

Marfat.com

فقہ و اجتہاد

کیا امام احمد فقیہ اور صاحب مذہب نہیں تھے

امام احمد کا شمار ان چار مشہور سائمہ اسلام اور فقہاء مجتہدین میں ہوتا ہے جن کے اجتہادی مذاہب پر چوتھی صدی سے اب تک مسلمان عمل کرتے چلے آرہے ہیں، لیکن بعض متقدمین علماء کو ان کے فقیہ اور صاحب مذہب ہونے میں کلام ہے، علامہ ابن جریر فرماتے ہیں۔

انما ھو رجل حدیث لا رجل فقہ۔[۲] وہ صرف محدث ہیں فقیہ نہیں۔

علامہ ابن عبدالبر نے الانتقاء میں محض ائمہ ثلاثہ کا تذکرہ کیا ہے، ابن قتیبہ نے ان کو فقہاء کے زمرہ میں شامل نہیں کیا ہے، بشاری مقدسی نے ان کو فقہا کے بجائے اصحاب حدیث میں شامل کیا ہے[۳] مگر ان کے سوا اکثر علماء متقدمین نے ان کو بلند پایہ فقیہ و مجتہد بھی مانا ہے اور امام فقہ و صاحب مذہب بھی تسلیم کیا ہے امام شافعی تک نے ان کو فقہ و اجتہاد میں امام بتایا ہے[۴]۔ اور متاخرین تو امام احمد کو محدث کی بجائے فقیہ ہی کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں، ساتویں صدی کے مشہور عالم دمیری نے اصحاب المذاہب المتبوعہ میں ان کے مذہب کا ذکر کیا ہے[۵] اور اسی صدی کے مشہور مورخ علامہ ابن خلدون کا بیان ہے۔

قد صار اھل الاسلام الیوم علی تقلید ھؤلاء الائمۃ الاربعۃ[۶] اب مسلمان ان چار اماموں کی تقلید کرتے ہیں۔

علامہ شہرستانی نے مسلمانوں کے اجتہادی مذاہب میں ان مذہب کو بھی شامل کیا ہے[۷]۔ صاحب مفتاح السعادۃ لکھتے ہیں "امام احمد ان مجتہدین میں ہیں جن کے اقوال و آراء پر عمل کیا جاتا ہے اور جن کا مذہب اکثر شہروں میں مروج ہے[۸]"، صاحب کشف الظنون تحریر فرماتے ہیں مشہور مذاہب جن کی

ل۱ امام احمد کے حالات اور کارناموں پر موجودہ زمانہ کے مشہور مصری عالم ڈاکٹر ابو زہرہ نے نہایت عمدہ کتاب تالیف کی ہے اور اردو میں اس کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں اس کتاب کا یہ حصہ بڑا اہم اور نہایت بصیرت افروز ہے ہم نے بھی یہاں اس سے زیادہ استفادہ کیا ہے

ل۲ ... الانتقاء ... صفۃ الصفوۃ ... ابن خلدون ... الملل والنحل شہرستانی برحاشیہ الملل ابن حزم ج ۲

ل۸ مفتاح السعادۃ ج ۲

سمت مسلم ہے چار ہیں اور وہ امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد کی جانب منسوب ہیں[۱] شاہ ولی اللہ صاحب رسالہ الانصاف میں محدثین فقہاء کے متعلق تحریر فرماتے ہیں" ان لوگوں نے گذشتہ ائمہ فقہ کی تقلید پر اکتفا نہ کرنے کے بجائے خود اصول و قوانین متعین کئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان لوگوں میں بھی غیر معمولی فضل وکمال، فقہی بصیرت اور حدیث اور اس کے مراتب و درجات سے واقفیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ نمایاں امام احمد ہیں[۲]" اور عقد الجید میں فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ میں اس مسلک کو بھی شامل کیا ہے۔

علامہ شبلیؒ عہد مامون کے اہل کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: خصوصاً امام شافعیؒ اور امام احمد کا تو وہ پایہ ہے کہ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے حصوں میں انہیں کے اجتہادی مسائل پر گیارہ سو برس سے آج تک مذہبی قانون بنے ہوئے ہیں[۳]"

غرض ساتویں صدی بلکہ اس کے پہلے سے اسلامی فقہ و قانون اور اس کی تاریخ و تدوین کے سلسلہ میں امام احمد کا ایک امام فقہ اور صاحب مذہب کی حیثیت سے ذکر ہوتا چلا آرہا ہے، اس لئے جس طرح ان کا فقیہ مجتہد ہونا مسلم ہے اسی طرح صاحب مذہب اور امام فقہ ہونا بھی بلاریب ثابت ہے۔

متقدمین کا امام صاحب کو فقیہ و صاحب مذہب کی حیثیت سے تذکرہ نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ آپ کے تفقہ اجتہاد کے قائل نہیں تھے بلکہ اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ امام صاحب پر حدیث کا زیادہ اثر غالب تھا اس لئے ان بزرگوں نے ان کے نمایاں وصف و امتیاز کے اعتبار سے ان کو فقیہ کے بجائے صرف محدث ہی کہا اور لکھا۔

افتاء کے شرائط امام احمدؒ کے نزدیک علوم قرآن، اسانید صحیحہ، سنن نبوی اور متقدم علماء کے اقوال سے پوری واقفیت کے علاوہ مفتی کے اندر مندرجہ ذیل اوصاف پائے جانے ضروری ہیں:

(۱) اس کی نیت خالص ہو (۲) علم، حلم، وقار اور سکینت سے متصف ہو (۳) علم میں کامل اور صاحب غلبہ و اختیار ہو تاکہ جرأت کے ساتھ اپنے فیصلوں کو نافذ کر سکے (۴) بذات خود مکتفی اور مستغنی ہو یعنی دوسروں کا محتاج و دست نگر نہ ہو (۵) لوگوں کے حالات اور ذہنی کیفیات سے باخبر ہو[۴]

---

[۱] کشف الظنون ج ۲ [۲] الانصاف فی بیان سبب الخلاف [۳] المامون ج ۲ [۴] اعلام الموقعین ج ۲۔

Marfat.com

فقہ حنبلی کے اصول | حافظ ابن قیم نے امام احمد کے تفقہ و اجتہاد کے حسب ذیل اصول بیان کئے ہیں۔

(۱) **نصوص** ۔ فقہ حنبلی میں سب سے اہم اور مقدم چیز یہی ہے، اس میں کتاب وسنت دونوں شامل ہیں اس اصل کے ہوتے ہوئے کسی اور چیز کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

(۲) **فتاوائے صحابہ** ۔ امام احمد کے نزدیک نصوص کے بعد اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ صحابہ کے اقوال وفتاویٰ ہیں اور وہ ان کو کتاب وسنت کے بعد ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہیں، اگر کسی مسئلہ میں صحابہ سے مختلف اقوال منقول ہوں تو اس قول کو ترجیح دی جائے گی جو کتاب وسنت سے قریب تر ہو اگر اس کا اندازہ نہ ہو سکے تو صرف اختلاف صحابہ کو ذکر کر کے خاموشی اختیار کر لی جائے گی اور کسی کو ترجیح نہ دیا جائے گا۔[1] دوسرا اصول یہ ہے کہ افضل صحابی کا قول مرجح سمجھا جائے گا، مثلاً صحابہ میں اختلاف کی صورت میں خلفاء کا قول مرجح مانا جائے گا، یا ایک جانب شیخین ہوں اور دوسری طرف دوسرے خلفاء تو شیخین کے قول کو اختیار کیا جائے گا، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ میں اختلاف کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ کی رائے پر عمل کیا جائے گا ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر ایک ہی درجہ اور مرتبہ کے صحابہ کے درمیان اختلاف ہو تو ایک کا قول دوسرے کے لئے حجت نہ ہوگا، امام صاحب سے اس کی بھی روایت کی گئی ہے کہ وہ اختلاف صحابہ کی صورت میں ان سب کے اقوال پر عمل کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور اپنی رائے سے کسی صحابہ کے قول کو مرجوح قرار دینا پسند نہیں کرتے۔[2]

بعض لوگ امام صاحب پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ فتاوائے صحابہ کے مقابلہ میں نصوص کی بھی پرواہ نہیں کرتے، علامہ ابن قیم ان لوگوں کے جواب میں لکھتے ہیں،

امام احمد نص کی موجودگی میں اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور اس کے مخالف ہر چیز کو رد کر دیا کرتے تھے مثلاً حضرت عمرؓ کے برخلاف انہوں نے مبتوتہ کے متعلق فاطمہ بنت قیس کی حدیث اور جنبی کے تیمم کے بارہ میں عمار بن یاسرؓ کی حدیث کو صحیح قرار دیا اور حضرت ابن عباسؓ اور ایک اور روایت کے مطابق

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ [2] ایضاً ج ۳۔

حضرت علیؓ کے ایک فتویٰ کو جو سبیعہ اسلمی کی حدیث صحیح کے خلاف تھا رد فرما دیا۔[۱]

(۳) **ضعیف و مرسل روایات** ۔ تیسرا ماخذ ضعیف و مرسل روایات کو بتاتے ہیں، اسحاق بن ابراہیم ہانی نے ان سے چند مسائل دریافت کئے جن کے متعلق بعض مرسل روایتیں موجود تھیں لیکن صحابہ و تابعین سے بروایت صحیح و باتصال ان کے خلاف فتویٰ موجود تھا تو فرمایا کہ "صحابہ سے جو کچھ باتصال ثابت ہے مجھ کو زیادہ پسند ہے، اور قیاس و رائے پر ان کو ترجیح دی جائے گی"۔ آپ کے صاحبزادہ عبداللہ نے دریافت فرمایا کہ صحیح و صالح اور ضعیف و سقیم روایتوں میں امتیاز نہ کرنے والے محدث اور فقیہ و صاحب رائے میں کس کے فتویٰ پر عمل کیا جائے گا، فرمایا "میرے نزدیک رائے کے مقابلہ میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے"۔

یہ واضح رہے کہ ضعیف سے منکر، باطل اور ایسی حدیثیں مراد نہیں ہیں جن کے راوی متہم ہوں، دوسرے فقہا نے بھی اس اصول کو ایک حد تک اختیار کیا ہے، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے علاوہ امام اعظمؒ نے بھی قہقہہ اور نبیذ تمر سے وضو کئے جانے کے متعلق ضعیف حدیثوں کو قیاس پر ترجیح دیا ہے۔

(۴) **قیاس** ۔ سب سے آخری چیز قیاس ہے اور امام صاحب محض ضرورت کے وقت اس کی اجازت دیتے ہیں اور ممکن حد تک اس سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اپنے ایک شاگرد کو تاکید کی کہ

ایاک ان تتکلم فی مسئلة لیس لک فیھا اثر[۲]	جس مسئلہ میں اثر موجود نہ ہو اس میں بحث و کلام نہ کرو۔

لیکن ظاہریہ کی طرح وہ قیاس کے منکر نہیں ہیں، ان کا قول ہے کہ "کوئی شخص قیاس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا" البتہ وہ اہل عراق کی طرح قیاس میں زیادہ توسیع کے قائل نہ تھے۔

ان اصول اربعہ کے علاوہ بھی بعض چیزوں کا امام احمد لحاظ کرتے تھے مثلاً اقوال تابعین، استصحاب، مصالح، سد ذرائع اور اجماع وغیرہ، ان کی تفصیل حنابلہ کی کتابوں میں موجود ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اجماع کے منکر تھے، لیکن علمائے حنابلہ نے اس کی جو تشریح کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

---

[۱] اعلام الموقعین ج ۱ [۲] ایضاً ج ۱

بعض شرطوں کے ساتھ اجماع کے قائل تھے۔

فقہ حنبلی کی خصوصیات

(۱) فقہ حنبلی کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس کا دار و مدار تمام تر حدیث و روایت اور نقل و اثر پر ہے، امام صاحب مقدور بھر احادیث سے انحراف اور بے تعلقی پسند نہیں کرتے تھے اور احادیث و آثار پر وسعت نظر کی بنا پر ان کو رائے و قیاس سے بہت کم کام بھی لینا پڑتا تھا. عبدالوہاب وراق کا بیان ہے کہ امام احمد نے ساٹھ ہزار مسائل کا اخبرنا وحدثنا کہہ کر جواب دیا[1] اس خصوصیت کی وجہ سے اوّل تو امام صاحب غیر وقوع پذیر مسائل کے بارہ میں فتوٰی دینے سے احتراز فرماتے تھے، دوسرے فقہی تفریعات و تخریجات پر ان کے فتوے مبنی نہیں ہوتے تھے، اس لئے اس فقہ کو تمام تر احکام شرعی پر مبنی کہا جا سکتا ہے۔

(۲) حیل و مخارج کا جو در حقیقت مذہبی قیود اور بندشوں سے بچنے کے ذرائع ہیں. حنبلی فقہ میں وجود نہیں ہے۔

(۳) بعض حیثیتوں سے فقہ حنبلی میں بڑی وسعت اور لچک بھی پائی جاتی ہے کیونکہ امام صاحب کے نزدیک عبادات اور ان مسائل و معاملات کو چھوڑ کر جن کی حلت و حرمت کی تصریح موجود ہے اشیاء کی اصل اباحت ہے، اس اصل کو تسلیم کر لینے کے نتیجہ میں حنبلی فقہ کے اندر بڑی لچک اور گنجائش پیدا ہو گئی ہے اس لئے اگر ایک جانب نصوص شرعیہ سے شدت تمسک کی بنا پر اس مذہب میں فقہی استنباط کا دائرہ محدود ہو گیا ہے تو دوسری جانب حرام کرنے والی متعدد پابندیوں کو ختم کر کے اس نے بڑی سہولت بھی پیدا کر دی ہے۔

(۴) حنبلی مذہب نے اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہونے دیا اور ہر دور میں حنابلہ کے اندر ائمہ و مجتہدین موجود رہے۔

فقہ حنبلی کے رواۃ و ناقلین

امام احمد نے اپنے اقوال و فتاوٰی خود منضبط نہیں کئے بلکہ دوسروں کو بھی ان کے جمع و تدوین سے منع کرتے تھے، مگر بعض ضرورتوں کی بنا پر اس کی اجازت بھی ان سے ثابت ہے اس لئے آپ کی زندگی میں آپ کے مذہب کا چرچا تو ہو گیا تھا مگر آپ کے انتقال کے

---

[1] تاریخ احمد بن حنبل از ابو زہرہ

Marfat.com

بعد مرتب و مدون کیا گیا، آپ سے براہ راست علوم فقہ کی تحصیل و تکمیل کرنے والے حسب ذیل حضرات ہیں :۔

ابوبکر احمد بن اثرم، احمد بن محمد بن حجاج مروزی، عبدالملک بن عبدالحمید، صالح بن احمد، عبداللہ بن احمد، حرب بن اسمٰعیل اور ابراہیم بن اسحاق حربی۔

لیکن فقہ حنبلی کے اصل جامع خلال ہیں[1]۔

خلال امام احمد کے اقوال و فتاوے کے اصل جامع و مرتب ابوبکر احمد بن محمد بن خلال (م ۳۱۱ھ) ہیں انہوں نے بیس سے زائد جلدوں میں امام احمد کے فتوے جمع کئے ہیں، ان کو امام صاحب سے براہ راست کسب فیض کا موقع نہیں ملا لیکن حنبلی مذہب میں ان کا درجہ بہت بلند ہے، یہ فقہ حنبلی کے جامع و ناقل ہی نہ تھے بلکہ اس کے ناشر بھی ہیں۔

ابوالقاسم خرقی عمر بن حسین خرقی (م ۳۳۴ھ) بھی کبار حنابلہ میں ہیں، انہوں نے خلال کی کتابوں کی تلخیص اور ان میں اضافہ کیا، ان کی کتاب المختصر حنبلی مذہب کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہے اس کی متعدد شرحوں میں موفق الدین مقدسی کی شرح المغنی زیادہ مشہور اور اہم ہے۔

غلام الخلال ابوبکر عبدالعزیز بن جعفر (م ۳۶۳ھ) خلال کے مشہور شاگردوں میں تھے، اس لئے ان کو غلام الخلال کہا جاتا تھا[2]، انہوں نے بھی خلال کی کتابوں کی تلخیص اور ان میں اضافہ کا کام انجام دیا۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اور ان کے نامور شاگرد حافظ ابن قیم بھی اس مذہب کے بڑے اہم رکن اور شارح سمجھے جاتے تھے۔

اسلامی ملکوں میں اس مذہب کی اشاعت اس مذہب کی اشاعت بغداد سے ہوئی شروع میں اس کو وہاں غلبہ بھی حاصل تھا، پھر بصرہ اور عراق میں پہنچا، ساتویں صدی میں مصر کے حدود میں داخل ہوا اور قاضی عبداللہ بن محمد حجاوی نے جو ۷۳۸ھ میں عہدۂ قضا پر متمکن تھے اس کی مصر میں عام نشر و اشاعت کی، اندلس میں تیسری صدی میں ہی یہ حنبلی مذہب داخل ہو چکا تھا، بقی بن مخلد (۲۰۱-۲۷۶ھ) وہاں سے بغ

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ [2] شذرات الذہب ج ۳

Marfat.com

آئے اور امام صاحب سے براہ راست اس کی تحصیل کی اور اندلس واپس جاکر جامع قرطبہ میں اس مذہب کا درس دینا شروع کیا، بشاری مقدسی نے اقلیم اقور، جرجان، رحاب، ماوراء النہر اور سوس وغیرہ میں بھی اس کے وجود کا ذکر کیا ہے۔

اس زمانے میں آل سعود کا جو مملکت عربیہ کے سربراہ ہیں یہی مذہب ہے اور سارے بلاد نجد وحجاز میں یہ سرکاری مذہب کی حیثیت سے مروّج ہے۔

مذہب حنبلی کے متعلق بعض شکوک و اعتراضات امام احمد کے مذہب و مسلک پر جو شکوک عائد کئے جاتے ہیں ان کی مختصر وضاحت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

اتباع کی قلت حنبلی مذہب کے متبعین ہر زمانہ میں کم رہے اور مذاہب ثلاثہ کے مقابلے میں اس کو زیادہ فروغ نہیں نصیب ہو سکا خود حنابلہ کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ ان کا ایک شاعر معترضین کے جواب میں کہتا ہے:

یقولون لی قد قل یتبعۃ احمد	وقل قلیل فی الانام مسئیل
فقلت لھم مھلا غلطتم بزعمکم	الم تعلموا ان الکرام قلیل
وماضرنا انا قلیل وجارنا	عزیز وجار الاکثرین ذلیل[1]

"لوگ کہتے ہیں کہ امام احمد کے متبعین کی تعداد کم ہے اور جو گروہ کم ہوتا ہے اس کو حقیر سمجھا جاتا ہے میں نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ تم توقف سے کام لو تمہاری رائے صحیح نہیں ہے، کیونکہ شرفاء کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے، ہمیں اپنی قلت تعداد کا غم نہیں اور نہ اس سے ہم کو نقصان پہنچ سکتا ہے اس لئے کہ ہمارے پڑوسی غالب اور مقتدر لوگ ہیں جبکہ ان لوگوں کے جن کی تعداد زیادہ ہے پڑوسی ذلیل و خوار ہیں"

اس جواب میں شاعرانہ تعلّی اور مبالغہ زیادہ ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ تعداد کی قلت و کثرت معیار نہیں ہوا کرتی یہاں تک کہ میدانِ کارزار میں بھی صرف کثرت تعداد موثر نہیں ثابت ہوتی اس لئے نہ تو اس کو حق و انصاف کا معیار بنایا جا سکتا ہے اور نہ وہ فی نفسہٖ فخر و مباہات کی کوئی چیز ہے، علامہ ابن خلدون

---

[1] احسن التقاسیم والدیباج المذہب و مقدمہ ابن خلدون و حسن المحاضرہ ج ۲ و اتحاف النبلاء و دائرۃ المعارف (ریحانۃ الادب) ابی

Marfat.com

نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ "اس مذہب کو فقہی بصیرت اور اجتہادی شان سے کم سروکار ہے، مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ عام لوگ نہ تو کسی چیز کو اس کی صحت یا خوبیوں کی بنا پر قبول کرتے ہیں اور نہ غور و فکر کے بعد اس کو اختیار کرتے ہیں، ان کا ردّ و قبول عموماً پروپیگنڈہ، وقتی سیاست اور بعض اجتماعی عوامل و اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، ذیل میں اس کے چند وجوہ درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) حقیقت یہ ہے کہ یہ مذہب شاہانہ سرپرستی سے اکثر محروم رہا کیونکہ امام احمد اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر کبھی دنیوی اعزاز و وجاہت کے طالب نہیں ہوئے بلکہ وہ ہمیشہ امراء و سلاطین کے درباروں سے کنارہ کش رہے، ان کے پیرو بھی ان کی تقلید میں جاہ و منصب اور سلاطین کے دربار سے بے تعلق رہے، یہ چیز حنبلی مذہب کے ارتقاء و اشتہار میں بڑی حد تک مانع ثابت ہوئی۔

(۲) مذاہب اربعہ میں یہ سب سے متاخر ہے اس کی داغ بیل پڑنے سے پہلے ہی دوسرے مذاہب عوام میں مشہور و مقبول اور مختلف ملکوں میں پھیل چکے تھے ان کی شہرت کے سامنے اس وقت کے دوسرے اجتہادی مذاہب کا جو بعد میں بالکل معدوم ہو گئے چراغ ٹمٹمانے لگا تھا، ان حالات میں کسی نئے مذہب کا لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لینا حیرت انگیز ہے، اس حقیقت سے حنبلی مذہب کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس نے مذاہب ثلاثہ کی شہرت و ہمہ گیری کے باوجود نہ صرف اپنے کو باقی رکھا بلکہ ایک حد تک خود بھی عوامی اور ہمہ گیر مذہب بن گیا۔

(۳) امام احمد اپنی فقہ و افتا کی نقل و تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے اور انہوں نے شروع میں بڑی سختی کے ساتھ لوگوں کو اس کی ممانعت کر دی تھی، اس بنا پر بھی ان کے مذہب کی ترقی و اشاعت میں رکاوٹ پیش آئی۔

گو حنبلی مذہب کے متبعین کی تعداد ہمیشہ کم رہی تاہم وہ خواص کا مرکز توجہ رہا ہے۔ نواب صدیق حسن خان صاحب فرماتے ہیں۔

"چنداں مجتہدین کہ در طریقۂ او برخاستند در ہیچ مذہب معلوم نیست و اگر ہیچ کسے نباشد مگر ابن تیمیہ و ابن قیم او برائے موازنہ با تمام علمائے زماں و اہل سلوک جہاں کفایت است

Marfat.com

شیخ ابو زہرہ بھی اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں "بیشک خواص کا جہاں تک تعلق ہے ان کی کثرت نہیں ملے گی اور اس مذہب کے لئے صرف ابن تیمیہ اور ابن قیم کا وجود کافی ہے"[1]

کثرت وتعددِ اقوال فقہ حنبلی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس میں اختلافِ روایات اور کثرتِ اقوال بہت ہیں بلکہ بعض مسائل میں متضاد اقوال تک منقول ہیں حالانکہ کثرت وتعددِ اقوال سے کوئی مذہب بھی خالی نہیں اور اس کو ائمہ کی حق پرستی اور اخلاص کا ثبوت سمجھا جاتا ہے، امام صاحب سے ایک ہی مسئلہ میں کثرتِ اقوال کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے زہد واتقار کی وجہ سے کوئی بات علم و ثبوت کے بغیر نہیں فرماتے تھے لیکن لوگوں کے اصرار اور کثرتِ سوال سے مجبور ہو کر بعض اوقات تردد کی حالت میں ان کو فتویٰ دینا پڑ جاتا تھا اس لئے جب اس کے خلاف صحیح قول معلوم ہو جاتا تو وہ فوراً اپنے اقوال سے رجوع کر لیتے تھے اسی طرح صحیح حدیث اور مستند اثرِ صحابی نہ پا کر وہ ضعیف ومرسل روایت کے مطابق بھی فتویٰ دیتے تھے مگر بعد میں جب صحیح روایت اور قولِ صحابی سامنے آتا تو اپنے پہلے فتویٰ سے رجوع فرما لیتے، اس رجوع کی جن لوگوں کو اطلاع ہو جاتی تھی وہ اس کے اور جن کو اطلاع نہیں ہوتی وہ پہلے ہی قول کے مطابق امام صاحبؒ کا مسلک بیان کرتے تھے۔

(۲) بعض مسائل میں خود روایات اور اقوالِ صحابہ بھی مختلف ہوتے ہیں جو اگر قوت وصحت کے لحاظ سے یکساں ہوتے اور ان میں ترجیح کی کوئی خاص وجہ نہ معلوم ہوتی تو عام فقہا کے برخلاف امام صاحب خود بھی مسئلہ کو دو قولوں پر چھوڑ دیتے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے روادار نہ ہوتے۔

قیاس سے عدم تعلق بعض لوگوں کے نزدیک اس مذہب کو قیاس سے بہت کم سروکار ہے، اس غلط فہمی کی اصل وجہ تو یہی ہے کہ امام صاحب، نصوص، آثار، اخبارِ احاد، مراسیل اور ضعیف روایات بلکہ تابعین اور ائمہ عظام کے اقوال کی موجودگی میں بھی قیاس کرنے کی شدید مخالف تھے اور وہ شدتِ احتیاط وتورع کی بنا پر فرضی اور تقدیری مسائل میں بھی بلا ضرورت قیاس

---

[1] احمد بن حنبل ترجمہ اردو۔

کرنے کو ناپسند اور احتیاط و تقویٰ کے منافی سمجھتے تھے، اس لئے عام مذاہب فقہ کے مقابلے میں اس حیثیت سے اس کو واقعی قیاس سے زیادہ سروکار نہیں ہے کیونکہ امام احمد کے نزدیک کسی حدیث کو چاہے وہ خبر واحد ہی کیوں نہ ہو قیاس سے رد نہیں کیا جا سکتا، ان کا اور ان کے متبعین کا خیال ہے کہ قیاسِ صحیح، حدیث کے معارض نہیں ہو سکتا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ نے رسالۃ القیاس فی الشرع الاسلامی میں متعدد ایسے مسائل پر جنہیں خلافِ قیاس کہا جاتا ہے حالانکہ وہ احادیث سے ثابت ہیں بحث کر کے دکھایا ہے کہ وہ عین قیاس کے مطابق ہیں، حافظ ابن قیم کی کتابوں میں بھی اس پر مفصل بحثیں موجود ہیں۔

تشدد اور مذہب حنبلی بعض مسائل میں حنبلی مذہب کی سخت گیری اور تشدد کو بھی موردِ طعن بنایا جاتا ہے، لیکن اصل میں اس کا سبب یہ ہے کہ امام صاحب اتباعِ سنت کے جذبے سے سرشار تھے اس لئے نہ تو وہ دین و شریعت کے خلاف کوئی بات کہنے سننے کے روادار ہوتے تھے اور نہ کسی حال میں احادیث و آثارِ صحابہ سے دستبردار ہونے کو پسند کرتے تھے، جن چیزوں کو معمولی سمجھا جاتا ہے، ان میں بھی وہ بڑی سختی اور پوری احتیاط برتتے تھے، عام حنابلہ نے بھی آپ کے اتباع میں اس سختی اور شدت کو روا رکھا، بلکہ بعض لوگ تو زہد و تقشف میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے عوام پر بھی سختی کا دروازہ کھول دیا، جس کے نتیجہ میں ایک زمانہ میں بڑی شورش اور ہیجان برپا ہو گیا تھا، علامہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں ۳۲۳ھ کے واقعات میں اس کا تذکرہ کیا ہے، لیکن حنابلہ کی اس سختی اور شدت کا امام صاحب سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے کیونکہ وہ زیادہ تر اپنی ہی ذات کے لئے سختی کو روا رکھتے تھے اور کمالِ زہد کی وجہ سے عبادات اور مشروعات میں اپنی طرح دوسروں کے لئے بھی پسند فرماتے تھے کہ وہ احتیاط اور تورع کو اپنا شعار بنائیں۔ ظاہر ہے ان امور میں اعتدال کے ساتھ شدت و تصلب اختیار کرنا مذموم نہیں ہے، البتہ عام لوگ اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کی وجہ سے افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔

لیکن عبادات اور محظورات سے قطع نظر عقود و شروط اور غیر منصوص امور کی حلت و اباحت

Marfat.com

میں امام صاحب بڑے رواداد اور توسع پسند تھے اور دوسرے فقہا کی طرح ان کے یہاں ان چیزوں میں زیادہ شدت اور تنگی نہیں پائی جاتی۔

تصنیفات

امام صاحب کی جانب کئی تصنیفات منسوب ہیں جن میں چند کے علاوہ سب ناپید ہیں۔

(۱) **کتاب الصلوٰۃ:** یہ مختصر رسالہ پہلی مرتبہ ہندوستان سے بیالیس صفحات میں ۱۳۱۱ھ میں امام احمد کے ایک مکتوب کے ساتھ جو مسدد بن مسرہد کے نام ہے شائع ہوا تھا، دوسری مرتبہ ۱۳۲۶ھ میں علامہ ابن قیم کے رسالہ کتاب الصلوٰۃ واحکام تارکہا کے ساتھ مطبع محمد علی صبیح مصر میں چھپا اس میں مسنون اور صحیح طریقۂ نماز کی وضاحت کی گئی ہے اور متابعتِ امام کی اہمیت بیان کی گئی ہے رکوع وسجود اور دوسرے ارکان میں امام پر مقتدی کے سبقت کرنے کے متعلق جو ممانعت اور وعیدیں حدیثوں میں مذکور ہیں ان کو جمع کرکے ان کی تشریح کی گئی ہے۔

(۲) **کتاب الزہد۔** مسند کے بعد امام صاحب کی یہ دوسری اہم کتاب ہے۔ علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں "جن لوگوں نے زہد ورقاق کے متعلق حدیثیں جمع کی ہیں ان میں عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد بڑی اہم ہے لیکن اس میں کمزور اور واہی روایتیں بھی ہیں، سب سے عمدہ امام احمد کی کتاب ہے جس کی ترتیب ناموں پر ہے۔ حافظ ابن کثیر بیان کرتے ہیں کہ "اس موضوع پر متقدمین اور متاخرین علماء میں سے کسی کی کتاب بھی اس کے ہم پایہ نہیں ہے" علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ "یہ مسند کے ثلث کے بقدر ہے اور اس کی متعدد حدیثیں اور آثار مسند احمد میں نہیں ہیں" اس کا ایک قلمی نسخہ برلین میں ہے، امام احمد کی کتاب الزہد کا ایک حصہ مختصر کتاب الزہد کے نام سے حجاز سے شائع ہوگیا ہے" آپ کے صاحبزادہ عبداللہ نے اس کے زوائد تحریر کئے تھے[۱]

(۳) **کتاب التفسیر**

---

[۱] کشف الظنون ج ۲، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ و تعجیل المنفعۃ والرسالۃ المستطرفہ۔

(۴) **کتاب السنۃ** ۔ اس کا مخطوطہ برلین میں موجود ہے[1] اور غالباً طبع بھی ہو چکی ہے ۔

دوسری کتابوں اور رسائل کے نام یہ ہیں، کتاب طاعۃ الرسول، کتاب الایمان، کتاب الاعتقاد کتاب الناسخ والمنسوخ، المقدم والموخر فی کتاب اللہ، کتاب الفرائض، کتاب الفضائل، فضائل الصحابہ فضائل ابوبکر، فضائل حسنین، مناقب علی، کتاب المسائل، کتاب المناسک، کتاب العلل، کتاب التاریخ کتاب الاشربہ، کتاب الرد علی الجہمیہ، کتاب الرد علی من ادعی تناقض القرآن، کتاب الرد علی الزنادقہ[2]

ان مستقل تصنیفات کے علاوہ امام صاحب کے فتاویٰ اور مسائل کو بھی خلال نے جامع کبیر میں جمع کیا ہے ۔

مسند احمد بن حنبل امام صاحب کی سب سے مشہور اور حدیث کی اہم ترین کتاب ہے، امام صاحب سے پہلے بھی اس طرح کی کتابیں لکھی گئیں اور بعد میں بھی، لیکن کسی مجموعۂ مسانید کو اس قدر شہرت و مقبولیت اور اعتبار و استناد نصیب نہیں ہوا، اس میں عام کتب مسانید کی طرح صحابہ کی ترتیب پر حدیثیں مرتب کی گئی ہیں، ترتیب میں زیادہ تر سبقت فی الاسلام کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن اس اصول کا ہر جگہ التزام نہیں کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ترتیب میں بہت سی غلطیاں ہو گئی ہیں مثلاً مدنیوں کی روایات شامیوں میں اور شامیوں کی مدنیوں میں شامل کر دی گئی ہیں[3]۔

مسند کے اجزا اور حدیثوں کی تعداد مسند احمد تقریباً ایک سو ہجر اجزاء پر مشتمل ہے اور سات سو صحابہ کی حدیثوں کا مجموعہ ہے جن کی تعداد عام طور سے تیس اور چالیس ہزار بتائی جاتی ہے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مسند کی اصل روایات تو تیس ہزار ہیں باقی دس ہزار کے قریب زوائدِ عبداللہ ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ مکررات کے ساتھ چالیس ہزار اور حذفِ مکررات کے بعد تیس ہزار حدیثیں ہیں[4]۔

مسند کے مرویات کی قسمیں مسند کی حدیثوں کی چھ قسمیں ہیں ۔

(۱) وہ حدیثیں جن کو امام صاحب کے فرزند عبداللہ ان کے حوالے سے بیان کرتے ہیں یہی اصل مسند احمد

۱؎ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ۲؎ الفہرست ۳؎ بستان المحدثین ۴؎ ایضاً

ہے، اس قسم کی روایتیں تین چوتھائی بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔

(۲) وہ روایتیں جو عبداللہ نے آپ سے اور آپ کے علاوہ دوسرے محدثین سے روایت کی ہیں، اس طرح کی روایات بہت کم ہیں۔

(۳) وہ حدیثیں جن کو عبداللہ نے آپ کے بجائے دوسرے شیوخ سے نقل کیا ہے، اس طرح کی حدیثوں کو زوائد عبداللہ کہتے ہیں، ان کی تعداد پہلی قسم سے کم مگر اور قسموں سے زیادہ ہے۔

(۴) وہ روایتیں جن کو عبداللہ نے امام صاحب سے تو سُنا لیکن آپ کے سامنے ان کی قرأت نہیں کی تھی، اس قسم کی روایتیں بھی بہت کم ہیں۔

(۵) ایسی حدیثیں جن کو انہوں نے نہ تو امام صاحب سے سُنا اور نہ آپ کے سامنے پڑھا بلکہ آپ کی کتاب یا کسی تحریر سے ان کو نقل کیا ہے، اس قسم کی حدیثیں بھی کم ہیں۔

(۶) ابوبکر قطیعی کے زیادات جن کو انہوں نے عبداللہ اور امام احمد کی بجائے کسی اور محدث سے روایت کیا ہے، اس طرح کی روایتیں بہت کم ہیں[۱]۔

امام صاحب کے مسند اور زوائد کا فرق بیان کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ "زوائد میں ضعیف اور موضوع روایتیں بھی شامل ہو گئی ہیں جن کو ناواقف لوگ امام احمد ہی کی جانب منسوب کرتے ہیں۔"

مسند کی تالیف میں احتیاط امام صاحب نے مسند کی ترتیب و تالیف میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے ان کا خود بیان ہے کہ انہوں نے اس کو ساڑھے سات لاکھ سے زائد حدیثوں سے منتخب و مرتب کیا تھا، علماء فن کا بیان ہے کہ انہوں نے مسند کی تدوین میں صحیح احادیث کی تخریج اپنے اوپر لازم کر لی تھی، ابو موسیٰ مدینی کا بیان ہے کہ امام احمد نے مسند میں ان ہی لوگوں سے روایتیں نقل کی ہیں جن کی صداقت و دیانت مسلم تھی مطعون لوگوں کی روایات نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ امام صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو لوگوں کے لئے امام و حجت بنایا ہے

---

[۱] الفتح الربانی۔

تاکہ اختلاف کے وقت وہ اس کی جانب رجوع کر سکیں، اگر اس میں ان کو کوئی حدیث مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ کسی ایسی حدیث کو صحیح نہ تسلیم کریں جو اس میں موجود نہ ہو[1]۔

امام صاحب کی احتیاط کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ مسند کے مسودہ میں کانٹ چھانٹ اور حذف و ترمیم کرتے رہتے تھے اور اپنے بے نظیر حافظہ کے باوجود وہ محض اپنی یادداشت سے کوئی حدیث بیان کرنا احتیاط کے خلاف سمجھتے تھے، علی بن مدینی کا بیان ہے کہ ہمارے رفقا میں امام احمد سے بڑا کوئی حافظ نہ تھا، لیکن وہ کتاب سے حدیثیں بیان کرتے تھے اور ہم کو بھی تاکید کرتے تھے کہ جب حدیثیں بیان کریں تو کتاب کو پیش نظر رکھیں[2]؛ ابراہیم بن خالد بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ امام احمد کی مجلسوں میں حدیثیں یاد کرتے اور ان پر بحث و مذاکرہ کرتے لیکن ان کو قلمبند کرنا چاہتے تو وہ جھپٹ کر کتاب لاتے اور فرماتے کہ کتاب بہترین یادداشت ہے[3]۔

فرط احتیاط کی بنا پر کوئی ایسی حدیث نہیں بیان کرتے جو صرف ایک ہی سند سے مذکور ہو تاآنکہ اس کی نظیر نہ مل جائے۔ احادیث فضائل وغیرہ میں کچھ نرمی گوارہ بھی کر لیتے تھے لیکن احکام و حدود کی روایتوں میں ذرا بھی تساہل گوارا نہیں تھا فرماتے ہیں "فضائل اعمال اور ان کی ترغیب و جزا وغیرہ سے متعلق اگر کوئی حدیث ہم کو معلوم ہوتی ہے تو اس میں زیادہ شدت سے کام نہیں لیتے لیکن حدود، کفارات اور فرائض وغیرہ سے متعلق روایتوں میں بڑی چھان بین اور پوری سختی اور احتیاط برتتے ہیں[4]"۔

مسند کی اہمیت اور کتب حدیث میں اس کا درجہ گو محدثین کے نزدیک مسانید کا درجہ سنن سے کمتر ہے، لیکن مسند احمد کی حیثیت عام مسانید سے مختلف ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو دوسرے درجہ کی کتابوں یعنی سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور مجتبیٰ النسائی کے لگ بھگ اور تیسرے درجہ کی کتابوں سے جس میں عام جوامع و مسانید شامل ہیں اس کو اہم اور ممتاز قرار دیا ہے۔"

---

[1] طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ و معجم المصنفین ج ۲ و کشف الظنون و حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ [2] تاریخ ابن عساکر ج ۲، تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ قسم اول، الطبقات الکبریٰ شعرانی ج ۱، شذرات الذہب ج ۲۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "مسند احمد کی حدیثوں کی نوعیت عام کتب مسانید سے مختلف ہے"، ابوالحسن علی بن احمد ہیثمی لکھتے ہیں کہ "وہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور بہتر ہے۔"[1]

مسند احمد کا شمار ان اہم اور امہات کتب میں ہوتا ہے جن پر ملتِ اسلامیہ کا ہمیشہ اعتماد و اعتبار رہا ہے اور جن سے محدثین نے ہر زمانہ میں اخذ و استفادہ کیا ہے، علامہ سبکی فرماتے ہیں "وہ اس امت کی اساسی اور بنیادی کتابوں میں ہے۔" ابوموسیٰ مدینی کا بیان ہے کہ "مسند ایک اہم اصل اور محدثین کے لئے قابلِ وثوق مرجع ہے۔" مسند کے بارہ میں عام فیصلہ یہ ہے کہ "کتب صحاح ستہ بشمول موطا امام مالک اور مسند احمد اصل دار و مدار اور اعتماد کی چیزیں اور روز روشن کی طرح نمایاں اور مشہور ہیں۔"

صحت و جودت کے لحاظ سے بھی مسند کی اہمیت کم نہیں ہے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں "مسند کے زوائدِ صحیحین، ترمذی اور ابوداؤد کے زوائدِ صحیحین کے مقابلہ میں کم ضعیف ہیں، اس کی ہر روایت مقبول اور ضعیف روایتیں بھی حسن سے قریب تر ہیں۔" احمد عبدالرحمٰن بناساعاتی نے لکھا ہے کہ "امام احمد کا قابلِ تعریف کارنامہ اور امت پر زبردست احسان یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کے لئے مسند جیسی مشہور کتاب کی تخریج کی جس کی اہمیت کا ہر زمانہ کے محدثین نے اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ صحیحین کے بعد تمام کتب احادیث میں سب سے زیادہ صحیح حدیثوں کی جامع ہے۔"[2]

خصوصیات

(۱) مسند احمد کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ حدیث کی اہم، معتبر اور صحیح کتابوں میں ہے۔

(۲) مسند سے بڑا اور ضخیم کوئی مجموعۂ حدیث نہیں، حافظ ابن کثیر، ابوبکر ہیثمی اور علامہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ اس سے زیادہ حدیثیں کسی کتاب میں نہیں ہیں۔

(۳) احادیث کے دوسرے مجموعوں میں جو روایات متفرق طور پر پائی جاتی ہیں، ان کا اکثر حصہ اس میں موجود ہے اس لحاظ سے وہ حدیث کی سب سے زیادہ جامع کتاب ہے۔ ایک مرتبہ ابوالحسن

---

[1] التنقیح فی اصول الحدیث و حجۃ اللہ البالغہ اور تدریب الراوی [2] الفتح الربانی۔

یونینی سے دریافت کیا گیا کہ کیا ان کو صحاح ستہ زبانی یاد ہیں، انہوں نے کہا یاد بھی ہیں اور نہیں بھی، لوگوں نے پوچھا یہ کیسے؟ فرمایا کہ مجھ کو مسند احمد بن حنبل یاد ہے جس میں چند کے علاوہ صحاح کی تمام حدیثوں کی اصل موجود ہے اس اعتبار سے گویا میں ان کا بھی حافظ ہوں، بعض علماء کا بیان ہے کہ "اگر کسی کو تمام کتابوں کی جامع کوئی ایسی کتاب مطلوب ہو جس کا مصنف بھی عظیم و برتر ہو تو اسے مسند احمد کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔"[1]

(۴) مسند کا تصنیفی حسن، اخبار و روایات کا تناسب اور بہتر انتخاب بھی اس کی ایک خصوصیت ہے اہل نظر اور مبصرین کا خیال ہے کہ وضع و تالیف کے لحاظ سے وہ بے مثال کتاب ہے۔ علامہ ابن حجر نے علامہ ابن صلاح کا جواب دیتے ہوئے مسند کی اس خصوصیت کا تذکرہ کیا ہے اور ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حسن بیان و سیاق کے لحاظ سے کوئی کتاب اس کے برابر نہیں۔

(۵) مسند میں تین سو ثلاثی حدیثیں ہیں۔

(۶) عام کتابوں کی جملہ خصوصیات بھی اس میں موجود ہیں۔

زمانۂ تصنیف | امام صاحب مسند کی جمع و تدوین میں اسی وقت سے مصروف ہو گئے تھے جب انہوں نے علم حدیث کی طلب و تکمیل شروع کی تھی اور عمر بھر اس میں مشغول اور حذف و اضافہ کرتے رہے۔ صاحب المنہج نے لکھا ہے کہ ۱۸۰ھ میں مسند کی تالیف شروع کر دی تھی اور شمس الدین جزری فرماتے ہیں کہ باقاعدہ تکمیل سے پہلے ہی انتقال فرما گئے تھے۔[2]

تہذیب و تنقیح | مسند کو امام صاحب نے مسودہ کی صورت میں چھوڑا تھا اس لئے آپ کے بعد آپ کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ نے اس میں بعض اضافے کر کے اس کی باقاعدہ تہذیب و تنقیح کی۔ علامہ شمس الدین جزری کا بیان ہے "امام احمد نے مسند کو جمع کرنا شروع کیا اور اس کو الگ

---

[1] حواشی سعدی و مقدمہ تحفۃ الاحوذی [2] احمد بن حنبل لابی زہرہ بحوالہ المنہج جزء اول

الگ ورقوں میں لکھ کر جدا جدا اجزا میں تقسیم کیا مگر اس کی تکمیل سے پہلے ہی انتقال فرما گئے البتہ آخر عمر میں انہوں نے اپنی اولاد اور گھر والوں کو جمع کر کے اس کو سنا دیا تھا، آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادہ نے اس کو مرتب کیا اور مسند کی روایات کے مشابہ و مماثل مسموعات بھی اس میں شامل کر دیئے یہ مسند کا موجودہ متداول نسخہ عبداللہ ہی کا مرتب کیا ہوا ہے لیکن اس کی فروگذاشتوں کی بنا پر بعض لوگوں نے اس کو از سر نو مرتب کیا۔ اصفہان کے بعض محدثین نے اس کو ابواب پر ترتیب دیا تھا مگر یہ نسخہ معدوم ہے، حافظ ناصر الدین نے بھی ابواب پر مرتب کیا تھا مگر دمشق میں حادثہ تیمور کے وقت ان کا نسخہ ضائع ہو گیا، ابوبکر محمد بن عبداللہ بن محی الدین صامت نے حروف معجم پر مرتب کیا تھا۔ حال ہی میں مصر کے ایک فاضل احمد عبدالرحمٰن البنا ساعاتی نے الفتح الربانی کے نام سے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے۔ حاشیہ بیان ہی کے قلم سے بلوغ الامانی کے نام سے اس کی شرح بھی ہے اس کی پانچ جلدیں ۱۳۵۳ھ میں شائع ہوئی تھیں اس میں مکررات کو حذف کر دیا گیا ہے، ربوہ سے بھی ابھی حال ہی میں ایک جلد شرح و تعلیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

شروح وحواشی | مسند کے شروح، تعلیقات اور مختصرات کے نام یہ ہیں:

(۱) **شرح مسند**۔ یہ علامہ ابوالحسن بن عبدالہادی سندی (م ۱۱۳۸ھ) کی ضخیم شرح ہے۔

(۲) **الدر المنتقد**۔ یہ مسند کا مختصر اور شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن (م ۸۰۵ھ) اور شیخ زین الدین عمر بن احمد شماع حلبی کی تالیف ہے۔

(۳) **عقود الزبرجد**۔ یہ تعلیق علامہ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے حروف معجم پر مرتب کی ہے۔

(۴) **غرائب مسند**۔ ابو عمر محمد بن عبدالواحد (م ۳۴۵ھ) کی تالیف ہے۔

(۵) **مجمع الزوائد و منبع الفوائد**۔ ابوالحسن علی بن ابوبکر ہیثمی (م ۸۰۷ھ) نے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے جو چھ جلدوں پر مشتمل اور امام احمد، بزار، ابویعلی موصلی کے مسانید اور طبرانی کے معاجم ثلاثہ کی ان حدیثوں کا مجموعہ ہے جو صحاح میں شامل نہیں ہیں، اس کے بعض اجزاء

لہ بستان المحدثین و بلوغ الامانی، ابن ماجہ اور علم حدیث بحوالہ المسند الامام احمد

کے قلمی نسخے دار الکتب المصریہ میں موجود ہیں، نواب صدیق حسن خان صاحب نے ایک جز ۱۳۰۶ھ میں دو سو اٹھاسی صفحات میں ایک مقدمہ کے ساتھ دہلی سے شائع کیا تھا۔

(۶) **جامع المسانید**۔ اس کو علامہ ابن کثیر نے آٹھ جلدوں میں مرتب کیا ہے اور اس میں مسند احمد، مسند بزار، مسند ابو یعلیٰ، طبرانی کی معجم کبیر اور صحاح کی حدیثیں شامل کی ہیں، اس کے دو قلمی نسخے دار الکتب المصریہ اور کوبرلی وغیرہ میں ہیں۔

(۷) **جامع المسانید والالقاب بالخص الاسانید**۔ اس میں علامہ ابن جوزی نے صحیحین ترمذی اور مسند احمد کی حدیثیں سات جلدوں میں مسانید پر مرتب کی ہیں۔

(۸) **اطراف المسند المعتلی باطراف المسند الحنبلی**۔ یہ حافظ ابن حجر کی تالیف اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۹) **جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد**۔ صحاح کے علاوہ احمد، دارمی، ابو یعلیٰ، بزار کے مسانید اور طبرانی کے معاجم ثلاثہ کی روایتوں پر مشتمل ہے اور ابو عبید اللہ محمد بن سلیمان مغربی متوفی ۱۰۹۴ھ کی تالیف ہے۔

(۱۰) **منتقی الاخبار فی الاحکام**۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے کتب صحاح اور مسند احمد کی حدیثوں کا اس میں انتخاب کیا ہے۔ علامہ شوکانی نے نیل الاوطار کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے۔[1]

(۱۱) **ثلاثیات مسند**۔ محب الدین وضیاء الدین مقدسی نے اس میں مسند کی ثلاثی روایتوں کی تخریج کی ہے، شمس الدین سفارینی حنبلی نے اس کی شرح لکھی ہے۔ اصل اور شرح پہلی مرتبہ مکتب اسلامی دمشق سے ۱۳۸۰ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۱۲) **فہرست رجال مسند**۔ مولانا نجم الدین اور مولانا نور الحق نے رجالِ مسند کی ایک مفصل اور جامع فہرست اردو میں مرتب کی ہے جو رسالہ اورنٹیل کالج لاہور میں چھپ چکی ہے۔

---

[1] کشف الظنون ج دوم وجلد اول وبلوغ الامانی وبستان المحدثین الرسالۃ المستطرفہ، مقدمہ تحفۃ الاحوذی، مفتاح السنۃ و معجم المطبوعات ج ۲ کالم فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱۔

Marfat.com

مسند پر بعض اعتراضات مسند پر اعتراضات بھی کیے گئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) مسند میں مکررات ہیں، لیکن درحقیقت یہ کوئی عیب نہیں بلکہ ایک طرح کی خوبی ہے کیونکہ تکرار کا مقصد کثرتِ اسناد، تعددِ طرق، اختلافِ متن اور متابعات وغیرہ کو ظاہر کرنا ہے، محدثین ایک ہی حدیث کو ایک صحابی سے متعدد طرق اور مختلف الفاظ کے ساتھ صرف اس لیے روایت کرتے ہیں کہ احادیث کا استقصاء و احاطہ بھی ہو جائے اور وہ محفوظ و مدون بھی ہو جائیں اسی لیے صحیحین اور جملہ کتب معتبرہ میں بھی بکثرت مکررات پائے جاتے ہیں اور مسانید میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں نقل کیے جانے کی وجہ سے تکرار ناگزیر بھی ہے۔

(۲) بعض صحیح روایتیں مسند میں نہیں ہیں یعنی ایسی متعدد حدیثیں جو صحیحین اور کتب معتبرہ میں پائی جاتی ہیں، مسند میں نہیں ہیں، حالانکہ امام صاحب کا دعویٰ ہے کہ اس میں جملہ صحیح احادیث درج ہیں، اگر اس دعویٰ کی نسبت امام صاحب کی جانب صحیح ہے تو غالباً اس زمانہ میں وضع حدیث کے عام فتنہ کے پیش نظر آپ نے ایسا فرمایا ہوگا تاکہ لوگ غلط روایتوں اور وضعی حدیثوں سے محتاط رہیں، دوسرے امام صاحب نے اپنے مقدور بھر مسند میں صحت کا پورا اہتمام ملحوظ رکھا تھا اس لیے ان کے علم و یقین میں ان کا یہ دعوے بالکل صحیح تھا، لیکن اس سے یہ ضروری نہیں ہے کہ مسند حقیقتاً تمام صحیح حدیثوں کی جامع ہو، تیسرے اکثر صحیح حدیثوں کی اصل فی الواقع اس میں موجود ہے۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ "امام صاحب کا ارشاد غالب احوال کے لحاظ سے ہے ورنہ صحیحین سنن اور اجزاء وغیرہ میں بہت سی قوی حدیثیں ایسی ہیں جو مسند میں نہیں ہیں، شمس الدین جزری کا بیان ہے کہ اس سے مقصود حدیثوں کی اصل ہے اور یہ بالکل درست ہے اس لیے کہ غالباً کوئی حدیث ایسی نہیں ملے گی جس کی اصل مسند میں موجود نہ ہو۔ شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ "امام صاحب کی مراد ان حدیثوں سے ہے جو شہرت و تواتر کے درجہ تک نہیں پہنچی ہیں، ورنہ بہت سی مشہور اور صحیح حدیثیں ان کی مسند میں نہیں ہیں"[1]

---

[1] ابن ماجہ اور علم حدیث بحوالہ المصعد الاحمد، بستان المحدثین

Marfat.com

(۳) ضعیف حدیثیں۔ ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ مسند میں ضعیف روایات بھی ہیں محققین علماء نے اس کو تسلیم کیا ہے اس لئے جو لوگ مطلقاً مسند کی صحت کے مدعی ہیں ان کا خیال درست نہیں، اس کا بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ امام صاحب عمر بھر مسند کے مسودہ میں ترمیم فرماتے رہے، وہ ضعیف و غریب روایتیں متابعت، تعدد طرق اور دوسری روایتوں کی تائید کے لئے نقل کرتے تھے، اس لئے مسند ضعیف روایتوں سے خالی نہیں لیکن اتنے ضخیم مجموعہ میں اگر کچھ ضعیف حدیثیں شامل بھی ہوں تو ان سے اس کی صحت و شہرت میں فرق نہیں آتا۔ مجموعی طور پر وہ ایک مستند اور اہم کتاب ہے۔ ضعیف و غریب روایتوں سے حدیث کی کون کتاب خالی ہے۔ ابن تیمیہ جیسے شخص کو یہ تسلیم ہے کہ "صحیحین کی بعض حدیثوں میں اس قسم کے الفاظ آگئے ہیں جو ضعف سے خالی نہیں[1]"

(۴) موضوع حدیثیں۔ مسند میں بعض موضوع حدیثیں بھی بتائی جاتی ہیں لیکن عام علمائے فن نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ ابن حجر نے القول المسدد میں اور سیوطی نے الذیل الممہد میں ان تمام روایتوں کا جن کو موضوع بتایا جاتا ہے پوری تحقیق سے جائزہ لیا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:-

"ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ مسند میں موضوع روایتیں بھی ہیں۔ ابوالفضل عراقی نے موضوعات ابن جوزی کے تتبع سے نو حدیثوں کو موضوع بتایا ہے۔ میں نے جب ابن جوزی کے بیان کا مطالعہ کیا تو موضوعات کی تعداد بیس نظر آئی، لیکن تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے اکثر حدیثیں صحیح ہیں اور ان کو موضوع قرار دینے کا فیصلہ درست نہیں، البتہ چند روایات کے بارے میں اس قسم کا شبہ ضرور ہوتا ہے لیکن غالب اور قوی احتمال ان کے بارے میں بھی مدافعت ہی کا ہے[2]"

بعض علماء نے جن میں ابن تیمیہ بھی شامل ہیں یہ تفریق کی ہے کہ عبداللہ اور قطیعی کے

---

[1] منہاج السنۃ ج ۴ [2] تعجیل المنفعۃ

Marfat.com

زوائد میں موضوع روایتیں ضرور ہیں۔ لیکن مسند کا وہ حصہ جو امام صاحب کی طرف منسوب ہے موضوع حدیثوں سے خالی ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگیا کہ جمہور علماء کے نزدیک مسند احمد بن حنبل میں موضوع حدیثیں نہیں پائی جاتیں۔

امام محمد بن یحییٰ عدنی

(متوفی ۲۴۳ھ)

نام ونسب محمد نام، ابو عبد اللہ کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: محمد بن یحییٰ بن ابو عمر۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابو عمران کے والد کی کنیت تھی مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔[۱]

وطن ان کے آباء واجداد کا اصل وطن عدن ہے لیکن انہوں نے مکہ میں مستقل بود وباش اختیار کرلی تھی۔[۲] علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ان کی پیدائش اور نشو ونما بھی یہیں ہوئی تھی،[۳] اسی وجہ عدنی اور مکی کہلاتے ہیں۔ خاندان اور سنہ ولادت کا حال نہیں معلوم ہوسکا۔

اساتذہ انہوں نے جن برگزیدہ وبلند پایہ محدثین سے کسبِ فیض کیا تھا ان میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:۔

داؤد بن عجلان، سفیان بن عیینہ، عبدالرحیم بن زید عمی، عبدالرزاق، عبدالعزیز دراوردی، عبد[الوہاب] بن عبدالصمد عمی، عبداللہ بن معاذ صنعانی، عبدالمجید بن ابی رواد، عبدالوہاب ثقفی، فرج بن سعید م[ا]ربی، فضیل بن عیاض، محمد بن یحییٰ بن قیس مازنی، مروان بن معاویہ، معن بن عیسیٰ، ولید بن م[سلم]، ہشام بن سلیمان، یحییٰ بن سلیم طائفی، یحییٰ بن عیسیٰ ارملی، یزید بن ہارون، یعقوب بن جعفر بن [ابی] کثیر اور اپنے والد یحییٰ بن ابو عمر وغیرہ سے۔

سفیان بن عیینہ کے خاص تلامذہ میں سے تھے حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ولازم ابن عیینہ

---

[۱] تقریب التہذیب [۲] تہذیب التہذیب ج ۹ [۳] ایضاً وخلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال [۴] کتاب الانساب

پہلی مرتبہ اٹھارہ سال کی عمر میں ان کے درس میں شریک ہونے کے لئے گئے تھے[1]

تلامذہ احمد بن یحییٰ عدنی کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مولفین صحاح میں امام مسلم، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے بلاواسطہ اور امام نسائی نے بالواسطہ روایتیں کی ہیں، امام بخاری نے بھی ان سے ایک حدیث تعلیقاً بیان کی ہے، دوسرے تلامذہ کے نام یہ ہیں۔

ابوحاتم، ابوزرعہ دمشقی، ابوزرعہ رازی، احمد بن عمرو خلال مکی، اسحاق بن ابراہیم بن اسماعیل نسفی، اسحاق بن احمد بن نافع خزاعی، بقی بن مخلد، ذکریا بن یحییٰ سجزی، عبداللہ بن صالح بخاری، عبداللہ بن محمد بن شیرویہ، عثمان بن خرزاذ، علی بن عبداللہ عصاریی، ابوالولید محمد بن عبداللہ ازرقی، مفضل بن محمد جندی نعیم ازدی، ہارون بن یوسف شطوی، بلال بن علاء اور ان کے فرزند عبداللہ بن محمد وغیرہ[2]۔

حفظ و ثقاہت حافظہ میں امتیاز کی وجہ سے الحافظ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن محمد حاتم اپنے والد کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ صالح الحدیث اور صدوق تھے، امام احمد نے بھی ان کو معتبر قرار دیا ہے، مسلمہ کا بیان ہے کہ لا باس بہ یعنی عدنی میں کوئی عیب نہ تھا، امام مسلم نے ان کو صدوق وحجت اور ابن حبان و ابن اثیر نے ان کو ثقہ بتایا ہے[3]۔

فضل و کمال ان کے کمال کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اکثر اصحاب صحاح نے ان کی روایتوں کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، امام مسلم نے اپنی صحیح میں ان کے واسطے سے دوسو سولہ حدیثیں ذکر کی ہیں۔ امام احمد کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب ان سے رواۃ مکہ کے بارہ میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ مکہ کے لوگوں میں ابن ابی عمر سے روایتیں کرو، علمائے طبقات کا بیان ہے کہ وصار شیخ الحرم فی زمانہ یعنی وہ اپنے زمانہ میں شیخ الحرم تھے[4]۔

عبادت و تقویٰ علم و فضل کے ساتھ بڑے عابد و زاہد اور نہایت صالح و متدین تھے اکثر طواف کعبہ میں مشغول رہتے[5]۔ تمام مورخین نے ان کے زہد و صلاح کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ و تقریب التہذیب [2] ایضاً و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و کتاب الانساب [3] تہذیب التہذیب ج ۹، خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و کتاب الانساب [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۲، تہذیب ج ۹ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔

حج حج بیت اللہ سے ستتر مرتبہ مشرف ہونے کی سعادت میسر آئی، ان کا خود بیان ہے ک
ترمرتبہ پیدل چل کر میں نے حج کیا تھا[۱]

وفات عدنی نے بڑی طویل عمر پائی اور ذی الحجہ ۲۴۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا[۲]

اولاد علمائے سیر نے ان کے تلامذہ کے تذکرہ میں ان کے ایک فرزند عبداللہ کا ذکر کیا ہے
اسی لیے ان کی کنیت ابو عبداللہ ہے۔

تصنیفات عدنی کی تصنیفات میں صرف مسند کا پتہ چلتا ہے، اس کے راوی ان کے مشہ
شاگرد اسحاق بن احمد بن نافع خزاعی تھے اس مسند کو ایک زمانہ میں بڑی شہرت تھی اور وہ اصبہ
وغیرہ میں متداول رہ چکی ہے[۳]

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و تہذیب ج ۹ [۲] ایضاً و خلاصہ تذہیب [۳] تہذیب التہذیب ج ۹ و کتاب الا

Marfat.com

امام عبد بن حمید

(متوفی ۲۴۹ھ)

نام و نسب عبد الحمید نام، ابو محمد کنیت، ایک ضعیف روایت یہ بھی ہے کہ عبد المجید نام تھا، نسب نامہ یہ ہے، عبد الحمید بن حمید بن نصر، عام طور سے وہ عبد الحمید کے بجائے صرف عبد بن حمید کہے جاتے تھے[1]۔

وطن وطن کَش یا کس ہے اور اسی کی نسبت سے وہ کَشی اور کسی مشہور ہیں، کَش جرجان کے قریب اس سے تو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کا نام ہے، محمد بن طاہر مقدسی نے لکھا ہے کہ کس کش کی تعریب ہے، لیکن ابن ماکولا کا بیان ہے کہ کَش غلط ہے، جب میں بخارٰی اور سمرقند گیا تو وہاں کے لوگ اس کو کس کہتے تھے یہ سمرقند کے قریب ایک شہر کا نام ہے عبد بن حمید اسی کی جانب منسوب ہیں بعض لوگوں نے کش کو اصبہان کا گاؤں بتایا ہے[2]۔

اساتذہ عبد بن حمید کے اساتذہ اور شیوخ میں بلند پایہ محدثین اور مقدس بزرگ شامل ہیں اس کا اندازہ اس فہرست سے ہوگا۔

احمد بن اسحاق حضرمی، جعفر بن عون، حسن اشیب، حسین بن علی جعفی، روح بن عبادہ، سعید بن عامر، عارم، عبدالرزاق، عبدالصمد بن عبدالوارث، عبداللہ بن بکر سہمی، عبیداللہ بن موسیٰ، علی بن عاصم عمر بن یونس یمامی، محمد بن بشر عبدی، محمد بن بکر برسانی، مسلم بن ابراہیم، مصعب بن مقدام، یحییٰ بن آدم۔ یزید بن ہارون، یعقوب بن ابراہیم، یعلی بن عبید، یونس بن محمد مؤدب، ابن ابی فدیک، ابو اسامہ، ابو داؤد

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۶ و شذرات الذہب ج ۲، و بستان المحدثین [2] معجم البلدان ج ۷ و کتاب الانساب مقدسی۔

حضرت، ابو داؤد طیالسی، ابو عامر عقدی، ابو عاصم، ابو النضر، ابو نعیم، ابو الولید طیالسی وغیرہ۔[1]

تلامذہ ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی وسیع ہے۔ ان میں سے اکثر کا شمار اجلہ محدثین اور ائمہ فن میں ہے بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں:۔

ابراہیم بن خریم شاسی، بکر بن مرزبان، سلیمان بن اسرائیل خجندی، سہل بن شاذویہ، شاہ بن جعفر، ابو معاذ عباس بن ادریس ملقب بخزک، عمر بن بحیر، عمر بن محمد اور آپ کے صاحبزادہ محمد بن عبد وغیرہ

صحاح ستہ کے مصنفین میں امام مسلم اور امام ترمذی نے اپنی اپنی کتابوں میں ان سے روایتیں لی ہیں اور امام بخاری نے دلائل النبوۃ میں بطریق تعلیق ان کی روایت نقل کی ہے۔[2]

طلب حدیث کی ابتداء اور سفر آغازِ شباب کے بعد ان کو تحصیل علم کا خیال اور حدیث کی طلب و جستجو کا شوق پیدا ہوا اور اس کے لیے مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا۔ گو اس کی تصریح نہیں ملتی کہ کن کن شہروں اور ملکوں میں گئے لیکن ان کے اساتذہ مختلف ملکوں اور شہروں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کا سفر کیا ہوگا۔

فضل و کمال عبد بن حمید نامور محدثین میں تھے۔ ان کی عظمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ ائمہ صحاح ستہ نے ان سے اپنی کتابوں میں روایتیں نقل کی ہیں۔ اصحاب طبقات و تراجم کا بیان ہے کہ وہ فنِ حدیث کے امام تھے۔[3]

حفظ و ثقاہت ان کے حفظ و ضبط اور ثقاہت پر علماء کا اتفاق ہے۔ علامہ ذہبی نے ان کو احفظ اور ائمہ ثقات میں بتایا ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں کہ وہ ان علمائے ثقات میں تھے جنہوں نے جمع و تصنیف کا کام کیا۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور حافظ تھے۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۶۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۶۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔ بستان المحدثین
[3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔ بستان المحدثین۔

Marfat.com

ابن عماد حنبلی کا بیان ہے کہ وہ ثقہ و ثابت تھے[1]۔ شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "شیخے ثقہ و معتبر"

وفات مشہور اور صحیح روایت کے مطابق ۲۴۹ھ[2] میں اپنے وطن کش میں انتقال کیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ۲۴۳ھ میں سنہ وفات تحریر کیا ہے، بعض لوگوں کا بیان ہے کہ دمشق میں وفات پائی لیکن عام محققین کے نزدیک ان کا دمشق میں جانا ہی ثابت نہیں ہے۔

تصنیفات عبد بن حمید کی متعدد تصنیفات ہیں مگر صرف دو کتابوں کا علمائے سیر و طبقات نے ذکر کیا ہے۔

تفسیر ابن کثیر کے بیان صاحب التفسیر الحافل سے اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "دیار عرب میں یہ تفسیر مشہور و متداول تھی" اس کے راوی ابن خریم ہیں، حافظ ابن حجر کی نظر سے اس کا ایک جز گذرا تھا[3]۔

مسند ان کی دوسری اہم کتاب مسند ہے، مسند میں ان کی دو کتابیں کبیر و صغیر تھیں، مسند صغیر دراصل کبیر کا انتخاب اور ایک جلد پر مشتمل ہے، اس میں بعض مشاہیر صحابہ کی حدیثیں درج نہیں ہیں، عبد بن حمید کے شاگرد ابراہیم بن خریم نے اس کی ان سے روایت کی ہے، اس کی ابتدا مسند ابی بکر سے ہوتی ہے[4]۔ یہ مسند ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے لیکن اس کے مخطوطے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، جرمنی کے مکتبہ جامع قرہ ین ایا صوفیہ، کوپرولیو وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کے مکتبہ سندیہ، اورینٹیل پبلک لائبریری بانکی پور اور دائرۃ المعارف العثمانیہ میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں[5]۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۶، تقریب التہذیب [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۱، بستان المحدثین، تہذیب التہذیب جلد ۶
[3] بستان المحدثین الرسالۃ المستطرفہ، تہذیب التہذیب ج ۶ [4] مقدمہ تحفۃ الاحوذی، فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ
[5] تذکرۃ النوادر مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱۔

امام اسحاق بن بہلول

(متوفی ۲۵۲ھ)

نام ونسب اسحاق نام، ابو یعقوب کنیت، نسب نامہ یہ ہے، اسحاق بن بہلول بن حسان بن سنان[1]۔

وطن، ولادت اور خاندان ان کا وطن قدیم اور مشہور شہر انبار ہے جو دریائے فرات کے کنارے بغداد سے دس فرسنگ کے فاصلہ پر واقع ہے، یہیں وہ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے، ان کا خاندانی تعلق قبیلہ تنوخ سے ہے اسی نسبت سے تنوخی اور انباری مشہور ہوئے[2]۔

اساتذہ اسحاق کو جن نامور محدثین سے شرف تلمذ حاصل ہے ان کے نام یہ ہیں۔

ابن ابی فدیک، ابواسامہ، ابو بحر بکراوی، ابو داؤد حضری، ابو عاصم نبیل، ابو عامر عقدی، ابو عبدالرحمٰن مقری، ابو معاویہ ضریر، ابو نعیم، ابو یحییٰ حمانی، اسحاق بن یوسف ازرق، اسماعیل بن علیہ، ابو ضمرہ انس بن عیاض، جعفر بن عون، حسین جعفی، سعید بن سالم قداح، سفیان بن عیینہ، شعیب بن حرب، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن داؤد خریبی، عبداللہ بن نمیر، عفان بن مسلم، علی بن عاصم، ابو قطن عمرو بن ہیثم عبیداللہ بن موسیٰ، غندر، قبیصہ بن عقبہ، محمد بن عبید، محمد بن قاسم ازدی، معاویہ بن ہشام، وکیع بن جراح، وہب بن جریر، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، یحییٰ بن آدم، یحییٰ بن سعید قطان، یعلی بن عبید اور ان کے والد بہلول وغیرہ[3]۔

تلامذہ مشہور تلامذہ حسب ذیل ہیں۔

ابراہیم حربی، ابو بکر بن ابی الدنیا، قاضی ابو عبداللہ محاملی، عبداللہ بن محمد ناجیہ، قاسم بن ذکریا

[1] تاریخ بغداد ج ۶ [2] ایضاً، واللباب ج ۱ [3] تاریخ بغداد ج ۶

سطرز، محمد بن عبدالرحیم صاعقہ، محمد بن موسیٰ نہر تیری، یحییٰ بن صاعد اور دونوں صاحبزادے احمد، بہلول اور پوتے یوسف بن یعقوب، جعفر فریابی[1] وغیرہ۔

رحلت وسفر انہوں نے علم کی جستجو اور حدیث کی طلب وتکمیل کے لئے بغداد، کوفہ، بصرہ مدینہ اور مکہ کا سفر کیا۔[2]

حفظ وثقاہت حفظ وضبط اور صدوق وثقاہت میں بڑے ممتاز تھے اسی لئے علمائے فن نے ان کو الحافظ کہا ہے، ابن صاعد کا بیان ہے کہ تقریباً پچاس ہزار حدیثیں انہوں نے زبانی بیان کیں مگر کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ خطیب اور حافظ ذہبی لکھتے ہیں دکان ثقۃ، (یعنی وہ ثقہ ومعتبر تھے)، عبدالرحمن نے اپنے والد ابو حاتم سے ان کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا وہ صدوق تھے۔[3]

نقد وتمیز حفظ وثقاہت کی طرح ان کو صحیح وغلط روایات میں امتیاز کا بھی ملکہ تھا۔ ذہبی نے ان کو الناقد لکھا ہے۔[4]

فقہ فقہ میں بھی ممتاز تھے اور اس میں کتابیں بھی لکھی ہیں، اس کی تحصیل وتکمیل حسن بن زیاد لولوی اور امام ابو یوسف کے ممتاز ترین شاگرد ہیثم بن موسیٰ سے کی تھی مگر وہ فقہائے مقلدین میں نہ تھے بلکہ مجتہد تھے اور بعض مسائل میں عام فقہاء سے منفرد رائے رکھتے تھے۔

خطیب کا بیان ہے۔

ولہ مذاھب اختارھا	بعض مسائل میں ان کے مختارات
ینفرد بھا۔	وتفردات پائے جاتے ہیں۔

قرأت قرأت کے فن سے بھی دلچسپی تھی اور اس میں بھی انہوں نے کتاب لکھی تھی۔

لغت، نحو وعربیت حدیث وفقہ کے علاوہ ان کو لغت، نحو اور شعر وادب میں

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [2] تاریخ بغداد ج ۶ [3] ایضاً الجرح ۲ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [5] تاریخ بغداد ج ۶ [6] تاریخ بغداد ج ۶

بھی دستگاہ حاصل تھی[1]۔

امامت | ان علوم میں کمال کی بناء پر ان کا شمار ائمہ فن میں ہوتا تھا۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔ وکان من کبار الائمہ (یعنی وہ اکابر ائمہ میں تھے)[2]

اخلاق وعادات | بڑے فیاض وسیر چشم تھے ان کی آمدنی وافر تھی مگر خود بقدر کفاف پر زندگی بسر کرتے تھے اور آمدنی کا بڑا حصہ غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیتے تھے[3]۔

وفات | اسحاق نے طویل عمر پائی۔ اٹھاسی سال کی عمر میں اپنے وطن انبار میں ماہ ذوالحجہ ۲۵۲ھ میں انتقال کیا، امیر انبار یحونہ بن قیس شیبانی نے نماز جنازہ پڑھائی[4]۔

اولاد | علمائے سیر نے ان کے تین صاحبزادوں احمد، بہلول، یعقوب اور ایک پوتے یوسف بن یعقوب کا ذکر کیا ہے۔

آمدنی | ان کی زندگی اطمینان وفراغت سے بسر ہوتی تھی، ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ متوکل نے میرے والد کو طلب کر کے ان سے سماع کیا اور اتنی زمین عطا کی جس کی پیداوار سے بارہ ہزار سالانہ آمدنی ہوتی تھی اس کے علاوہ پانچ ہزار درہم سالانہ مزید دفتر شاہی سے ملتا تھا[5]۔

تصنیفات | وہ کثیر التصانیف تھے، فقہ، حدیث اور قرأت کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی ان کی تصنیفات تھیں، خطیب کا بیان ہے وصنف فی غیر ذالک من انواع العلم، لیکن وہ سب معدوم ہیں، جن کتابوں کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) قرأت میں ایک کتاب کا تذکرہ کیا جاتا ہے لیکن اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

(۲) فقہ میں ان کی کتاب کا نام المتضاد تھا۔

(۳) حدیث میں ایک ضخیم مسند لکھی تھی[6]۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [3] [4] تاریخ بغداد ج ۶ [5] ایضاً تذکرہ [6] ایضاً

امام ابو محمد عبداللہ دارمی

(متوفی ۲۵۵ھ)

نام و نسب عبداللہ نام، ابو محمد کنیت، سلسلۂ نسب یہ ہے، عبداللہ بن عبدالرحمن بن فضل بن بہرام بن عبدالصمد، خزرجی نے بہرام کے بجائے مہران لکھا ہے[1]

ولادت، خاندان، وطن ۱۸۱ھ میں خراسان کے مشہور شہر سمرقند میں پیدا ہوئے، قبیلہ تمیم کی ایک شاخ دارم سے نسبی تعلق تھا، اس کی نسبت سے سمرقندی، تمیمی اور دارمی کہلائے آخری نسبت سے جو دارم بن مالک کی جانب زیادہ مشہور ہوئے[2]

اساتذہ امام دارمی کو جن نامور علماء و مشائخ سے استفادہ کا موقع میسر آیا ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:-

احمد بن اسحاق حضرمی، اسود بن عامر شاذان، اشہل بن حاتم، ابو صالح کاتب لیث بن سعد، ابوبکر حنفی، ابوالمغیرہ حمصی، ابو عاصم، ابونعیم، جعفر بن عون، حبان بن ہلال، ابوالیمان حکم بن نافع بہرانی، حیوۃ بن شریح، زکریا بن عدی، سعید بن عامر ضبعی، عبدالصمد بن عبدالوارث، عبداللہ بن موسیٰ، ابو علی عبیداللہ عبدالمجید حنفی، عثمان بن عمر بن فارس، محمد بن مبارک صوری، محمد بن یوسف فریابی، مروان بن محمد، نضر بن شمیل، وہب بن جریر، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، یحییٰ بن حسان تنیسی، یزید بن ہارون اور یعلی بن عبید وغیرہ[3]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ و تہذیب ج ۵ و خلاصہ تذہیب [2] ایضاً و کتاب الانساب [3] تاریخ بغداد ج ۱۰ و کتاب الانساب

تلامذہ ان کے تلامذہ میں بڑے نامور محدثین اور ائمۂ فن شامل ہیں۔ ابن ماجہ کے علاوہ دوسرے تمام ائمۂ صحاح کو ان سے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ امام مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے اپنی کتابوں میں ان کے مرویات درج کیے ہیں۔ مشہور محدثین اور علمائے نقد و جرح میں محمد بن یحییٰ ذہلی، ابوزرعہ، ابوحاتم اور امام احمد کے فرزند عبداللہ نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ بعض اور ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

بقی بن مخلد، بندار بن بشار، جعفر بن محمد فریابی، حسن بن صباح بزار، حفص بن احمد بن فارس رجاء بن مرجی، صالح بن محمد جزرہ، عبداللہ بن واصل بخاری، عمر بن بجیر، عمر بن محمد بجیری، عیسیٰ بن عمر سمرقندی، محمد بن عبدوس بن کامل، مراج اور مطین وغیرہ[1]

طلب حدیث کے لیے سفر امام دارمی نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق حدیث کی طلب و تکمیل کے لیے شام، بغداد، مصر، عراق، خراسان اور مکہ و مدینہ کا سفر کیا، خطیب اور دوسرے مؤرخین نے ان کے سفر و رحلت کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھے جو حدیث کے لیے بہت زیادہ سفر کیا کرتے تھے، بعض علمائے رجال نے لکھا ہے کہ رحل و طوف یعنی طلبِ حدیث کے لیے سفر کیا اور ملکوں کی خاک چھانی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں "صاحبِ رحلت و اسفار ست، اکثر بلادِ اسلام را گشتہ و علم حدیث را از بلدان بعیدہ جمع کردہ[2]"

حفظ و ضبط قدرت نے ان کو حفظ و ضبط کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا۔ ائمۂ فن کے اعترافات ملاحظہ ہوں۔

عبداللہ بن نمیر جیسے بلند پایہ محدث کا بیان ہے کہ "دارمی حافظہ کے لحاظ سے ہم پر فوقیت رکھتے تھے"۔ رجاء بن جابر مرجی کا بیان ہے کہ "میں نے احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی اور شاذ کونی وغیرہ ائمۂ حدیث میں سے کسی کو عبداللہ سے بڑا حافظ نہیں پایا۔ امام احمد سے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ [2] العبر ج ۲، مرأۃ الجنان، شذرات الذہب ج ۲، بستان المحدثین

ان کے فرزند عبداللہ نے حفاظ حدیث کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے چند نوجوانان خراسان کا جن میں دارمی کا نام بھی تھا، ذکر کیا۔ عبداللہ اپنے والد سے یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ حفظ جن چار آدمیوں پر تمام ہوگیا ان میں ایک یہ بھی تھے۔ عثمان بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ "ان کے حفظ و ضبط کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ فائق تھے"۔ محمد بن ابراہیم شیرازی کا بیان ہے کہ "دارمی کا حافظہ ضرب المثل ہے"۔ ابو عبداللہ حاکم فرماتے ہیں کہ "وہ مشہور و برگزیدہ حفاظ حدیث میں تھے"۔ ابن حبان لکھتے ہیں کہ "وہ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے حدیثیں حفظ و جمع کیں"۔ امام نووی تحریر فرماتے ہیں کہ "دارمی اپنے زمانہ کے ان مشہور حفاظ میں تھے جن کے بہت کم لوگ فضل و کمال اور حفظ و ضبط میں ہمسر تھے"۔ خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ "وہ ان علمائے اسلام اور حفاظِ حدیث میں سے ایک ہیں جو احادیث کے حفظ و جمع کے لیے مشہور ہیں"۔ بندار فرماتے ہیں حفاظ دنیا چار ہیں ان میں سمرقند کے امام دارمی بھی شامل ہیں۔[۱]

ثقاہت ان کی ثقاہت و عدالت کے بھی علمائے فن اور اربابِ کمال معترف ہیں۔ ابو حاتم رازی کا بیان ہے کہ "وہ سب سے زیادہ ثقہ ثابت تھے"۔ امام احمد ان کو ماورائے ثقاہت اور خطیب صاحبِ صدق و ثقاہت بتاتے ہیں۔ ابن حبان نے ان کو حفاظ متقنین میں اور ابو حاتم نے ثقہ و صدوق لوگوں میں شامل کیا ہے۔[۲]

معرفت و درایت وہ احادیث کی معرفت و تمیز کے لیے مشہور تھے۔ روایت کی طرح درایت میں بھی ان کا مقام نہایت بلند تھا۔ رجاء بن جابر مرجی فرماتے ہیں کہ "میں نے ان سے بڑا کسی کو حدیث سے واقفیت رکھنے والا نہیں دیکھا"۔ احمد بن سیار کہتے ہیں کہ "حدیث میں ان کی واقفیت غیر معمولی اور نظر بڑی وسیع اور گہری تھی"۔ عثمان بن ابی شیبہ ان کے حافظہ کی طرح ان کی معرفت و بصیرت کے بھی معترف تھے۔ ابو منصور شیرازی کا بیان ہے کہ "ان کی درایت ضرب المثل تھی"۔ علل حدیث میں ان کی واقفیت اور تمیز کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے امام احمد کے سامنے ابن المنذر

۱؎ تاریخ بغداد ج ۱۰ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و تہذیب التہذیب ج ۵ و تقریب الراوی و مقدمہ دارمی ۲؎ تاریخ بغداد ج ۱۰ و تہذیب التہذیب

کی تعریف کی تو انہوں نے فرمایا کہ "مجھ کو ان سے کوئی واقفیت نہیں مگر حیرت ہے کہ تم لوگوں کو عبداللہ بن عبدالرحمٰن کا علم نہیں"۔ پھر تین مرتبہ تاکید کے ساتھ فرمایا کہ (علیك بذاك السید) یعنی تم کو اس سردار کے حلقۂ فیض سے وابستہ رہنا ضروری ہے لازم ہے۔ ایک اور شخص نے امام احمد سے حمانی کے بارہ میں دریافت کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ "دارمی کے قول کی بنا پر ہم ان کو متروک الحدیث سمجھتے ہیں"۔ عبداللہ بن مبارک مخزمی کا بیان ہے کہ "اے اہلِ خراسان جب تک یہ تمہارے درمیان موجود ہیں تم کو کسی اور سے اشتغال رکھنے کی ضرورت نہیں[۱]"۔

فقہ و تفسیر امام دارمی کو دوسرے اسلامی علوم و فنون میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ فقہ و تفسیر سے ان کی مناسبت اور تعلق کا اکثر علمائے رجال نے ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر ان کو بکمال مفسر اور صاحب علم فقیہہ قرار دیتے ہیں[۲]۔ ان فنون میں انہوں نے کتابیں بھی لکھی تھیں اور فقہ میں ان کے مجتہدانہ کمالات کا ثبوت ان کی سنن سے بھی ملتا ہے۔

عقل و دانش اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت و دانائی اور عقل و فراست سے بھی خاص طور پر بہرہ ور کیا تھا۔ خطیب اور دوسرے مؤرخین کا بیان ہے کہ (کان علی غایۃ العقل و نہایۃ الفضل) یعنی وہ نہایت عاقل و فاضل شخص تھے۔ بعض علمائے رجال لکھتے ہیں کہ "وہ اپنی متانت اور دانشمندی کے لیے مشہور تھے[۳]"۔

عبادت و تقویٰ امام دارمی علم و عمل دونوں کے جامع تھے اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے بھی ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ ان کو عبادت و اطاعتِ الٰہی میں بڑا انہماک تھا۔ عبداللہ بن نمیر فرماتے ہیں کہ "وہ ورع و تقویٰ کے اعتبار سے ہم سب پر فوقیت رکھتے تھے"۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ "وہ زہد و اتقاء سے متصف تھے"۔ ابو منصور شیرازی کا بیان ہے کہ "ان کی ذات زہد و تقویٰ اور دیانت و عبادت کے لیے ضرب المثل تھی"۔ عثمان بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ "لوگوں نے ان کی عصمت اور پاکیزگیٔ نفس کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس سے زیادہ

---

۱ تاریخ بغداد ج ۱۰ و تہذیب التہذیب ج ۵ ۲ تہذیب التہذیب ج ۵ ، ۳ تاریخ بغداد ج ۱۰ ، تذکرۃ الحفاظ ج ۲

Marfat.com

عظیم اور برتر تھے۔[1]

جاہ و منصب اور دنیا طلبی سے پرہیز دنیاوی عیش و تنعم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ قناعت اور سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ "میرے سامنے کفر پیش کیا گیا میں نے اس کو ٹھکرا دیا۔ دارمی کے سامنے دنیا پیش کی گئی اور وہ اس کی جانب مائل اور متوجہ نہ ہوئے۔" دنیوی جاہ و منصب سے بے نیازی کا یہ حال تھا کہ ان کو سمرقند کا محکمۂ قضا پیش کیا گیا تو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر سلطان کے اصرار پر چند دنوں کے لیے قبول کر لیا مگر بہت جلد اس سے سبکدوش ہو گئے۔[2]

سنت و حدیث کی مدافعت انہوں نے حدیث کی خدمت و اشاعت اور اس کی حمایت و مدافعت بھی کی اور مخالفینِ حدیث کا مقابلہ کر کے ان کا زور توڑ دیا۔ احادیث سے متعلق شکوک و اعتراضات کا جواب اور کذب و دروغ کی آمیزشوں سے ان کو پاک کر کے عوام و خواص سب کے دلوں میں ان کی اہمیت و عظمت اور رسول ؐ کی محبت بٹھا دی۔ اس طرح مختلف حیثیتوں سے انہوں نے علم حدیث و آثار کو فروغ بخشا۔ علمائے رجال لکھتے ہیں "اپنے وطن سمرقند میں حدیث و سنت کا بول بالا کر کے لوگوں کو اس کی جانب مائل اور مخالفینِ حدیث کا قلع قمع کر دیا۔"[3]

فقہی مذہب و مسلک کتابوں میں ان کے فقہی مذہب کی تصریح موجود نہیں ہے لیکن بیان اور ان کی سنن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام محدثین کی طرح وہ کسی ایک امام کے مسلک سے وابستہ نہ تھے بلکہ اپنے اجتہاد و تفقہ کے مطابق حدیث و قرآن کی پیروی کرتے تھے۔

فضل و امامت ان گوناگوں کمالات نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا اور وہ ائمہ مسلمین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ معاصرین علماء نے بھی ان کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ امام احمد ان کو امام و سید کے لقب سے موسوم کرتے تھے۔ ابو سعید اشج کا بیان ہے کہ "وہ ہمارے امام ہیں۔" ابو حاتم فرماتے ہیں کہ "دارمی اپنے زمانہ کے امام تھے۔" ابو حامد بن شرقی کا خیال ہے

۱۔ تاریخ بغداد ج ۱۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و تہذیب التہذیب ج ۵ ۳۔ تاریخ بغداد ج ۱۱

کہ "خراسان میں پندرہ ائمہ حدیث پیدا ہوئے ان میں ایک یہ بھی تھے"[1]

وفات مشہور روایت کے مطابق تقریباً پچھتر سال کی عمر میں اپنے وطن سمرقند میں انہوں نے ۸/ذی الحجہ ۲۵۵ھ پنجشنبہ کے دن بعد نماز عصر انتقال کیا اور عرفہ کے دن جمعہ کو تجہیز وتکفین ہوئی۔ لیکن بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ انتقال عرفہ کے دن اور تجہیز و تکفین نحر کے دن انجام پائی۔ امام بخاری کو جب وفات کی خبر ہوئی تو فرطِ غم سے سر جھکا کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور یہ شعر پڑھا:

ان تبق تفجع بالاحبة کلہم　　　وفناء نفسک لا ابالک افجع

اگر تو زندہ ہوتا تو احباب کی مفارقت کے صدمے برداشت کرتا تیرا صفحۂ ہستی سے معدوم ہونا سب سے زیادہ دردناک سانحہ ہے۔

تصنیفات

امام دارمی کی جانب حسب ذیل تصنیفات منسوب ہیں:

(۱) کتاب التفسیر

(۲) الجامع یا کتاب الجامع۔ خیر الدین زرکلی نے اس کا نام الجامع الصحیح لکھا ہے اور اس کو مطبوعہ بتایا ہے[2]۔ غالب گمان ہے کہ یہ فقہ واحکام کی کتاب ہے۔

مولانا سید ابوالوزیر احمد حسن صاحب نے حاشیہ مشکوٰۃ میں امام دارمی کی رد جہمیت میں بھی کچھ کتابیں بتائی ہیں[3]۔ لیکن ان کے نام نہیں تحریر کیے ہیں۔

اسی طرح علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ "علمائے سیر نے ان کی تصنیفات میں جامع، مسند، تفسیر اور ان کے علاوہ کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر غالباً موجود صرف دو کتابیں ہیں"[4]

---

[1] خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال وتاریخ بغداد ۱۰۵ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ وتہذیب التہذیب ج ۵۔ [2] اعلام ۲۵۔

[3] حاشیہ تنقیح الرواۃ دیباچہ مشکوٰۃ۔ [4] تدریب الراوی۔

(۳) سنن دارمی: یہ ان کی سب سے مشہور اور اہم کتاب ہے۔ صحاح ستہ کے بعد حدیث کی جو کتابیں زیادہ اہم اور مستند سمجھی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔ شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں "کتاب او از احسن کتب حدیث است"[1] اس کی اہمیت کی بنا پر محدثین اور علمائے فن نے اس کی حدیثوں کو قابل احتجاج اور لائق استدلال خیال کیا ہے۔ مشکوۃ میں جو منتخب کتابوں کی حدیثوں کا مجموعہ ہے صحاح اور دوسری معتبر کتابوں کی طرح اس کی احادیث بھی شامل ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے کتبِ حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی صحت واسناد کی بنا پر اس کو صحاح ستہ میں بھی شامل کیا گیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔

کتب و ابواب کی تعداد | سنن دارمی پینتیس فصول (کتب) اور ایک ہزار چار سو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔

ترتیب | عام کتبِ حدیث و سنن کے برعکس اس کی ابتداء "باب ما کان علیہ الناس قبل مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الجہل والضلالۃ" سے ہوتی ہے۔ اس نص کے مختلف ابواب میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اوصاف وخصائص کو جو کتب قدیمہ میں مذکور ہیں اور آپ کے معجزات، فضائل ومحامد، اتباعِ سنت اور علم کی اہمیت وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد عام کتبِ سنن کی طرح طہارت اور نماز وغیرہ کے جملہ ابواب اور آخر میں وصایا اور فضائل قرآن کے ابواب ہیں۔

خصوصیات | (۱) اس میں پندرہ ثلاثی حدیثیں ہیں۔ یہ تعداد بظاہر تو کم معلوم ہوتی ہے لیکن سنن کی کمیت اور دوسری کتابوں کے لحاظ سے کم نہیں ہے اسی لئے بعض علمائے فن کا بیان ہے کہ "اس کی ثلاثیات بخاری کی ثلاثیات سے زیادہ ہیں اور رباعیات بکثرت ہیں"[2]۔

(۲) اس کی ایک اہم خصوصیت صحت کا التزام اور علوئے اسناد بھی ہے علمائے رجال کا بیان ہے۔ "ولہ اسانید عالیۃ" یعنی دارمی کی سندیں نہایت عالی اور بلند پایہ ہیں[3]۔

---

[1] اکمال شرح مشکوۃ [2] الرسالۃ المستطرفہ و مقدمہ مشکوۃ و مقدمہ دارمی [3] الرسالۃ المستطرفہ

علمائے جرح و تعدیل نے تصریح کی ہے کہ اس کے اکثر رجال ثقہ و قوی اور بیشتر حدیثیں صحیح و ثابت ہیں۔ علامہ ابن حجر نے اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کو سنن ابن ماجہ سے بھی زیادہ اہم اور فائق بتایا ہے[1]

(۳) یہ اگرچہ حدیث کی کتاب ہے لیکن اس میں فقہی مسائل و مباحث اور ان کے متعلق فقہاء کے اختلافات و دلائل بھی بیان کئے گئے ہیں اور مختلف اقوال میں تطبیق و توجیہ یا مرجح و مختار مسلک کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

(۴) احادیث کی طرح صحابہ و تابعین کے آثار و فتاویٰ بھی نقل کیے گئے ہیں بلکہ بعض بعض ابواب میں صرف صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار ہی مذکور رہیں۔

(۵) عام خصوصیات اور جملہ فنی خوبیوں سے بھی یہ کتاب آراستہ ہے۔ مثلاً روایات کے مفہوم و منشا کی وضاحت، ابہام کی تشریح، دقیق الفاظ اور مشکل لغات کا حل، رواۃ کے ناموں کی مختلف حیثیتوں سے وضاحت، بلاد واماکن کی تحقیق، تعدد طرق و اسناد، روایات اور ان کے الفاظ کا فرق و اختلاف اور متابعات وغیرہ کی تفصیل، مسند، مرفوع اور منقطع و موقوف کی توضیح، خطاء، شک، تردد اور اشتباہ کی تصریح، روایات اور رواۃ کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں، اساتذہ کی وضاحت و تشریح، راوی کے سماع و عدم سماع اور لقاء و عدم لقاء کا ذکر، احادیث کی تصویب، ان کے درمیان ترجیح و اسباب ترجیح اور ان کے نسخ و عدم نسخ وغیرہ کی تفصیل موجود ہے۔

سنن یا مسند دارمی اس کتاب کو سنن اور مسند دونوں کہا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی مختصر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مسند میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں درج ہوتی ہیں اور سنن کی ترتیب فقہی ابواب پر ہوتی ہے ایمانیات اور کتاب الطہارت سے لے کر وصایا تک کی حدیثیں ابواب کے ماتحت نقل

---

[1] مقدمہ دارمی

کی جاتی ہیں۔ اس تعریف کی رو سے دارمی کا شمار سنن ہی میں ہونا چاہئے۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں "کہا جاتا ہے کہ مسند دارمی مسند نہیں ہے بلکہ اس کی ترتیب ابواب پر ہے[1]"۔ صاحب شرح الفیہ کا بیان ہے کہ "ابن صلاح نے اس کو مسانید میں شمار کیا ہے حالانکہ یہ ان کا وہم ہے کیونکہ اس کی ترتیب مسانید کے بجائے ابواب پر ہے[2]"۔ شاہ عبد العزیز صاحب ارقام فرماتے ہیں۔

"وایں کتاب برخلاف اصطلاح محدثین مشہور بمسند گشتہ حالانکہ مرتب بر ابواب است
نہ بر صحابہ پس باید کہ آنرا سنن دارمی گویند[3]"۔

ان اقوال سے ظاہر ہے کہ اس کی اصل حیثیت سنن کی ہے تاہم ابن صلاح کے قول کو اس قدر شہرت ہوئی کہ اب وہ سنن کے بجائے مسند ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "کتاب السنن جو مسند دارمی کے نام سے موسوم کی جاتی ہے مرتبہ میں عام سنن سے کمتر نہیں ہے[4]"۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مسند کا اطلاق کبھی ان کتابوں پر بھی کیا جاتا ہے جن کی ترتیب صحابہ کے ناموں کے بجائے فقہی ابواب پر ہوتی ہے لیکن ان کی سندیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی اور مذکور ہوتی ہیں اسی لیے امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا نام الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ وسننہ وایامہ رکھا ہے اور امام مسلم نے بھی صحیح مسلم کو مسند کے نام سے تعبیر کیا ہے[5]۔ اس لحاظ سے سنن دارمی کو بھی مسند کہا جا سکتا ہے۔ عراقی کا بیان ہے کہ "یہ مسند کے نام سے مشہور ہے جیسا کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا نام بھی مسند رکھا ہے کیونکہ اس کی احادیث کی سندیں رسول اللہ تک مذکور ہیں[6]"۔ یہاں ایک اور شبہ پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبد الحلیم چشتی لکھتے ہیں "اسی طرح سنن دارمی کو مسند دارمی کے نام سے ذکر کرتے ہیں حالانکہ اس میں تمام حدیثیں مرفوع نہیں ہیں۔ مرسل، منقطع اور متصل سب ہی کچھ ہیں مگر موقوفات کا ذخیرہ زیادہ ہے اس لیے اس کو بھی مسند کہہ دیتے ہیں[7]"۔

---

[1] تدریب الراوی [2] کشف الظنون ج ۲ [3] بستان المحدثین [4] کشف الظنون ج ۲ [5] فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ

[6] تدریب الراوی [7] فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ

اس تفصیل سے ثابت ہو گیا کہ اگرچہ دارمی کی تصنیف اپنی نوعیت اور ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے سنن میں شامل ہے لیکن وہ مسند کے نام سے بھی مشہور ہے اور اس کو مسند کہنا غلط نہیں ہے۔

کیا سنن دارمی صحاح ستہ میں شامل ہے جمہور علمائے اسلام کے نزدیک صحاح کی چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ ہے لیکن بعض لوگوں نے مؤطا امام مالک کو اور بعض نے دارمی کو صحاح کی چھٹی کتاب قرار دیا ہے۔ مغلطائی کی یہی رائے ہے۔ ان لوگوں کے دلائل یہ ہیں کہ دارمی کی سنن صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی سنن پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس کی سندیں عالی، رجال ثقہ وقوی، رباعیات بکثرت اور شاذ و منکر روایات بہت کم ہیں۔ علاوہ ازیں امام دارمی کا زمانہ قدیم ہے اور فضل و کمال کے لحاظ سے ان کا مرتبہ زیادہ ہے۔

لیکن بایں ہمہ جمہور کے قول کے مقابلہ میں یہ قول مرجوح سمجھا جائے گا۔

ایک شبہ کا ازالہ مسند دارمی کے متعلق جو جو کہا جاتا ہے کہ "وہ مرسل، موقوف، منقطع اور معضل روایات پر مشتمل ہے" تو دراصل یہ امام بخاری کی صحیح کے مقابلہ میں ہے جیسا کہ عراقی کے پورے بیان سے اس کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

"یہ مسند کے نام سے مشہور ہے جس طرح امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام المسند الجامع رکھا ہے لیکن (بخاری کے مقابلہ میں) دارمی کے اندر مرسل، منقطع اور معضل روایتیں زیادہ ہیں[1]"

اور اس قول سے دارمی کی شہرت و اہمیت میں بھی فرق نہیں آتا کیونکہ اس کی صحت و علوئے اسناد وغیرہ کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ باقی وقف، ارسال اور انقطاع وغیرہ تو حقیقت میں امام دارمی کے حزم و احتیاط کی دلیل ہے اور مؤطا امام مالک جیسی معتبر اور اہم کتاب میں تو اسی قسم کی روایتوں کی زیادتی ہے۔

سنن دارمی کا ایک قلمی نسخہ ۵۲۵ھ کا لکھا ہوا دو سو پچپن اوراق پر مشتمل کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے[2]۔ ۱۲۸۶ھ میں نواب صدیق حسن خان صاحب حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ

---

[1] کشف الظنون ۲۵ [2] فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ۱۶

Marfat.com

تشریف لے گئے تو ان کو وہاں شاہ ولی اللہ صاحب کے ذخیرۂ کتب میں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا اور انہوں نے اس کو نقل کر ڈالا۔ اسی نقل کو ۱۲۹۳ھ میں مولانا عبدالرشید بن محمد شاہ کشمیری نے دو اور نسخوں سے جن میں سے ایک ۸۰۳ھ کا لکھا ہوا تھا اور اس کی تصحیح صاحب حصن حصین علامہ جزری نے کی تھی مقابلہ و تصحیح کے بعد مختصر حواشی کے ساتھ مطبع نظامی کانپور سے شائع کیا۔

مولانا عبدالرشید صاحب نے حواشی میں دوسرے نسخوں میں اس کا فرق بھی ظاہر کیا ہے اور مشکل الفاظ، اعراب، اسماء و رجال اور بلاد و اماکن کی مختصر تشریح اور حدیث کے معنی و مفہوم کی مختصر وضاحت بھی کی ہے اور اس کے شروع میں ایک مقدمہ کے اندر سنت و حدیث کی اہمیت، محدثین کی عظمت، کتب حدیث کے اقسام اور امام دارمی کے حالات و سوانح اور ان کی سنن کے مقام و مرتبہ وغیرہ سے بحث کی ہے۔

سنن دارمی کی ثلاثیات کو الگ سے بھی مرتب کیا گیا ہے۔ حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

"کتاب ثلاثیات دارمی ان پندرہ حدیثوں پر مشتمل ہے جو ان کی مسند میں بیان ہوئی ہیں۔"[1]

---

[1] کشف الظنون جلد اول۔

امام بخاری

(متوفی ۲۵۶ھ)

نام ونسب اور ابتدائی حالات | سلسلہ نسب یہ ہے محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بروزبہ، ان کا اصلی نام محمد اور کنیت ابو عبداللہ ہے، ان کے جداعلیٰ بروزبہ فارس کے رہنے والے اور مذہبا مجوسی تھے۔

امام صاحب کے جدِ امجد مغیرہ پہلے شخص ہیں، جو اس خاندان میں مشرف بہ اسلام ہوئے اس زمانہ کا قاعدہ تھا کہ جس شخص کے ہاتھ پر اسلام لاتے تھے، اسی کی نسبت سے نومسلم مشہور ہو جاتے تھے، مغیرہ چونکہ امیر بخارا یمان جعفی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے، اس لیے جعفی مشہور ہوگئے اور یہ لقب نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا ہوا امام صاحب تک پہنچا، اس بنا پر امام صاحب جعفی کے لقب سے بھی مشہور ہیں[۱]۔

امام صاحب کے دادا ابراہیم کا حال کچھ نہیں معلوم ہو سکا لیکن ان کے والد اسماعیل جو تیسرے طبقے کے معتبر محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں، اسماعیل کی ثقاہت اور مرتبہ کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام مالک اور حماد جیسے محدثین کی انہوں نے شاگردی کی اور ابن مبارک جیسے شیوخ کی صحبت میں مدتوں رہے۔ اہل عراق نے اکثر حدیثیں ان سے روایت کی ہیں، خود امام بخاری نے تاریخ کبیر میں ان کے حالات لکھے ہیں، اور اپنے بزرگ والد کے فضل وکمال

---

[۱] مقدمہ فتح الباری وکتاب الانساب۔

Marfat.com

فخر کیا ہے۔

امام صاحب کے نام سے زیادہ ان کی وطنیت مشہور ہے، اس لیئے اس قدر ہر شخص جانتا ہے کہ ان کا اصلی وطن بخارا ہے، بخارا قدیم جغرافیہ میں اقلیم عجم کے صوبہ ماوراء النہر کا ایک جلیل القدر شہر سمجھا جاتا تھا، لیکن جدید جغرافیہ کی رو سے ایشیائی ترکستان میں واقع ہے اس کی پشت پر سمرقند داہنی طرف تاشقند بائیں طرف صحرائے کراکورم اور سامنے صحرائے قزل خورم ہے، دوسری صدی کے اواخر میں (جب بخارا کو امام صاحب کی پیدائش کا شرف حاصل ہوا) خلفائے عباسیہ کے زیر حکومت تھا، اور مقامی انتظام کے لیئے دربار خلافت کی طرف سے ایک گورنر رہا کرتا تھا۔

شوال کی تیرھویں تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا جب ۱۹۴ھ میں امام بخاری پیدا ہوئے ابھی کھیل کود کے دن ختم نہیں ہوئے تھے کہ ان کے والد اسماعیل ان کو یتیمی کا داغ دے کر ہمیشہ کے لیئے رخصت ہو گئے، ان کی والدہ جن کی تنہا سرپرستی اور توجہ پر ان کی آئندہ ترقی کا دار و مدار تھا، ان کو اور ان کے بڑے بھائی احمد کو لے کر بخارا سے مکہ معظمہ چلی آئیں، وہیں انہوں نے نشو و نما پائی اور ابتدائی تعلیم حاصل کی[1]۔

امام صاحب کی تحصیل علم کا زمانہ بچپن ہی سے شروع ہوتا ہے، ابتدائی تعلیم میں علم فقہ پر توجہ کی اور امام وکیع اور امام ابن مبارک جیسے اساتذہ فن کی تصنیفات کا مطالعہ کیا، پندرہ برس کی عمر میں فقہ کی تعلیم سے فارغ ہو گئے تو اس مقدس فن کی جانب متوجہ ہوئے[2] جس کی پریشان اور پراگندہ حالت ان کی آئندہ توجہ اور سرپرستی کا انتظار کر رہی تھی۔ اگرچہ اس تفصیل کا حال نہیں معلوم ہوتا کہ امام صاحب نے کن مشائخ سے فن حدیث کو حاصل کیا، لیکن اس قدر مسلم ہے کہ فضل و کمال اسحق بن راہویہ اور علی بن المدینی کے فیضان تعلیم کا زیادہ ممنون ہے۔

ان بزرگوں کے علاوہ اور جن مشائخ کا تاریخوں میں پتہ چلتا ہے، ان کے دیکھنے سے معلوم

۱۔ مقدمہ فتح الباری و معجم البلدان ج ۲ و تاریخ ابن خلکان ج ۲ ۲۔ مقدمہ فتح الباری و ایضاً و طبقات الشافعیہ الکبری ج ۲ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲

ہوتا ہے کہ امام صاحب کے شیوخ میں مختلف درجہ اور مختلف طبقے کی جماعتیں شامل تھیں مثلاً

۱۔ تبع تابعین، جیسے محمد بن عبداللہ انصاری، ابو عاصم النبیل۔

۲۔ تبع تابعین کے معاصر، مگر کسی ثقہ تابعی سے انہوں نے حدیث کی روایت نہیں کی، جیسے بن ایاس۔

۳۔ تبع تابعین سے جن لوگوں کو اخذ حدیث کا موقع ملا، جیسے قتیبہ بن سعید، احمد بن حنبل، ابن راہویہ، علی بن مدینی، یحییٰ بن معین[1]۔

۴۔ ہم درس طلبہ، جیسے محمد بن یحییٰ ذہلی، ابو حاتم رازی، محمد بن عبدالرحیم صاعقہ۔

۵۔ امام صاحب کے معاصرین جیسے عبداللہ بن حماد آملی، عبداللہ بن ابی العاص خوارزمی[2]۔ امام صاحب کے شوق علم کا یہ حال تھا کہ بغداد، بصرہ، خراسان، کوفہ، خوارزم، حجاز، شام میں اس وقت کوئی محدث ایسا نہ تھا جس سے امام صاحب نے کچھ نہ کچھ اخذ نہ کیا ہو[3]۔ ان کے تمام شیوخ کی مجموعی تعداد ایک ہزار اسی ہے جس میں پہلے قسم کے محدثین کا حصہ زیادہ ہے[4]۔

امام صاحب فطرۃً نہایت قوی الحافظ تھے، فطرت کی اس فیاضی سے انہوں نے حدیث کی تحصیل میں بہت فائدہ اٹھایا، استاد سے جو حدیث سنتے فوراً زبانی یاد کر لیتے۔ ابتدا میں کتابتِ حدیث کے سخت خلاف تھے ان کا قول تھا کہ کتابت سے انسان کی فطری قابلیت کم ہو جاتی ہے اور محض کتابوں پر وقت برباد کرنے کا عادی ہو جاتا ہے[5]۔ لیکن آگے چل کر جب ضرورتِ زمانہ متقاضی ہوئے تو ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی۔

امام صاحب کی شہرت امام صاحب کے فضل و کمال کی شہرت، اس سے پہلے کہ وہ فارغ التحصیل ہوں دور دور تک پہنچ چکی تھی، حفظ حدیث میں ان کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ بڑے بڑے محدثین مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اس لیے ان کی تیزی ذہن اور قوت حافظہ کا عام طور پر اعتراف کیا

---

[1] نیشاپوری نے بھی ان لوگوں سے روایت کی ہے [2] مقدمہ فتح الباری [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و طبقات الشافعیہ ج ۲ [4] مقدمہ فتح الباری [5] مقدمہ فتح الباری۔

جاتا تھا۔ ان کے زمانے کے وہ علماء جن کے گرد و پیش، ایک بڑی جماعت تلامذہ کی رہتی تھی اور جو فضل و کمال کے لحاظ سے خود امامِ فن کی حیثیت رکھتے تھے اُن کے کسی مجموعہ حدیث کو امام صاحب صحیح تسلیم کرتے، تو فخریہ لہجہ میں کہتے کہ :

"ہماری ان حدیثوں کو محمد بن اسماعیل بخاری نے صحیح تسلیم کیا۔"[1]

یعنی ان احادیث کی صحت میں اب کس کو کلام ہو سکتا ہے، جب امام بخاری جیسے نقاد نے صحیح قرار دیا ہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس شہرت نے وہ ترقی کی کہ دور دور سے لوگ سمع حدیث کی غرض سے حاضر ہونے لگے، ائمہ حدیث درس دیتے ہوئے امام صاحب کو اپنی مسند خاص پر جگہ دیتے اور احمد بن حنبل جیسے بزرگ کہتے ہیں کہ "خراسان کی سرزمین نے محمد بن اسماعیل جیسا شخص پیدا نہیں کیا۔"

یوسف بن موسیٰ مرورودی نے بصرہ میں امام صاحب کی وسعت علم اور شہرت کا پرا اثر منظر دیکھا تھا، ان کا بیان ہے کہ ایک دن کسی شخص کو گلیوں میں پکارتے ہوئے سُنا کہ "اے قدر دانان ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل آج کل بصرہ میں تشریف فرما ہیں، جو شخص ان کی زیارت کا مشتاق ہو، جامع مسجد میں حاضر ہو۔" یہ آواز سنتے ہی جامع مسجد میں حاضر ہوا، مسجد میں اس وقت بہت سے علماء جمع تھے ایک ادھیڑ عمر کا شخص ستون کی آڑ میں نماز پڑھ رہا تھا معلوم ہوا کہ امام محمد اسماعیل بخاری یہی ہیں، نماز سے فارغ ہو کر علماء کی طرف متوجہ ہوئے، حاضرین نے درخواست کی، حدیث کے متعلق خطبہ دیں، امام صاحب نے منظور فرمایا، شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ فلاں وقت امام صاحب بیان فرمائیں گے، لوگ جوق در جوق مسجد میں جمع ہونے لگے، جب حاضرین کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تو امام صاحب کھڑے ہوئے اور یوں بیان کرنا شروع کیا کہ اے علمائے بصرہ! آج میں تمہارے سامنے دو حدیثیں پیش کروں گا جن کے راوی تمہارے شہر بصرہ کے رہنے والے ہیں، مگر تم کو ان کی خبر نہیں۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری [2] تاریخ بغداد ج ۲۔

اس کے بعد انہوں نے جتنی حدیثیں بیان کیں سب کے رواۃ اہل بصرہ تھے۔[1]

امام صاحب کی اس وسعت معلومات اور معرفت حدیث کو دیکھ کر اکثر علماء کہا کرتے تھے کہ

انما ھو اٰیۃ من اٰیات اللّٰہ تمشی علی وجہ الارض ماخلق الا للحدیث[2]	امام بخاری خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں جو زمین پر چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ خدا نے ان کو صرف حدیث ہی کے لیئے پیدا کیا۔

تحصیل علم کے لیئے مختلف مقامات کا سفر امام صاحب نے تحصیل علم اور زیارت علماء کے لیے دور دراز مقامات کے سفر کیئے، مصر و شام میں استفادۂ حدیث کی غرض سے دو بار گئے۔ حجاز میں متواتر چھ سال تک قیام کیا، کوفہ و بغداد میں جو علماء کا مسکن تھا، بار بار آیا کیئے۔ بصرہ میں چار بار گئے اور بعض مرتبہ پانچ پانچ برس تک قیام کیا، ایام حج میں مکہ معظمہ چلے جاتے اور فراغت کے بعد پھر بصرہ چلے آتے۔[3] ان تمام سفروں میں نیشا پور کا سفر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

نیشا پور کا سفر نیشا پور اس زمانے میں علم حدیث کا مرکز تھا، مسلم بن حجاج صاحب صحیح مسلم اور ان کے استاذ امام محمد بن یحیٰی ذہلی جیسے محدث اسی کی خاک سے اٹھے تھے اور ان کے علم و فضل نے نیشا پور کو دور دور تک مشہور کر دیا تھا، ایسی حالت میں امام صاحب کا نیشا پور جانا اور بڑے بڑے اساتذہ کی موجودگی میں اپنے فضل و کمال کا سکہ بٹھانا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔

امام صاحب جس شان سے نیشا پور میں داخل ہوئے اور جس جوش سے ان کا خیر مقدم کیا گیا اس کی تصویر خود امام مسلم نے ان مختصر لفظوں میں کھینچی ہے۔

"امام بخاری جب نیشا پور میں تشریف لائے تو اس دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا گیا کہ والیان ملک اور سلاطین کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔"[4]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۲ [2] مقدمہ فتح الباری والبدایہ ج ۱۱ و تاریخ بغداد ج ۲ [3] فتح الباری و تاریخ بغداد جلد ۲

[4] مقدمہ فتح الباری۔

Marfat.com

امام صاحب نیشاپور پہنچ کر درس و تدریس حدیث میں لگ گئے۔ علمائے شہر اکثر اوقات حاضر ہوا کرتے اور امام صاحب کی معلومات حدیث سے مستفیض ہوتے، خود امام مسلم کا یہ حال تھا کہ امام صاحب کی روزانہ مجلس کبھی ان سے خالی نہ ہوتی تھی، ایک دن امام صاحب کی جامعیت اور تجر علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بے اختیار پیشانی کا بوسہ لیا اور جوش میں آکر کہا۔

دعنی اقبل رجلیک یا امیر المومنین فی الحدیث۔	اے ملک حدیث کے بادشاہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں قدم بوسی کا شرف حاصل کروں۔

امام محمد بن یحییٰ ذہلی اس پایہ کے شخص تھے کہ امام مسلم کے استاد اور نیشاپور کے مسلم محدث تھے انہوں نے اپنے تمام شاگردوں کو حکم دے دیا تھا کہ امام صاحب کی مجلس میں حاضر ہوا کریں۔ خود امام صاحب کی شہرت اور فضل و کمال نے اس طرح لوگوں کو گرویدہ کر لیا کہ امام ذہلی جیسے بزرگوں کی مجلسیں بے رونق ہو گئیں۔[۱]

ایک دن امام ذہلی نے اپنی مجلس میں فرمایا کہ "میں کل محمد بن اسماعیل بخاری کی ملاقات کو جاؤں گا جس شخص کا جی چاہے میرے ساتھ چلے"۔ ساتھ ہی امام ذہلی کو یہ خیال ہوا کہ امام بخاری کی بدولت میری درسگاہ میں جو بے رونقی چھا گئی ہے، اس کا اثر میرے طلبہ پر بھی پڑا ہے۔ اس لئے میرے ساتھیوں میں سے کوئی طالب علم ایسی بات نہ پوچھ بیٹھے جس کی بدولت مجھ میں اور محمد بن اسماعیل میں رنجش ہو جائے اور غیر اقوام کو اہل سنت کے اختلاف پر ہنسی اڑانے کا موقع ہاتھ آ جائے اس لئے اپنے ہمراہیوں کو تاکید کر دی کہ امام بخاری سے اختلافی مسائل کے متعلق کوئی سوال نہ کیا جائے۔[۲]

دوسرے دن امام ذہلی اپنی جماعت کے ساتھ امام صاحب کے یہاں پہنچے۔ اتفاقاً وہی صورت پیش آ گئی جس کا انہیں خوف تھا، ایک شخص نے اٹھ کر امام صاحب سے سوال کیا کہ یا ابا عبداللہ! قرآن کے جو الفاظ ہماری زبان سے نکلتے ہیں کیا وہ مخلوق ہیں؟ اس کے اصل الفاظ یہ تھے۔

---

[۱] مقدمہ فتح الباری و تاریخ بغداد ج ۲ و طبقات الشافعیہ ج ۲ [۲] مقدمہ فتح الباری

"لفظی بالقرآن مخلوق" امام صاحب ساکت رہے، پھر اس شخص نے دوبارہ سوال کیا۔ امام صاحب نے مجبور ہو کر جواب دیا کہ

القرآن کلام اللہ غیر مخلوق ولفظی بالقرآن الفاظنا والفاظنا من افعالنا وافعالنا مخلوقة[1]

قرآن کلام الٰہی اور غیر مخلوق ہے اور جو الفاظ ہماری زبانوں سے نکلتے ہیں وہ ہمارے الفاظ ہیں اور ہمارے الفاظ ہماری زبان کی ایک حرکت ہے اس لیئے ہمارا ایک فعل ہے اور افعال مخلوق ہیں۔

امام صاحب نے ان مختصر لفظوں میں درحقیقت اس بحث کا فیصلہ کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر قرآن کا مفہوم نفس کلام سے ہے تو کلام خدا کی ایک صفت ہے اور خدا کی صفت کیونکر مخلوق ہو سکتی ہے؟ اگر وہ الفاظ مراد ہیں جو ہماری حادث زبانوں سے نکلتے ہیں تو چونکہ وہ مخلوق کا ایک فعل ہے لہٰذا ان کے مخلوق ہونے میں کلام نہیں۔

لیکن اس دقیق جواب کو عوام نہ سمجھ سکے، اس لیئے اس واقعہ کو اس قدر بڑھایا اور شہرت دی کہ امام صاحب کی عام ہر دلعزیزی میں فرق آگیا۔ مگر جو لوگ دقیقہ رس اور نکتہ سنج تھے وہ اس جواب کی تہ کو پہنچ گئے، اور پیشتر سے زیادہ وقعت کرنے لگے، انہی لوگوں میں ایک شخص امام مسلم بھی تھے، ان کو جب معلوم ہوا کہ امام ذہلی بھی اس جواب کی بدولت امام صاحب کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے اپنی مجلس میں منادی کرادی کہ "جو شخص لفظی بالقرآن مخلوق" کا قائل ہو وہ ہماری مجلس میں شریک نہ ہو" تو سخت برآشفتہ ہوئے اور وہ تمام نوشتے اونٹوں پر لدوا کر واپس کر دیئے جن میں امام ذہلی کی تقریریں قلمبند کی تھیں[2]۔

جب یہ اختلاف ایک نازک حد تک پہنچ گیا، تو امام صاحب نیشاپور کو خیرباد کہہ کر اپنے

---

[1] مقدمہ فتح الباری [2] ایضاً

وطن مالوف بخارا کو روانہ ہوئے، اہل بخارا کو جب اطلاع ہوئی کہ ان کا ہم وطن کمال اور شہرت کی صفت سے آراستہ ہو کر پھر اپنے وطن مالوف کی طرف واپس آرہا ہے تو جوش مسرت میں استقبال کے لیئے بڑھے، شہر سے دو کوس کے فاصلہ پر امرائے شہر نے خیر مقدم کیا اور درہم و دینار نثار کرتے ہوئے شہر میں لائے[1] اللہ اکبر ایک وہ زمانہ تھا جب بے باپ کا ایک یتیم بچہ حسرت و یاس کی گود میں بخارا سے نکلا تھا اور ایک یہ زمانہ ہے جب وہی یتیم بچہ امام حدیث ہو کر امرائے شہر کے غول میں خراماں خراماں اسی بخارا میں داخل ہو رہا ہے۔

جلاوطنی اور انتقال بخارا میں امام صاحب نے ایک مدت تک آرام و راحت سے زندگی بسر کی، لیکن آخر میں اپنی غیور اور خود دار طبیعت کی بدولت مصیبت میں مبتلا ہو گئے، شاہ بخارا نے حکم دیا کہ بخارا سے فوراً نکل جائیں۔

امام صاحب کے بعض رشتہ دار سمرقند کے ایک چھوٹے سے قریہ خرتنگ میں رہتے تھے امام صاحب بخارا سے نکل کر وہیں چلے آئے اور آخر عمر تک وہیں رہے۔ جلا وطنی کا انہیں سخت افسوس تھا، وفورِ غم میں بے اختیارانہ زبان سے نکل جاتا کہ الٰہی! باوجود وسعت کے زمین میرے لیئے تنگ ہو گئی ہے، اس لیئے اب مجھ کو اٹھا لے[2]۔

عجیب اتفاق ہے کہ یہ دعا ایسی مقبول ہوئی کہ تھوڑے ہی دنوں میں خدا نے دنیا سے اٹھا لیا[3] ۲۵۶ھ میں شب کو نماز کے بعد انتقال ہوا، شوال کے مہینے میں تیرھویں تاریخ کو پیدا ہوئے اور شوال ہی کی چاند رات میں دوشنبہ کو وفات پائی اور عید کے دن ظہر کی نماز کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔

دوسرے دن جب یہ خبر مشہور ہوئی تو سمرقند میں ایک تہلکہ مچ گیا، اس دھوم دھام سے جنازہ اٹھایا گیا کہ سارا سمرقند مشایعت میں ساتھ ساتھ تھا اور بڑے بڑے علماء اور امراء باچشم پُرنم نماز جنازہ میں شریک تھے، نماز ظہر کے بعد جنازہ دفن کیا گیا اور آسمان حدیث کا یہ مہر

---

[1] فتح الباری [2] تاریخ بغداد ج ۲ و مقدمہ فتح الباری و تہذیب التہذیب ج ۹ [3] ایضاً

آفتاب سرزمین سمرقند میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

ایک شاعر نے اختصار کے ساتھ امام صاحب کا سالِ ولادت، سالِ وفات اور سنِ عمر کو ذیل کے دو شعروں میں یوں نظم کیا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔

کان البخاری حافظا و محدثا ۔ جمع الصحیح مکمل التحریر

میلادہ صدق ومدۃ عمرہ ۔ فیھا حمید وانقضیٰ فی نور[1]

امام صاحب کا حلیہ یہ تھا جسم دُبلا پتلا، قد میانہ، رنگ گندمی۔[2]

عام اخلاق وعادات وجہ معاش اور تصنیفات

خودداری امام صاحب کی مقدس زندگی میں بعض ایسی شائستہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے بڑے بڑے نامور لوگوں کا اخلاقی دامن خالی ہے، ان کی طبیعت سخت درجہ غیور، خوددار اور بے تکلف تھی، ان کے واقعات زندگی کے آخری حصہ میں تم پڑھ آئے ہو، کہ امیر بخارا نے جلاوطن کر دیا تھا، مگر کس لئے؟ صرف اس لئے کہ انہوں نے علم کی عظمت کے آگے ایک دنیا دار کی عزت کا لحاظ نہیں کیا، امیر بخارا کی خواہش تھی کہ امام صاحب اس کے دربار میں حاضر ہو کر صحیح بخاری اور تاریخ کبیر سنائیں۔ امام صاحب نے اس خواہش کو رد کر دیا کہ میں علم کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا کہ سلاطین کے آستانے پر لے جا کر پیش کش کروں، اگر امیر کو سچا شوق ہے تو میری مجلس میں آ کر شریک ہو، امیر بخارا کی درخواست تھی کہ وہ قصرِ شاہی میں آکر شہزادوں کو تعلیم دیں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ میں امیر کے لڑکوں کو کوئی خصوصیت نہیں دے سکتا میری مجلس عام ہے جس کا جی چاہے آکر شریک ہو۔ امیر بخارا کو یہ استغناء ناگوار گزرا۔ حکم دیا کہ ہمارے شہر سے نکل جاؤ۔ امام صاحب نے اپنے وطن سے نکلنا منظور کر لیا مگر علم کی ذلت گوارا نہ کی۔[3] خودداری کا خیال اس درجہ تھا کہ خود ان کا قول ہے:

---

[1] بستان المحدثین [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و تہذیب ج ۹ [3] مقدمہ فتح الباری۔

"میں نے اپنے استاد علی بن مدینی کے سوا اور کسی کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا نہ سمجھا۔"[1]

سادگی وقناعت امام صاحب نے عمر بھر کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ عام علما کی طرح کسی امیر یا بادشاہ کی فیاضی سے فائدہ اٹھائیں، کئی مرتبہ اس قسم کے مواقع ہاتھ آئے مگر انہوں نے وظیفہ قبول نہیں کیا، اپنے پدر بزرگوار کی میراث میں جو کچھ ملا، اس پر آخری عمر تک قناعت کی [illegible] زمانے میں تجارت کی اس خاص صورت کو کہ ایک شخص اپنا روپیہ صرف کرے اور دوسرا اپنی محنت اور مشترکہ تجارت سمجھی جائے مضاربت کہتے تھے، امام صاحب اسی طریقہ کی تجارت میں اپنا [illegible] لگا دیتے اور اسی کی قلیل آمدنی سے ضروریات زندگی پوری کرتے۔[2]

انکساری بہت کم لوگ ہوں گے، جن کو زندگی میں ایسی لاانتہا شہرت نصیب ہوئی ہو، جس کو خود ان کی آنکھوں نے دیکھا تھا، باوجود اس کے انہیں معمولی شخص سے کسی نامعلوم امر کو دریافت کرنے میں عار نہیں آتا تھا، ان کے اساتذہ کی طول طویل فہرست میں ان لوگوں کے نام نظر آتے ہیں جو ان کے ہم عمر یا ہم سبق تھے۔[3]

رواداری وبے تعصبی امام صاحب کا ایک بے نظیر وصف ان کی بے تعصبی ہے جب ہم ان کے مجموعہ احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سی ایسی حدیثیں پاتے ہیں جن کے [illegible] اہل سنت کے خلاف تھے۔ امام صاحب نے ان سے روایت کرنے میں کچھ تامل نہیں کیا اگرچہ خود ان کے مذہب سے اختلاف رکھتے تھے۔

ورزش امام صاحب کو جسمانی ورزش کا بہت شوق تھا، سواری اور تیر اندازی میں اس درجہ مہارت تھی کہ ان کا نشانہ بہت کم غلط ہوتا تھا۔[4]

صفائی امام صاحب کوئی دنیادار آدمی نہیں تھے، ان کی زندگی بالکل سیدھی سادھی اور خالص علمی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی صفائی کا اس درجہ خیال رکھتا تھا کہ فرش پر اگر تنکا بھی پڑا رہتا تو گوارا نہ کرتے تھے، اثنائے درس میں ایک شخص نے اپنی داڑھی سے ایک تنکا [illegible]

---

[1] مقدمہ فتح [illegible] تہذیب [illegible] [2] مقدمہ فتح الباری [3] مقدمہ فتح الباری وتہذیب جلد ۹ [4] مقدمہ [illegible]

Marfat.com

نکال کر فرش پر ڈال دیا۔ امام صاحب کی جب نظر پڑی تو چپکے سے اٹھے اور تنکے کو اٹھا کر باہر صحن میں ڈال دیا[1]۔

امام صاحب کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا، اسلامی دنیا کے ہر حصہ سے طلبہ کی جماعت جوق در جوق آکر شریک ہوتی، اور بڑے بڑے پایہ کے اشخاص حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوتے، ان کی مجلس درس کبھی مسجد میں اور کبھی ان کے خاص مکان پر منعقد ہوتی تھی، ان کے شاگردوں میں حافظ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، ابو عبدالرحمٰن نسائی، مسلم بن حجاج جیسے جید محدث نظر آتے ہیں جو حدیث کے ارکان ستہ کے تین جلیل القدر رکن ہیں، ابن خزیمہ، محمد بن نصر مروزی صالح بن محمد جو آگے چل کر خود بڑے پایہ کے مصنف ہوئے، امام صاحب کے عام شاگردوں میں داخل ہیں[2]۔

امام صاحب کو زمانہ تحصیل علم ہی میں تصنیف و تالیف کا شوق ہوا اور آخر عمر تک قائم رہا ان کی ابھی اٹھارہ برس کی عمر تھی، جب ایک کتاب قضایائے صحابہ و تابعین نامی لکھی[3]، اور بڑے بڑے مسن مشائخ کو متحیر کر دیا۔

تاریخ کبیر مدینہ منورہ کی چاندنی راتوں میں لکھی جب آسمان کی منور اور قدرتی قندیل نے دنیا کے مصنوعی چراغوں سے مستغنی کر دیا تھا[4]۔

صحیح بخاری کا مفصل ذکر مستقل عنوان سے آگے آرہا ہے، لیکن اس کے علاوہ دیگر تصنیفات کی ذیل فہرست یہ ہے۔

تاریخ کبیر[1]، تاریخ اوسط[2]، تاریخ صغیر[3]، خلق افعال عباد[4]، رسالہ رفع الیدین[5]، قرأت فاتحہ خلف الامام، الادب المفرد[6]، بر الوالدین[7]، کتاب الضعفاء[8]، الجامع الکبیر[9]، التفسیر الکبیر[10]، کتاب الاشربہ[11]، کتاب الہبہ[12]، کتاب المبسوط[13]، کتاب الکنیٰ[14]، کتاب العلل[15]، کتاب الفوائد[16]، کتاب المناقب، اسامی الصحابہ، کتاب الوحدان[17]، قضایا الصحابہ[18]۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری [2] مقدمہ فتح الباری [3] تاریخ بغداد [4] ایضاً

جامع صحیح بخاری | ہجرت کی پہلی صدی تک احادیث کی تدوین نہیں ہوئی، صحابہ کا خیال تھا کہ اگر آثار نبوی مرتب کئے جائیں تو ممکن ہے کہ آگے چل کر ایک زمانہ ایسا آئے کہ کلام الہٰی اور کلام نبوی میں کوئی امتیاز نہ رہے اور لوگ غلطی میں پڑ جائیں۔ علاوہ اس کے ابھی اہل عرب اس قدر متمدن نہیں ہوئے تھے کہ کتابت اور جمع و تصنیف کا عام رواج ہوتا، دوسری صدی میں جب علوم فنون کی اشاعت اور تدوین کی بنیادیں پڑیں اور کتابت کا عام رواج ہوا تو جمع حدیث پر بھی لوگوں کو توجہ ہوئی۔ امام مالک نے موطا میں اہل حجاز کی حدیثیں جمع کیں، ابن جریج نے مکہ معظمہ میں امام اوزاعی نے شام میں سفیان ثوری نے کوفہ میں اور ابوسلمہ حماد نے بصرہ میں احادیث کے مجموعے ترتیب دیئے۔ عبیداللہ بن موسیٰ کوفی اور نعیم بن حماد وغیرہ نے مسندیں مرتب کیں اور دوسری صدی کے اختتام تک بیسیوں مجموعے تیار ہو گئے[۱]

تیسری صدی میں امام بخاری کو جمع حدیث پر توجہ ہوئی، کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک احادیث کے بے شمار مجموعے مرتب ہو چکے تھے، اس لئے امام صاحب نے اگر ان سے چھانٹ کر ایک مجموعہ تیار کر لیا، تو یہ کوئی اہم کام نہ تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ امام صاحب سے پیشتر اگرچہ متعدد مجموعے مرتب ہو چکے تھے مگر ان کی حالت کیا تھی، اور امام صاحب نے جو مجموعہ تیار کیا ہے اس کی حالت کیا ہے؟ اس پہلو سے اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو کہ صحیح بخاری کی اصلی خصوصیت کیا ہے؟ اور امام صاحب کا یہ کام کس قدر اہم اور کس درجہ دشوار تھا ہم اس مضمون میں اسی حیثیت سے صحیح بخاری پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

صحیح بخاری کا اصلی نام اور احادیث ابواب وغیرہ کی تعداد | صحیح بخاری کا اصلی نام یہ ہے "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ وسننہ ایامہ" حقیقت یہ ہے کہ ایک حدیث کے مجموعے کے لئے اس سے زیادہ مناسب، جامع اور واقعی نام نہیں ہو سکتا۔

صحیح بخاری میں تقریباً دس ہزار حدیثیں ہیں جو چھ لاکھ حدیثوں سے منتخب کر کے درج کی گئی

---

[۱] ملخص از مقدمہ فتح الباری طبع [illegible]

Marfat.com

ایک سو ساٹھ کتابیں ہیں اور تین ہزار چار سو پچاس ابواب ہیں، ان تمام شیوخ کی تعداد جن سے صحیح بخاری کی حدیثیں لی گئی ہیں، دو سو نواسی ہے، تیرہ سو چالیس مشائخ ایسے ہیں، جن سے مسلم نے روایت نہیں کی صرف امام بخاری نے روایت کی ہے۔

ثلاثیات اس حدیث کو کہتے ہیں جو صرف تین راویوں کے واسطہ سے امام صاحب تک پہنچی ہے، صحیح بخاری میں اس قسم کی بائیس حدیثیں ہیں جن پر امام صاحب کو فخر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں بجا فخر ہے۔

صحیح بخاری کی خصوصیات امام صاحب جمع حدیث پر متوجہ ہوئے تو بے انتہا مشکلات کا سامنا ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ جس قدر کتابیں مرتب ہوئی ہیں، وہ محض احادیث کا ایک مجموعہ ہے جن میں نہ صحت کا التزام کیا گیا ہے، نہ علت و ضعف سے بحث کی گئی ہے، اس قسم کے مجموعوں کا تیار کر لینا کوئی مشکل اور اہم کام نہ تھا، مشکل یہ تھا کہ ایک صحیح اور واضح مجموعہ تیار کیا جائے۔ صحت کے علاوہ ترتیب کے لحاظ سے بھی منتظم اور مرتب ہو، صحیح آثار کی غیر صحیح آثار سے تمیز کی جائے، التزام ہو کہ حتی المقدور اعلیٰ اقسام کی حدیثیں اس میں درج کی جائیں۔

امام بخاری پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس التزام اور صحت سے حدیث کا ایک مجموعہ تیار کیا، اس لحاظ سے یہ جس قدر اہم تھا، اسی قدر دشوار تھا، امام صاحب نے نہایت کوشش اور جانکاہی سے اوّل لاکھوں حدیثیں جمع کیں، پھر نہایت دقتِ نظر سے ان پر نقادانہ نظر ڈالی، اصول و قواعد کے ساتھ ان میں سے دس ہزار حدیثیں منتخب کیں، اور ترتیب دار ایک جلد میں جمع کیا۔

امام بخاری نے اس مہم کو سر کرنے کے لیئے پہلا کام یہ کیا کہ حدیث کے درجے مقرر کیئے اور ان کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا، صحت اور سند کے لحاظ سے کوشش کی کہ مستفیض، متواتر، حسن حدیثیں جمع کی جائیں، ان سے دوسرے درجے پر صحیح حدیثوں کو لیا جائے، مگر صحیح سے نیچے درجہ کی حدیثیں جیسے مطلق حسن وغیرہ کو

Marfat.com

صحیح بخاری میں جگہ نہ دی جائے[1]۔ اگرچہ یہ التزام مسلم اور صحاح اربعہ میں بھی پایا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ مؤطا امام مالک بھی اس خصوصیت میں شریک ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس خوبی اور عمدگی سے امام صاحب نے اس التزام کو نبھایا ہے، اس کی نظیر کوئی مجموعہ پیش نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ اصح الکتب کے خطاب سے یہ کتاب سرفراز ہوئی۔

بخاری اور مسلم حدیث کی چھ صحیح کتابوں میں خصوصیت کے ساتھ دو کتابیں زیادہ صحیح مستند اور قابلِ اعتماد تسلیم کی گئی ہیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم، ان دونوں کتابوں کی نسبتاً زیادہ صحت میں کسی کو کلام نہیں، لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ صحیحین میں اصح کون ہے؟ عام طور پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ان دونوں کتابوں میں صحیح ترین کتاب جامع صحیح بخاری ہے لیکن بعض اہلِ مغرب کو اس میں کلام ہے، ان کا خیال ہے کہ مسلم، بخاری سے زیادہ صحیح اور قابلِ اعتماد ہے، لیکن یہ خیال کسی صورت صحیح نہیں ہو سکتا، بخاری کو مسلم پر فضیلت ہے اور اکثر حیثیتوں سے ترجیح حاصل ہے، سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ وجوہ ترجیح کیا کیا ہو سکتے ہیں؟

صحیح بخاری اور مسلم کا مقابلہ چند حیثیوں سے کیا جا سکتا ہے، حسن ترتیب، احادیث اور ترجمہ کا تناسب، عدم شذوذ، اعلال، مقویٔ رواۃ، استنباط مسائل، اتصال اسناد، زبان، صحت حدیث، پہلی دو حیثیتوں کو چھوڑ کر باقی ہر حیثیت سے بخاری کو مسلم پر فضیلت حاصل ہے۔

---

[1] جس حدیث کو کم از کم تین جلیل القدر صحابیوں نے الگ الگ طریقوں سے روایت کیا ہو اور اس کے رواۃ میں روز بروز ترقی ہوتی گئی ہو تو اس حدیث کو مستفیض کہتے ہیں، حدیث کی یہ اعلیٰ قسم ہے اگر تین سے زیادہ مشہور اصحاب سے روایت ہو تو اس کو متواتر کہتے ہیں، انما الاعمال بالنیات [illegible] مشہور حدیث ہے جس کے اول راوی صرف حضرت عمرؓ ہیں ان سے علقمہ نے روایت کی اور علقمہ سے صرف محمد بن ابراہیم نے، محمد سے فقط یحییٰ بن سعید نے اور یحییٰ سے بے شمار لوگوں نے روایتیں کیں لہٰذا یہ حدیث [illegible] کے بعد تیسرے درجہ پر حدیث حسن ہے [illegible] حدیث کو کہتے ہیں جو مختلف طریقوں سے مروی ہو اور ہر طریق کی حدیث [illegible] حدیث کی تائید کرتا ہو [illegible] ہو تو اس کو غریب مطلق کہتے ہیں [illegible] کے بعض اہل طریقوں [illegible] راوی اول [illegible] مطلق [illegible] وہ حدیث ہے جس میں [illegible] شرط پائی جائیں۔

بخاری میں سو، ترتیب اور بعض موقعوں میں عدم مناسبت حدیث و ترجمۂ باب کا عیب ضرور ہے مگر اس سے کتاب کی حقیقی خوبیوں پر پردہ نہیں پڑسکتا، صحیح بخاری اس رنگ اور التزام کی پہلی تصنیف ہے، امام صاحب کے سامنے اس قسم کا کوئی نمونہ نہیں تھا، مسلم نقش ثانی ہے، صحیح بخاری نے اس کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا ایک اعلیٰ درجہ کا نمونہ پیش نظر تھا، اس لئے اگر ترتیب وغیرہ میں نسبتاً چند نقص پائے جاتے ہیں تو ان کی بنا پر امام صاحب پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا، اس قسم کی فروگذاشتوں کا ایک ایسی کتاب میں جس کے لئے پہلے سے کوئی نمونہ نہ رہا ہو، رہ جانا کوئی مستبعد نہیں ہے، اور اس لحاظ سے امام صاحب کی معذوری ظاہر ہے۔

صحیح مسلم کے مقابلہ میں صحیح بخاری کی خوبیاں بے شمار ہیں، لیکن جن حیثیتوں کو ہم نے پیش کیا ہے ان کو پیش نظر رکھ کر اگر دیکھا جائے تو سات خصوصیتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو صرف بخاری کا حصہ ہیں، مسلم کو ان میں شرکت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

(۱) امام بخاری کا اصلی مقصود اگرچہ احادیث صحیحہ کی تدوین ہے مگر ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ترتیب احادیث میں فقہی فوائد کو بھی ملحوظ رکھا اسی لئے صحیح بخاری کی ترتیب فقہی ابواب اور مسائل کے موافق رکھی گئی ہے اور بعض ایسے باب پائے جاتے ہیں جن کو مسائل قرار دے کر، ان کے جواز یا عدم جواز میں قرآن مجید کی آیات پیش کی ہیں، کہیں کہیں معلقات اور مرفوعات سے حلت اور حرمت پر استدلال کیا ہے، اور ان کے متعلق اگر حدیثیں ملی ہیں تو ان کو بھی پیش کر دیا۔ مثلاً صحیح بخاری کی ابتدا میں، الایمان یزداد وینقص کو ایک مسئلہ فرض کر کے لتزدادوا ایمانا اور لیطمئن قلبی وغیرہ آیات اور اقوال صحابہؓ سے زیادت و نقص ایمان کو ثابت کیا ہے، اس خصوصیت کی بدولت صحیح بخاری تحقیق مسائل کا بھی ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ برخلاف مسلم کے کہ اس کی اصلی غرض صرف احادیث صحیح کو ابواب فقہیہ کی حیثیت سے مرتب کرنا ہے۔ اس لئے مسائل کی تحقیقات کے حصہ سے بالکل خالی ہے۔

(۲) ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری احادیث سے اس زمانہ کی معاشرت

کا پتہ لگاتے ہیں، اور معمولی واقعات سے نہایت مفید نتائج نکال کر ہر نتیجہ کو الگ الگ بابوں میں درج کرتے ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ بریرہ کو جو حضرت عائشہؓ کی لونڈی تھی، کسی نے کچھ گوشت صدقہ کے طور پر دیا، حضرت عائشہؓ نے وہ گوشت آنحضرتؐ کو یہ کہہ کر نہیں دیا کہ یہ گوشت صدقہ کا ہے اور آپ صدقہ نہیں کھاتے، تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ بریرہ کے لئے بے شک صدقہ ہے لیکن اگر بریرہ مجھے دے تو میرے لئے ہدیہ ہے۔"

امام مسلم نے اس حدیث کو باب الصدقہ میں درج کیا ہے مگر امام بخاری نے اس ایک حدیث سے متعدد نتائج پیدا کئے ہیں اور مختلف بابوں میں نقل کیا ہے۔ ایک موقع پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جن لوگوں پر صدقہ حرام ہے ان کی لونڈیوں کو صدقہ دینا جائز ہے کیونکہ ازواج رسولؐ کی لونڈیوں نے صدقہ لیا اور آنحضرت مانع نہیں ہوئے۔ ایک اور موقع پر اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو صدقہ دیا جائے اور وہ کسی ایسے شخص کو وہ چیز ہدیہ کے طور پر دے جس پر صدقہ حرام ہے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے۔

(۲) ایک باریک فرق صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں یہ ہے کہ جب کسی ایک شیخ کے شاگردوں سے یہ دونوں بزرگ روایت کرتے ہیں، تو اس میں شک نہیں کہ ان کے شروط کے مطابق ان میں عدل، ثقاہت، قوت حافظہ، سلامتی ذہن، تقویٰ یہ تمام شرطیں ضرور پائی جاتی ہیں لیکن چونکہ یہ تمام شرطیں ہر راوی میں برابر درجہ کی نہیں ہوسکتیں، کوئی عادل ہے کوئی زیادہ عادل ہے کوئی بہت زیادہ عادل ہے اس لئے امام بخاری جس احتیاط اور دقت نظر کے ساتھ ان سے روایت کرتے ہیں، وہ امام مسلم میں نہیں پائی جاتی۔ امام زہری کے تلامذہ کے پانچ طبقے ہیں اگرچہ سب کے سب معتبر رواۃ ہیں سے ہیں لیکن اوصاف کی کمی اور زیادتی کے لحاظ سے ان کے مدارج باہم متفاوت ہیں۔ امام بخاری اوّل طبقہ سے اصولاً اور دوسرے طبقہ سے ضمناً روایت کرتے ہیں، مگر امام مسلم دوسرے طبقہ سے اصولاً اور تیسرے طبقہ سے ضمناً اور پہلے طبقہ سے بھی کبھی روایت کرتے ہیں۔ اسماء الرجال کے ماہرین کو اس کا پتہ آسانی سے لگ سکتا ہے۔

(۴) بخاری کی قدر و منزلت کا اندازہ مسلم کے مقابلہ میں اس حیثیت سے بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے رواۃ کی تعداد جن سے امام صاحب نے صحیح میں روایت کی ہے۔ چار سو تیس سے کچھ زائد ہے اس تعداد میں سے صرف اسی راوی ایسے ہیں جن میں علماء نے کلام کیا ہے لیکن مسلم کے خاص راوی چھ سو بیس ہیں۔ ان میں ایک سو ساٹھ راویوں کو علماء نے ضعیف قرار دیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام صاحب کے کمزور راویوں سے مسلم کی ضعیف رواۃ کی تعداد بہت زیادہ بڑھی ہوتی۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ بخاری کے ضعیف رواۃ زیادہ تر بخاری کے شیوخ میں سے ہیں جن سے امام صاحب کی مدتوں صحبت رہی، ان کے حالات اور خیالات سے اطلاع حاصل کی اس لئے قیاس اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ امام بخاری جیسے نقاد مدتوں کی صحبت پر ان کے ضعف سے واقف نہ ہوئے ہوں اور روایت حدیث میں تامل نہ کیا ہو اس بنا پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان راویوں کو ضعیف قرار دینا صحیح نہیں، برخلاف امام مسلم کے کہ ان کے ضعیف راوی اکثر قدماء میں سے ہیں جن کی تنقید کا نہ ان کو موقع مل سکتا تھا، نہ ان کے حالات کی کافی اطلاع تھی، اس لئے اس صورت میں ان کے ضعف سے بے خبر رہنا زیادہ قرین قیاس ہے۔

(۵) علماء نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تمام حدیثوں میں سے دو سو دس حدیثوں کو ضعیف قرار دیا ہے ان میں سے صرف اسی بلکہ اس سے بھی کم ضعیف حدیثیں بخاری کی ہیں اور ایک سو تیس حدیثیں صحیح مسلم کی۔

(۶) بخاری و مسلم میں ایک بڑا نازک اور باریک فرق ادبی حیثیت کا بھی ہے، ایک ہی حدیث کے مضمون کو دونوں کتابوں میں دیکھیئے، بخاری کی طرز ادا، نشست الفاظ، سلاست بیان جس قدر پسندیدہ اور اعلیٰ ہوگی اس کی نظیر مسلم میں کم ملے گی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب نے اس زبان کو پیش نظر رکھا جو عہد رسالت یا اس سے قریب تر زمانے میں مستعمل تھی یعنی امام صاحب نے معانی حدیث کے ساتھ الفاظ حدیث کا بھی اوروں سے زیادہ خیال رکھا۔

Marfat.com

(۷) امام مسلم حدیث معنعن[1] کے اتصال اسناد کے لیے راوی اور مروی عنہ کی صرف ہم عصری کافی سمجھتے ہیں، بشرطیکہ راوی مدلس[2] مشہور نہ ہو چنانچہ صحیح کے مقدمہ میں انہوں نے خود تصریح کردی ہے لیکن امام بخاری سلسلۂ روایت کے اتصال کے لئے صرف معاصرت کو کافی نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک مدلس مشہور نہ ہونے کے ساتھ دونوں کی ملاقات بھی ضروری ہے چنانچہ امام صاحب نے تاریخ کبیر میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے، ہم اس موقع پر اس اختلاف کے نتیجہ کو دکھلانا کافی سمجھتے ہیں۔

امام صاحب چونکہ ملاقات کو شرط قرار دیتے ہیں، اس نے ایسی حدیث معنعن کو جس کے راوی اور مروی عنہ کی باہم ملاقات ثابت نہ ہوئی ہو، اگرچہ راوی مدلس مشہور نہ ہو متصل الاسناد تسلیم نہیں کرتے، اور اس بنا پر اس کو صحیح بھی نہیں قرار دیتے کیونکہ صحیح ہونے کے لئے بالاجماع اتصال اسناد کی ضرورت ہے مگر امام مسلم متصل مان کر صحیح احادیث درج کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صحت اور احتیاط کے لحاظ سے جس قدر صحیح بخاری کا اصول تنقید داخل عقل ہے اسی قدر مسلم کا اصول، قرائن صحیح اور قواعد احتیاط سے دور ہے۔

امام صاحب اس پہلو پر غور کرتے ہیں کہ صرف معاصرت کیونکر روایت حدیث کے لئے ہم کو اطمینان دلا سکتی ہے، جبکہ ممکن ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو شخص ہوں، مگر ان کی باہمی ملاقات نہ ہوئی ہو، اور ایک تیسرے شخص کی وساطت سے کوئی حدیث ایک شخص تک پہنچی ہو، یہ سچ ہے کہ راوی مدلس مشہور نہیں ہے لیکن مدلس نہ ہونا اس امر کے لئے کافی دلیل نہیں ہو سکتی کہ بغیر کسی واسطہ کے بذات راوی نے مروی عنہ سے سماعت حدیث کی ہے۔ صرف ایک یہی اختلاف اس امر کے لئے کافی ہے کہ مسلم کے مقابلہ میں امام بخاری جمع حدیث میں کس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں، اور جو اصول تنقید قائم کئے ہیں، وہ کس درجہ مطابق عقل اور قیاس تک رسائی سے نزدیک ہیں

---

[1] معنعن اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی اسناد عن فلان عن فلان کے ساتھ بیان کی گئی ہو ... روایت کی جائے۔ [2] مدلس اس راوی کو کہتے ہیں جو روایت میں اپنے شیخ کا نام بیان ...

ہم نے یہاں صحیح بخاری کی سات خصوصیتیں دکھلائی ہیں جو صحیح مسلم کے مقابلہ میں قابل توجہ ہیں۔ اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے خطاب سے تمام کتابیں محروم رہیں، مگر صحیح بخاری کی صحت، احتیاط، قوت رواۃ، اتصال اسناد اور اسی قسم کی اور بے نظیر خوبیوں نے خود کو اس معزز خطاب کا مستحق ثابت کیا۔ علماء نے اس استحقاق کو بجا تسلیم کیا اور کلام اللہ کے بعد جگہ دی۔

امام صاحب نے اس کا بڑا حصہ مدینہ منورہ میں لکھا ہے۔ ترتیب سے پہلے تمام ضروری عنوان لکھ لئے تھے۔ ہر عنوان کے نیچے حدیثیں درج کرتے جاتے تھے، جس عنوان کے متعلق کوئی حدیث نہ ملتی تو اس کو چھوڑ کر دوسرے بابوں کی ترتیب پر متوجہ ہو جاتے چنانچہ صحیح بخاری میں بعض عنوان ایسے پائے جاتے ہیں، جن کے متعلق کوئی حدیث درج نہیں ہوئی۔

صحیح بخاری جب مرتب ہو گئی تو امام صاحب نے اپنے استاد علی بن المدینی اور امام احمد بن حنبل جیسے اکابر محدثین کی خدمت میں اس غرض سے پیش کیا کہ ان بزرگوں کی نظر ثانی سے مزین ہو جائے، لیکن امام صاحب کی احتیاط اور تنقید نے صحیح کو اس درجہ اصح مرتب کیا تھا کہ صرف چار حدیثوں کو انہوں نے اس قابل بتایا کہ صحیح سے خارج کر دی جائیں اگرچہ وہ چار حدیثیں بھی دراصل صحیح ہیں۔

صحیح بخاری کی شرحیں

صحیح بخاری کو جو حسن قبول حاصل ہوا اس کی ایک ادنیٰ دلیل یہ ہے کہ شارحین کی جتنی بڑی اور جس درجہ کی جماعت اس کو نصیب ہوئی، شاید کسی کتاب کو ملی ہو، نامعلوم شرحوں کو چھوڑ کر کشف الظنون سے ان ترپن شرحوں کا پتہ لگتا ہے جو امام ابو سلیمان خطابی صاحب معالم السنن، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ بدرالدین بن احمد عینی، امام فخرالدین

Marfat.com

یحییٰ نووی اور حافظ جلال الدین سیوطی جیسے اکابر علماء اور محدثین کے قلموں سے نکلی ہیں [1]

---

[1] حضرت سید صاحب نے طوالت کی وجہ سے ان شرحوں کے نام تحریر نہیں فرمائے۔ حقیقت یہ ہے کہ بخاری کے شروح و حواشی کی تعداد بہت زیادہ ہے، عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں اور ترجمے کئے گئے ہیں۔ مولانا عبدالسلام مبارکپوری مرحوم نے سیرت البخاری میں ایک سو سینتالیس شرحوں کے نام لکھے ہیں لیکن یہ تعداد بھی مکمل نہیں۔

امام ابو مسعود رازی

متوفی ۲۵۸ھ

نام و نسب احمد نام، ابو مسعود کنیت اور نسب نامہ یہ ہے احمد بن فرات بن خالد۔

وطن، خاندان و ولادت آخری عمر میں اصبہان میں سکونت اختیار کر لی، لیکن اصلی وطن رے ہے، اس لئے رازی کہلاتے تھے، ضبی کی نسبت سے جو قبیلہ مضر کے ایک شخص ضبہ بن ادد کی جانب ہے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عربی النسل تھے۔[۱] ان کے سنہ ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔

اساتذہ و شیوخ ان کے چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابن ابی فدیک، ابوداؤد طیالسی، ابوصالح کاتب لیث، ابوعامر عقدی، ابو یمان حمصی، ازہر بن سمان، جعفر بن عون، حسین بن علی جعفی، ابواسامہ حماد بن اسامہ، شبابہ بن سوار، عبداللہ بن نمیر عبدالرزاق بن ہمام، محمد بن عبداللہ بن ابی جعفر رازی، محمد بن عبیدہ، محمد بن یوسف فریابی، یعلی بن عبیدہ یزید بن ہارون وغیرہ۔[۲]

تلامذہ ابو مسعود رازی کے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابن ابی عاصم، امام ابو داؤد، جعفر فریابی، عبدالرحمن بن یحییٰ بن مندہ، عبداللہ بن جعفر بن احمد، ابوخلیفہ عبداللہ بن خلیفہ بصری، محمد بن عبدالرحمن بن مندہ۔[۳]

رحلت و سفر حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ بارہ سال کی عمر میں انہوں نے حدیث کی تحریر و کتابت شروع کر دی تھی، اس کے بعد انہوں نے مختلف ملکوں اور دور دراز کے مقامات کا سفر کیا، ان کے

---

[۱] کتاب الانساب واللباب ج ۱ و ج ۲ [۲] تاریخ بغداد ج ۴ و التہذیب ج ۱ [۳] تہذیب التہذیب ج ۱

کثرتِ استفادہ کا اندازہ ذہبی کے ان الفاظ "واکثر الترحال فی لقی الرجال" (محدثین سے ملاقات کے لئے انہوں نے بہت سفر کئے) اور "ادرک الشیوخ" وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے، خطیب بغدادی نے بصرہ، کوفہ، حجاز، یمن، شام، بصرہ، جزیرہ اور بغداد وغیرہ جانے کا ذکر کیا ہے بغداد امام احمد کی زندگی میں گئے تھے اور وہاں کے نامور علماء سے مذاکرہ کیا تھا۔[1]

حفظ و ثقاہت ابو مسعود کے حافظہ کی جودت کا علماء نے اعتراف کیا ہے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں احد حفاظ الحدیث ومن کبار الائمہ فیہ (وہ اکابر حفاظ اور ائمہ محدثین میں تھے) امام احمد فرماتے ہیں کہ "اس آسمان کے نیچے احادیث نبوی کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں"۔ ابوبکر بن شیبہ کا ارشاد ہے کہ میرے نزدیک جو تین آدمی سب سے بڑے حافظ حدیث ہیں، ان میں ابو مسعود بھی ہیں ابو الشیخ کا بیان ہے کہ وہ حفاظِ کبار میں تھے، ابو نعیم کا بیان ہے کہ وہ ائمہ حفاظ میں تھے ابو بکر اعین اور امام احمد سے مروی ہے کہ مسند روایتوں کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں۔

یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کو ان سے زیادہ بہتر یادداشت والا نہیں دیکھا علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اٹھارہ سال کی عمر ہی میں ان کے حافظہ کی شہرت ہو گئی تھی، ان کے حفظ و ضبط کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب وہ مصر تشریف لے گئے تو لوگوں سے کہا کہ مصریوں کی حدیثیں سنو چنانچہ وہاں کے ہر ہر شیخ کی حدیثیں بیان کرنا شروع کیا حالانکہ ابھی یہاں کسی سے ملاقات بھی نہیں کی تھی۔

ان کے صدق و ثقاہت کا بھی ائمہ محدثین کو اعتراف ہے، امام ذہبی اور حافظ ابن حجر نے ان کو ثقہ، حافظ اور حجت کہا ہے، علامہ ابن حبان نے بھی ان کی ثقاہت اور ان کے حفظ و ضبط مذاکرہ و استحضار اور جمع و تصنیف احادیث کا ذکر کیا ہے، ابو عروبہ کا بیان ہے کہ وہ حافظ میں ابوبکر بن ابی شیبہ اور تثبت میں احمد بن سلیمان رہاوی کے ہم پایہ تھے، ابراہیم بن ادرمہ فرماتے ہیں کہ اس وقت تین ہی حفاظ رہ گئے ہیں، ان میں ہی ابو مسعود احسن الحدیث ہیں، امام احمد نے بھی ان

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ والعبر ج ۲ و تاریخ بغداد ج ۴۔

کی توثیق منقول ہے، ایک مرتبہ فرمایا کہ تم لوگ ان سے حدیثیں لکھو وہ صدوق ہیں۔ خلیلی اور حاکم نے ان کو ثقہ کہا ہے[1]۔

فضل وکمال ابومسعود رازی کے فضل وکمال اور حدیث میں امتیاز و تبحر کے متعلق کتابوں میں بہت سے علمائے فن اور ماہرین حدیث کے اعترافات موجود ہیں، امام احمد ان کی بڑی تعظیم و توقیر اور ہمیشہ مدح و توصیف کے ساتھ ان کا ذکر کرتے تھے، جب یحییٰ بن معین اور امام احمد کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور احادیث کا بحث و مذاکرہ شروع ہوتا اور یہ حدیثیں بیان کرتے تھے اور امام احمد خاموشی سے سنتے تھے۔ ایک دفعہ پانچ آدمیوں نے پانچ حدیثیں بیان کیں جب انہوں نے چھٹی حدیث بیان کی تو امام بہت مسرور ہوئے کیونکہ ان کو اس کا علم نہ تھا۔ علی بن مدینی ان کو علمائے راسخین میں بتاتے ہیں اور حجاج بن شاعر کہتے ہیں کہ میں نے اس فن میں ان سے زیادہ ماہر اور صاحب کمال آدمی نہیں دیکھا۔ مورخین اور اصحاب سیر نے احد الاعلام محدث اصبہان اور من کبار الائمہ وغیرہ لکھا ہے[2]۔

احادیث کی حمایت ان کے زمانہ میں احادیث کی مخالفت و وضع کا فتنہ بپا تھا۔ اس لئے ائمہ محدثین کی طرح یہ بھی اس کی مخالفت اور احادیث کی حفاظت و نصرت کے لئے کمربستہ رہتے تھے[3]۔

زہد و اتقاء خطیب نے لکھا ہے کہ وہ نیک اور صاحب خیر لوگوں میں تھے اور ابن حبان کا بیان ہے کہ سنن و آداب نبوی کے اتباع و تمسک کا بڑا التزام رکھتے تھے[4]۔

وفات شعبان ۲۵۸ھ میں انتقال کیا[5]۔

تصنیفات ابومسعود رازی کثیر التصانیف تھے مگر ان کی تصنیفات دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں ہیں، اور نہ ان کا کوئی ذکر ملتا ہے، صرف تفسیر وحدیث کی کتابوں کا علمائے سیر نے ذکر کیا ہے تفسیر کی کتاب کا بھی نام نہیں معلوم ہوسکا۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۴ و تہذیب ج ا و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال [2] ایضاً

[3] تہذیب التہذیب ج ا [4] ایضاً و تاریخ بغداد ج ۴ [5] ایضاً۔

مسند اس کتاب نے تذکرہ کیا ہے[1] مگر نام کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم، بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جمع و تالیف میں انہوں نے بڑی چھان بین اور نہایت حزم و احتیاط سے کام لیا تھا، ابومسعود کا خود بیان ہے کہ میرے استاذ عبدالرزاق ایک ایک حدیث کا مجھ سے پانچ سو مرتبہ تکرار کرتے تھے. ایک اور موقع پر فرمایا کہ میں نے ایک ہزار سات سو پچاس اشخاص سے حدیثیں سنیں اور لاکھوں حدیثیں تحریر کیں، لیکن اپنی تصنیف میں صرف تین سو دس شیوخ کی روایتیں شامل کی ہیں جن کی تعداد پانچ ہزار ہے.

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱، العبر ج ۲ و مرآۃ الجنان ج ۲ [2] تہذیب التہذیب ج ۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و رسالہ المستطرفہ

امام مسلم

متوفی ۲۶۱ھ

نام ونسب وابتدائی حالات سلسلۂ نسب یہ ہے مسلم بن حجاج بن مسلم بن وردبن کوشاد۔ ان کا اصلی نام مسلم اور ابوالحسین کنیت اور عساکر الدین لقب تھے[۱]۔ مولد ومسکن کے لحاظ سے اگرچہ ان کے مایۂ خمیر میں عجم کی خاک کا عنصر بھی شامل ہے، لیکن دراصل ان کا سلسلۂ نسب عرب کے مشہور قبیلۂ بنی قشیر سے ملتا ہے اسی بنا پر ان کو قشیری بھی کہتے ہیں[۲]۔

امام مسلم تیسری صدی کے اوائل یعنی ۲۰۶ھ میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے[۳]۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں علم حدیث نے صحابہؓ اور تابعین کے مقدس سینوں سے نکل کر مستقل فن کا قالب اختیار کر لیا تھا، اور ہزاروں مجتہد اور امام پیدا ہو گئے تھے، اس لئے عام طور پر علم حدیث کا غلغلہ بلند تھا، اور اس کے ساتھ خوش قسمتی سے امام صاحب کی ولادت نیشاپور جیسے شہر میں ہوئی تھی جو اس زمانے میں محدثین کا پایہ تخت تھا، اس لحاظ سے لازمی طور پر امام صاحب نے بھی اس مقدس فن کی طرف ایسے مناسب وقت میں توجہ کی جو ہر قسم کے علمی نشو ونما کا اصلی زمانہ تھا، چنانچہ اگر[۴] سال ولادت کے

---

[۱] بستان المحدثین [۲] کتاب الانساب [۳] تاریخ ابن خلکان ج ۲ و تہذیب الاسماء واللغات جلد دوم [۴] امام صاحب کے سال ولادت کے متعلق اگرچہ عام تذکرے متفق اللفظ ہیں تاہم علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا سال ولادت ۲۰۴ھ بتایا ہے اور ان کے سماعت حدیث کی ابتدا ۲۱۸ھ میں قرار دی ہے اس لحاظ سے ان کی سماعت کا زمانہ ۱۴ برس کی عمر سے شروع ہوتا ہے اس سے اگرچہ ہمارے قیاس کی اور زیادہ تائید ہوتی ہے لیکن ہم نے سال ولادت کے متعلق ابن خلکان کا زیادہ اعتبار کیا ہے کیونکہ انہوں نے بطور خود زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے اس کے علاوہ ذہبی کے الفاظ بھی ضعف پر دلالت کرتے ہیں حافظ ابن حجر علامہ ابن کثیر اور بعض مورخین نے بھی ۲۰۴ھ کی روایت کی ہے اور شاہ عبدالعزیز نے ان دونوں کے علاوہ ۲۰۲ھ کی بھی روایت کی ہے۔

Marfat.com

متعلق عام روایتوں کا اعتبار کیا جائے تو انہوں نے ۱۰ برس کی عمر میں حدیث کی سماعت شروع کر دی تھی۔ محدثین کے گروہ میں بہت سے ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے پانچ یا سات برس کی عمر میں حدیث کی سماعت شروع کر دی تھی اور یہ واقعہ ان کے کارناموں میں غیر معمولی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، خود امام بخاری کی سماعت کا ابتدائی زمانہ ۲۰۵ھ سے شروع ہوتا ہے[1]، جس میں ان کا سن دس برس سے زائد نہ تھا، لیکن درحقیقت یہ فخر و مباہات کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ بالکل کم سنی کے زمانہ میں کوئی شخص ایسے عظیم الشان فن کا پورے طور پر متحمل نہیں ہو سکتا۔ امام صاحب کو بھی اس زمانہ کی حالت اور نیشاپور کی علمی وسعت کے لحاظ سے اس قسم کے مواقع حاصل تھے، تاہم انہوں نے علم حدیث کی سماعت کو اس زمانے پر موقوف رکھا جو ہر قسم کی اہلیت کا زمانہ ہوتا ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ انہوں نے اس فن کے نشیب و فراز اور اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر اس میدان میں قدم رکھا، لیکن افسوس ہے کہ امام صاحب کی طالب علمی کے حالات اس قدر کم معلوم ہیں کہ اس کا پتہ بھی نہیں چل سکتا کہ انہوں نے سب سے پہلے کس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، مگر انہوں نے جس سرگرمی کے ساتھ اس مقدس فن کی طرف توجہ کی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں اگرچہ خود خراسان اور نیشاپور میں اسحاق بن راہویہ اور امام ذہلی جیسے اساتذہ فن موجود تھے، تاہم امام صاحب نے ان بزرگوں کو چھوڑ کر ان تمام مقامات کی خاک چھانی، جہاں جہاں علم حدیث کا جلوہ نظر آتا تھا۔ رے کے محدثین میں سے محمد بن مہران جمال اور ابو غسان وغیرہ سے سماعت کی۔ عراق میں امام احمد بن حنبل اور ابو عبداللہ بن مسلمہ قعنبی سے فائدہ اٹھایا، حجاز میں سعید بن منصور اور ابو مصعب سے روایتیں حاصل کیں، مصر میں عمرو بن اسود اور حرملہ بن یحییٰ جو امام شافعیؒ کے ممتاز شاگرد تھے کے خرمن فیض کی خوشہ چینی کی[2]۔ بغداد میں آخر عمر تک سفر کا سلسلہ قائم رکھا، چنانچہ ۲۵۹ھ میں بغداد کا سفر امام صاحب کا آخری سفر تھا[3]۔ کیونکہ اس

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [2] مقدمہ صحیح مسلم للنووی [3] ابن خلکان نے اس سفر کا ذکر ان کے اساتذہ اور تحصیل علم کے ضمن میں کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کا سفر بھی اسی غرض سے روا تھا اگرچہ اس کی خود تصریح نہیں کی، خطیب نے بھی سفر بغداد کا اسی طور پر ذکر کیا ہے مگر ان کے بیان پر لفظ بھی ملتا ہے "وحدث بها" (ج ۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب سے بغداد کے لوگوں نے بھی کسب فیض کیا تھا۔

کے بعد موت نے دو برس سے زیادہ جینے کا موقع نہیں دیا، بغداد میں یحییٰ بن صاعد اور محمد بن مخلد سے استفادہ کیا، احمد بن سلمہ کی رفاقت میں بصرہ اور بلخ کا سفر بھی کیا[1]۔ امام بخاری سے بھی ان کے نیشاپور کے سفر میں بہت کچھ فائدہ اٹھایا[2]، ان بزرگوں کے علاوہ احمد بن یونس یربوعی، اسماعیل بن ابی اویس، عون بن سلام، اسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری، قتیبہ بن سعید، علی بن جعد، محمد بن رمح، ابراہیم بن منذر ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ وغیرہ سے بھی استفادہ کیا[3]۔

امام صاحب کی شہرت امام صاحب کے زمانہ میں علم حدیث کے عام مذاق اور مذہبی احساس کے باہمی اختلاط نے اگرچہ سینکڑوں، ہزاروں ائمہ فن پیدا کر دیئے تھے جن کی شہرت اور فضیلت کا عموماً اعتراف کیا جاتا تھا، اور جن میں اکثر بزرگوں کو امام صاحب کی استادی کا بھی شرف حاصل تھا، تاہم امام صاحب کی فطری قابلیت اور قوت حافظہ نے ان تمام بزرگوں کو اپنے فضل و کمال کا معترف بنالیا، یہاں تک کہ وہ محدثین بھی جو امام صاحب کے ہم درجہ اور فن حدیث کے امام تھے، ان سے روایت کرنے میں مطلق دریغ نہیں کرتے تھے چنانچہ ابوحاتم رازی، موسیٰ بن ہارون، احمد بن سلمہ، ابوعیسیٰ ترمذی، یحییٰ بن صاعد، ابوعوانہ اسفرائنی، اسی قسم کے بزرگ ہیں، ان بزرگوں میں احمد بن سلمہ وہ بزرگ ہیں جو بصرہ اور بلخ کے سفر میں امام صاحب کے رفیق اور پندرہ برس تک صحیح مسلم کی ترتیب میں شریک رہ چکے ہیں، امام صاحب کی طباعی اور ذہانت نے خود ان کے اساتذہ کو اس قدر گرویدہ بنالیا تھا کہ اسحاق بن راہویہ جیسے امام فن ان مختصر الفاظ میں ان کے فضل و کمال کی نسبت پیش گوئی کرتے تھے۔

ای رجل یکون ھذا (خدا جانے یہ کس بلا کا شخص ہوگا۔)

امام صاحب کی تنقید اور حقیقت شناسی کا اس قدر شہرہ تھا کہ ابوزرعہ اور ابوحاتم جیسے واشناس بزرگ ان کو معرفت حدیث میں اس زمانے کے تمام مشائخ پر ترجیح دیتے تھے[4]۔ اسحاق کوسج خود امام سے خطاب کر کے فرماتے تھے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲، تذکرۂ احمد بن سلمہ [2] تاریخ بغداد ج ۱۳ و تاریخ ابن خلکان ج ۲۔ [3] تہذیب الاسماء جلد ۲
[4] تاریخ دبستان المحدثین و تہذیب الاسماء جز ۲ و تاریخ بغداد ج ۱۳ و مقدمہ نووی۔

لن نعدم الخیر ما ابقاک اللہ للمسلمین ۳؎ جب تک خدا آپ کو مسلمانوں کے لئے زندہ رکھے گا بھلائی ہمارے ہاتھ سے جانے نہ پائے گی۔

ابو قریش نے ان کو دنیا بھر کے حفاظ اربعہ میں شمار کیا ہے۔

غرض کہ امام صاحب کی مقبولیت و شہرت اس درجہ کو پہنچ گئی کہ اہل مغرب نے ان کے نام م بخاری جیسے مسلم امام کے نام سے بھی اونچا اچھالا۔

ت امام صاحب کے واقعات زندگی میں ان کی وفات کا واقعہ جس قدر افسوسناک ہے اس یادہ حیرت انگیز اور قابل لحاظ ہے، کیونکہ اس سے امام صاحب کی علمی شیفتگی کا پتہ چلتا ہے واقعہ یہ ہے کہ مین مجلس حدیث میں لوگوں نے امام صاحب سے ایک حدیث پوچھی، سو اتفاق سے ماحب کو وہ حدیث یاد نہ تھی، اس لئے مکان پر آکر اپنے مجموعہ حدیث میں اس کی تلاش شروع کی بان بین میں اس قدر محو ہوئے کہ سامنے خرما کا ایک ڈھیر رکھا ہوا تھا، اس سے نکال نکال کر کھاتے تھے، لیکن حدیث کی فکر میں اس کی مطلق ان کو خبر نہیں ہوئی کہ اس بے خودی کی حالت میں کتنے کھا گئے ہیں یہی واقعہ ان کی موت کا سبب ہوا۔[۱]

عام طور پر تذکرہ نویسوں نے اگرچہ اس واقعہ سے نفیاً یا اثباتاً کچھ تعرض نہیں کیا، لیکن اس کے وقوع عقلاً ممکن بلکہ واقع ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ امام صاحب نے ۲۵ رجب ۲۶۱ھ کو یک شنبہ کے دن نیشاپور میں بوقت شام پچپن برس کی عمر میں ت پائی، دوشنبہ کے دن جنازہ اٹھایا گیا، اور نیشاپور کے باہر ایک مقام نصرآباد میں سپرد کر دیئے گئے۔[۲]

لاق و عادات امام صاحب نہایت پاکیزہ خو اور انصاف پسند تھے۔ اس زمانہ میں اگرچہ

تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و تہذیب التہذیب ج ۱۰ ۔ [۱] تذکرہ ذہبی ج ۲ و تہذیب ج ۱۰ ۔ تاریخ ابن خلکان ج ۲ و تہذیب ۔ اکثر صحیح روایت کے مطابق امام صاحب کی عمر انتقال کے وقت پچپن سال تھی مگر بعض مورخین نے جن میں ان بھی شامل ہیں ستاون سال عمر بتائی ہے۔ [۲] تاریخ ابن خلدون ج ۲۔

Marfat.com

عام طور پر مسلمانوں کی اخلاقی حالت نہایت مہذب اور شائستہ تھی، تاہم جس طرح اس زمانے کے اہل کمال میں باہم ان بن رہتی ہے، اس طرح اُس زمانے کے مقدس اصحاب بھی اس سے خالی نہ تھے۔ اسی بنا پر رجال کی کتابوں میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ باہم معاصرین کی جرح وقدح قابل قبول نہیں کیونکہ وہ لوگ ایک دوسرے کی نسبت رشک وحسد سے بہت کچھ بُرا بھلا کہہ دیا کرتے تھے، یہ محض معمولی درجہ کے لوگوں کا شیوہ نہ تھا، بلکہ یحیٰی بن معین جیسے مقدس اصحاب بھی اس زمرہ میں شامل ہیں، مگر امام صاحب کا دامن ہمیشہ اس قسم کے دھبوں سے پاک رہا اور انہوں نے ہمیشہ نہایت فیاضی سے اس کا عملی ثبوت دیا، نیشاپور کے سفر میں امام بخاری کی مجلس میں ضرور آتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ان کے تبحر علمی سے متاثر ہو کر نہایت بے خودی کی حالت میں پکار اُٹھے، دعنی اقبل رجلیک یا امیر المؤمنین فی الحدیث[۱] یعنی اے ملک حدیث کے بادشاہ مجھ کو قدم بوسی کی اجازت دیجئے، اسی طرح اپنی کتاب مسلم کو خود ابوزرعہ رازی کی خدمت میں پیش کیا، وہ جن حدیثوں کو صحیح بتاتے تھے، ان کو بعینہ قائم رکھتے تھے[۲] لیکن ان کا حقیقی وصف ان کی آزادی اور حق گوئی ہے، اور اس کی وقعت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب مسلمانوں کی عام حالت کا اندازہ کیا جائے، آج تو مسلمانوں کا رواں رواں تقلید کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے لیکن اس زمانے میں بھی قرون اولی کے بعد ہی سے بے جا طرف داری اور ناجائز رعایت کا مادہ پیدا ہو گیا تھا، اور امتداد زمانہ کے ساتھ روز بروز اس کو ترقی ہوتی جاتی تھی۔ لیکن امام صاحب پر اس کا بالکل اثر نہ پڑ سکا وہ اس قدر حق پرست تھے کہ اس کے مقابلہ میں اپنے اساتذہ کا بھی خیال نہیں کرتے تھے، چنانچہ جب امام بخاری نے نیشاپور کا سفر کیا، اور سوء اتفاق سے ایک جزئی سوال یعنی مسئلہ خلقِ قرآن کے متعلق عوام اور عوام کے ساتھ امام ذہلی جیسے نکتہ سنج محدث بھی امام صاحب کے مخالف ہو گئے اور اس مخالفت کا یہ اثر ہوا کہ امام ذہلی نے اپنی مجلس حدیث

---

[۱] خطیب اور ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں۔ دعنی حتی اقبل رجلیک یا استاذ الاستاذین وسید المحدثین وطبیب الحدیث فی علله۔ دیکھو تاریخ بغداد ج ۱۳ والبدایہ ج ۱۱ [۲] مقدمہ مسلم نووی۔

Marfat.com

میں عام اعلان کر دیا۔

الا من قال باللفظ فلا یحل له ان یحضر مجلسنا۔	خبردار جو شخص قرآن مجید کے الفاظ کو مخلوق کہے گا اس کو ہماری مجلس میں آنا حرام ہے

اس موقع پر امام صاحب نے اپنی اسی حق پرستی سے کام لیا، وہ امام بخاری کی رائے کو صحیح سمجھتے تھے، اس لئے ایک حق بات پر امام ذہلی کے شاگردانہ تعلق کو بالکل بھلا دیا اور سر مجلس اپنی چادر تان کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی مجلس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا، اور گھر پر جا کر ان کی تقریروں کے تمام نوشتے اونٹوں پر لدوا کر بھجوا دیئے[1]

امام بخاری کی یہ تائید و حمایت بھی، ایک خاص مسئلہ میں تھی، ورنہ عام طور پر وہ امام بخاری کے بھی ہم زبان نہیں، چنانچہ معنعن روایتوں میں امام بخاری ہمعصری کے ساتھ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات کی جو ایک ضروری شرط قرار دیتے ہیں، امام صاحب اس کے سخت مخالف ہیں چنانچہ صحیح مسلم کے مقدمہ میں جہاں اس مسئلہ کی بحث کی ہے اس کو پڑھ کر سخت حیرت ہوتی ہے، یا تو یہ حال تھا کہ ایک جزئی مسئلہ پر امام ذہلی کے قدیم شاگردانہ تعلق کو چھوڑ کر امام بخاری کے ہم خیال بن گئے اور اپنی عمر کی کمائی (یعنی امام ذہلی کے مجموعۂ حدیث) کی بھی کچھ پروا نہ کی یا خود امام بخاری کی تردید ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

وقد تکلم بعض منتحلی الحدیث من اہل عصرنا فی تصحیح الاسانید و سقمہا بقول لو ضربنا عن حکایتہ وذکر فسادہ لکان رأیا متینا و مذہبا صحیحا اذ الاعراض عن القول المطرح احری۔[2]	یعنی ہمارے زمانہ کے بعض مدعیان حدیث اسانید کی صحت وسقم کے متعلق ایک ایسے قول کے قائل ہوئے ہیں کہ اگر ہم اس کے ذکر اور اس کی تردید سے اعراض کرتے تو اچھا ہوتا کیونکہ مردود اقوال سے اعراض کرنا ہی مناسب ہے۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ و تاریخ ابن خلکان ج ۲ [2] مقدمہ صحیح مسلم

کہاں یہ خوش اعتقادی کہ ان کے فضل و کمال سے متاثر ہو کر نہایت جوش [illegible]
ساتھ فرماتے ہیں

دعنی اقبل رجلیك	یعنی اے علم حدیث کے بادشاہ مجھ
یا امیر المومنین فی الحدیث	کو قدم بوسی کی اجازت دیجئے۔

کہاں یہ کیفیت کہ انہی کا ذکر اس بے پروائی کے ساتھ کرتے ہیں۔

زعم القائل الذی افتتحنا الکلام	ہم نے جس قائل کے قول اور اس کی
علی الحکایة عن قوله والاخبار	غلط فہمی کا ذکر کیا ہے وہ گمان
عن سوء رویته[2]	کرتا ہے۔

الغرض ان کی حق پسند روش، ان کو تقلید، تعصب اور بے جا طرف داری کا مطلق خوگر [illegible]
ہونے دیتی تھی۔ اس لئے وہ اسی شاہراہ پر چلتے تھے جس کی طرف ان کا حق پرست [illegible]
رہنمائی کرتا تھا[3]

تصنیفات و تالیفات امام صاحب کو تصنیف و تالیف کا فطری شوق تھا۔ صحیح مسلم
کو جس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھا، اس کا ذکر ایک مستقل عنوان سے آگے آئے گا لیکن [illegible]
کے علاوہ اور بھی نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں جن کے موضوع اور اجمالی حالت کا اندازہ [illegible]
ان کے نام کی فہرست سے ہوگا۔

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم [2] اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عموماً محدثین کا گروہ اگرچہ کسی امام کا مقلد نہ تھا اور نہ اس کو [illegible]
چاہیئے تھا تاہم جب ان میں کسی بزرگ کا مذہب، کسی خاص امام سے زیادہ ملتا جلتا تھا تو ان کو تقلید پرست لوگ اس [illegible]
طرف منسوب کر دیتے تھے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں

وکان صاحب الحدیث ایضا قد ینسب الی احد المذاھب لکثرة موافقته به کالنسائی والبیھقی ینسبان [illegible]

غالباً اسی بنا پر یا کسی اور وجہ سے صاحب کشف الظنون نے امام صاحب کو ایک ضمنی تذکرے میں امام شافعی کی طرف منسوب کر دیا۔ [illegible]
حقیقت یہ ہے کہ وہ بجائے خود ایک مستقل امام تھے اور ہر مسئلہ کے متعلق اپنی آزادانہ رائے رکھتے تھے اس لئے ان کو کسی مجتہد کی طرف منسوب کرنا [illegible]

Marfat.com

مسند[1] کبیر، الاسماء[2] والکنی، جامع[3] کبیر، کتاب[4] العلل، کتاب[5] التمیز، کتاب[6] الوحدان
کتاب[7] الافراد، کتاب[8] الاقران، کتاب سوالاتہ[9] لاحمد بن حنبل، کتاب حدیث[10] عمرو بن شعیب،
کتاب[11] الانتفاع باہب السباع، کتاب[12] مشائخ مالک، کتاب[13] مشائخ ثوری، کتاب[14] مشائخ شعبہ
کتاب[15] من لیس لہ الا راو واحد، کتاب[16] المخضرمین، کتاب[17] اولاد الصحابہ، کتاب[18] اوہام المحدثین،
کتاب[19] الطبقات، کتاب افراد[20] الشامیین۔

صحیح مسلم

امام صاحب نے اگرچہ جیسا کہ ہم ابھی لکھ آئے ہیں. علم حدیث کے متعلق خاص خاص موضوع پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں، لیکن ان کو صحیح مسلم کی شہرت اور مقبولیت نے اس طرح دبا لیا ہے کہ آج کوئی شخص ان کا نام بھی نہیں جانتا، امام صاحب کی تصنیفات سے قطع نظر کرکے، حدیث کی عام کتابوں کا بھی قریب قریب یہی حال ہے خود صحیح بخاری کو اگرچہ ائمہ فن نے متعدد حیثیتوں سے مسلم پر ترجیح دی ہے، تاہم صحیح مسلم کو یہ شرف قبول حاصل ہے کہ ہمیشہ بخاری کے ساتھ ساتھ اس کا بھی نام لیا جاتا ہے، اس لئے ہم مسلم کی ان خصوصیات کو دکھانا چاہتے ہیں، جنہوں نے اس کو اس قدر شہرت دی ہے۔

اس سلسلے میں جو چیز سب سے زیادہ قابل ذکر ہے وہ اس کتاب کا مقدمہ ہے کیوں کہ اس سے ایک طرف جرح و تعدیل اور اصولِ حدیث کے متعلق نہایت مہتم بالشان نکتے معلوم ہوتے ہیں، اور دوسری طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے جس زمانے میں اس کو مرتب کیا، اس میں کس قدر موضوع حدیثیں پیدا ہو گئی تھیں، اس لئے ایسی حالت میں ایسی صحیح کتاب کا مرتب کرنا کس قدر دشوار اور اہم تھا، اس بنا پر ہم سب سے پہلے اسی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

مقدمہ مسلم مذہب اگرچہ دنیا کی تمام قوموں کو عزیز ہے، تاہم مسلمانوں نے اس کو جس عزت کی نگاہ سے دیکھا، دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ علمی حیثیت سے مسلمانوں نے سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ کی، وہ یہی مذہبی علوم و فنون تھے، ان میں نحو، ادب

تفسیر، فقہ، اصول فقہ، اگرچہ سب کے سب بالذات یا بالواسطہ مذہبی علوم ہیں، اور اس لئے مسلمانوں نے ان سب میں کمال پیدا کیا۔ تاہم ان میں علم حدیث چونکہ مذہب کا سب سے زیادہ ضروری عنصر تھا، اس لئے یہ مقدس فن ایک مدت تک عام طور پر مسلمانوں کے دل و دماغ کا جولان گاہ رہا، اس عام مذاق نے اگرچہ نہایت مفید نتائج پیدا کئے، تاہم چونکہ مذہبی حیثیت سے یہ گروہ نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس لئے نااہل اور خودغرض لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس فن کو محض نام و نمود کا ذریعہ قرار دے کر، موضوع اور غیر معتبر روایتوں کا ایک طوفان اٹھا دیا، چنانچہ خود امام صاحب اپنے مقدمہ میں ضعیف راویوں کا استقصاء کر کے لکھتے ہیں۔

ولا احسب كثيرا ممن يعرج من الناس	ہمارا خیال ہے ان مجہول الاسناد اور
على ما وصفنا من هذه الاحاديث الضعاف	ضعیف روایتوں پر جن کو ہم نے بیان
والاسانيد المجهولة بروايتها بعد	کر دیا ہے ان کے ضعف کے ظاہر ہونے
معرفته وبما فيها من التوهن والضعف	کے بعد بجز ان لوگوں کے جن کو عوام کو نزدیک
الا ان الذى يحمله روايتها و	کثرت سے حدیثیں بیان کرنے کا شوق ہوتا
الاعتداد بها ارادة التكثير بذالك	ہے تاکہ یہ کہا جائے کہ فلاں نے کس کثرت
عند العوام ولان يقال ما اكثر ما	سے حدیثیں جمع کی ہیں اکثر لوگ اعتبار نہ
جمع فلان من الحديث والف من	کریں گے لیکن جو لوگ علم حدیث میں یہ مسلک
العدد ومن ذهب فى العلم هذا	اختیار کرتے ہیں ان کو اس فن میں ذرا بھی
المذهب وسلك هذا الطريق فلا	دخل نہیں، اور ان کو بجائے عالم کے جاہل
نصيب له فيه وكان بان يسمى جاهلا اولى من ان ينسب الى العلم۔	کہنا اچھا ہے۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں محض شہرت کے لئے ہر قسم کی رطب و یابس حدیثوں کے روایت کرنے کا مذاق پیدا ہو چلا تھا۔

لیکن ان خودغرض لوگوں سے گزر کے جو ذخیرۂ غیر معتبر اور موضوع حدیثوں کی روایت میں شہرت

عام رکھتا تھا، وہ متقشف زاہدوں اور مسجد نشینوں کا مقدس فرقہ تھا، چنانچہ اس زمانہ کے نکتہ س
لوگ، ان بزرگوں کو جس نگاہ سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ ذیل کی روایتوں سے ہوگا۔

حدثنی محمد بن ابی عتاب قال اخبرنی عفان عن محمد بن یحیٰی بن سعید القطان عن ابیہ قال لَمْ نَرَ الصّالحین فی شئ اکذب منہم فی الحدیث قال ابن ابی عتاب فلقیت ابا محمد بن یحیٰی بن سعید القطان فسألتہ عنہ فقال عن ابیہ لم تر اھل الخیر فی شئ اکذب منہم فی الحدیث قال مسلم یقول یجری الکذب علی لسانہم ولا یتعمدون الکذب۔
ص ۹۴۔۹۵

مجھ سے محمد بن ابی عتاب اور ان سے عفان اور ان سے محمد بن یحیٰی بن سعید بن قطان اور ان سے ان کے باپ نے حدیث بیان کی کہ ہم حدیث میں صالحین سے زیادہ جھوٹا کسی کو نہیں دیکھتے، دوسری روایت میں ہے کہ ابن ابی عتاب کا بیان ہے کہ میں نے محمد بن یحیٰی بن سعید بن قطان سے ملاقات کی اور اس حدیث کو پوچھا تو انہوں نے اپنے باپ کے ذریعہ سے بیان کیا کہ تم حدیث میں اہل خیر سے زیادہ جھوٹا نہ پاؤ گے، امام مسلم کا بیان ہے کہ ان کے قول کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ جھوٹ بول جاتے ہیں، مگر اس کا قصد نہیں کرتے۔

حدثنا الحلوانی قال سمعت عفان قال حدثت حماد بن سلمة عن صالح المری بحدیث عن ثابت فقال کذب وحدثت ھماما عن صالح المری بحدیث فقال

حلوانی نے ہم سے روایت کی کہ میں نے عفان سے سُنا کہ انہوں نے حماد بن سلمہ کے پاس صالح مری کے ذریعہ سے ثابت سے ایک روایت بیان کی انہوں نے کہا کہ صالح جھوٹ کہتا ہے۔ اسی طرح ان کا

کذب۔ (مقدمہ مسلم ص۱۱)

بیان ہے کہ میں نے صالح مری کے ذریعہ سے ہمام کے پاس ایک حدیث بیان کی انہوں نے فرمایا کہ وہ جھوٹ کہتا ہے۔

حالانکہ صالح مری اتنے بڑے زاہد، خدا ترس اور رقیق القلب تھے جن کی نسبت شارح نووی نے یہ الفاظ لکھے ہیں۔

وکان صالح رحمہ اللہ حسن الصوت بالقرآن وقدمات بعض من سمع قرأتہ وکان شدید الخوف من اللہ تعالیٰ کثیر البکاء قال عفان ابن مسلم کان صالح اذا اخذ فی قصصہ کانہ رجل مذعور یفزعک امرہ من حزنہ وکثرۃ بکائہ کانہ ثکلی۔

(حاشیہ مقدمہ مسلم ص۱۱)

صالح رحمہ اللہ نہایت خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے یہاں تک کہ بہت سے لوگ ان کی قرأت سن کر مر گئے وہ خدا کا سخت خوف کرتے تھے اور اکثر روتے رہتے تھے، عفان بن مسلم کا بیان ہے کہ جب وہ قصے بیان کرتے تھے تو اس خوف زدہ آدمی کی طرح معلوم ہوتے تھے جو اپنے کثرت خوف سے تم کو بھی خوف و دہشت میں مبتلا کر دے گا۔ اور ان کی نوحہ وزاری سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ ایک عورت ہیں جو اپنے لڑکے کا ماتم کر رہی ہے۔

صالح مری کی طرح اور بھی بہت سے بزرگ تھے، جو مذہب کے سخت پابند تھے، لیکن احادیث میں بہت کچھ ملمع سازی کیا کرتے تھے۔

حدثنی محمد بن عبد اللہ بن قہزاد من اھل مرو قال اخبرنی

مجھ سے محمد بن عبد اللہ بن قہزاد مروزی نے روایت کی کہ مجھ کو علی بن حسین بن

علی بن حسین بن واقد قال قال عبد اللہ بن المبارک قلت لسفیان الثوری ان عباد بن کثیر من تعرف حاله واذا احدث جاء بامر عظیم فترى ان اقول للناس لا تاخذوا عنه قال سفیان بلی قال عبد اللہ فکنت اذا کنت فی مجلس ذکر فیه عبادٌ اثنیت علیه فی دینه واقول لا تاخذوا عنه۔

(مقدمہ صحیح مسلم)

واقد نے خبر دی کہ عبد اللہ بن مبارک فرماتے تھے کہ میں نے سفیان ثوری سے کہا کہ آپ تو عباد بن کثیر کا حال خوب جانتے ہیں جب وہ حدیث بیان کرتے ہیں تو قیامت ڈھاتے ہیں، تو کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں کہ میں لوگوں سے کہہ دوں کہ ان کی حدیثیں نہ قبول کرو، انہوں نے کہا ہاں، عبد اللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ اس کے بعد جب کسی مجلس میں عباد کا ذکر آتا تھا تو میں ان کے تدین کی تعریف کرتا تھا، لیکن اسی کے ساتھ ہی لوگوں سے یہ بھی کہتا تھا کہ ان کی حدیثیں قبول نہ کرو۔

حدثنا محمد حدثنا عبد اللہ بن عثمان قال قال ابی قال عبد اللہ بن المبارک انتهیت الی شعبة فقال هذا عباد بن کثیر فاحذروه۔

(مقدمہ صحیح مسلم ص۹۲)

ہم سے محمد، اور ان سے عبد اللہ بن عثمان نے حدیث بیان کی کہ ان کے باپ نے کہا کہ ہم سے عبد اللہ بن مبارک نے فرمایا کہ میں شعبہ کے پاس گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ عباد بن کثیر ہے اس سے بچتے رہو۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض محدثین نے صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ یہ لوگ اس فن میں اہلیت نہیں رکھتے تھے۔

حدثنی احمد بن ابراهیم قال	ہم سے احمد بن ابراہیم اور ان سے سلیمان
حدثنی سلیمان بن الحرب عن	بن حرب اور ان سے حماد بن زید نے
حماد بن زید قال ذکر فرقد عند	روایت کی ہے کہ ایوب کے یہاں فرقد
ایوب فقال ان فرقد الیس صاحب	کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا کہ فرقد
حدیث. (مقدمہ مسلم ص۱۲)	اہل حدیث نہیں۔

حالانکہ فرقد تابعی اور بہت بڑے عابد شخص تھے چنانچہ شارح نووی کہتے ہیں۔

التابعی العابد لا یحتج بحدیثہ	یعنی فرقد تابعی اور عابد شخص تھے۔ اہل
عند اهل الحدیث لکونہ لیس	حدیث کے نزدیک ان کی حدیثوں کا
صنعته کما قدمنا فی قوله لم نر	اس بنا پر اعتبار نہیں کیا جاتا کہ یہ ان کا
الصّلحین فی شیٔ اکذب منهم	فن نہیں تھا، جیسا کہ ہم نے لم نر الصالحین
فی الحدیث۔	فی شیٔ اکذب منهم فی الحدیث کے ذکر میں
(حاشیہ مقدمہ ص۱۲)	بیان کیا۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چونکہ یہ تمام بزرگ نہایت خدا ترس، متقشف اور عبادت گزار ہوتے تھے، اس لئے محدثین نے ان کی دروغ گوئی اور ضعیف روایت کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہ لوگ اہل فن نہ تھے، چنانچہ پہلی حدیث میں خود امام صاحب نے تصریح کر دی ہے کہ یہ لوگ عمداً جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ چنانچہ شارح نووی اس قول کی شرح میں لکھتے ہیں۔

معناہ ماقاله مسلم انه یجری الکذب	یعنی مسلم نے جو یہ کہا ہے کہ وہ لوگ
علی السنتهم ولا یتعمدون ذالك	یوں ہی جھوٹ بول جاتے ہیں لیکن
لکونهم لا یعانون صناعة اهل	اس کا تعمد نہیں کرتے، اس کے معنی
الحدیث فیقع الخطاء فی روایاتهم	یہ ہیں کہ وہ لوگ صاحب فن نہ تھے

ولا یعرفونه ویروون الکذب ولا یعلمون انه کذب۔

(حاشیہ مقدمہ صفحہ ۹۲)

اس لئے ان کی روایتوں میں غلطی واقع ہو جاتی ہے، لیکن وہ لوگ اس کو نہیں جانتے جھوٹ روایت کر دیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ جھوٹ ہے۔

اس وجہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں لیکن ہم کلیتہً اس سے اتفاق نہیں کر سکتے، کیونکہ جس طرح اس زمانے کے عام واعظ، مریدین کو خوش اور مجلس وعظ کے گرمانے کے لئے نہایت عجیب وغریب حدیثیں بیان کر جاتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کی نسبت بھی اس قسم کا خیال پیدا ہو سکتا ہے بہرحال واقعہ جو کچھ ہو، لیکن ان بزرگوں کی یہ تمام خانہ براندازیاں چونکہ مذہب اور مذہب کے ساتھ زہد کے پردے میں تھیں، اس لئے عام طور کوئی شورش پیدا نہیں ہوئی۔ خیر اس بنا پر محدثین کے گروہ میں زیادہ تر شور وغل اس وقت ہوا، جب عقائد کے متعلق متبدعانہ خیالات ظاہر ہوئے۔ اسلام میں اختلافی مسائل کی بنیاد اگرچہ آنحضرتؐ کے بعد ہی پڑ گئی تھی، لیکن بدعت کا آغاز صحابہؓ کے آخری زمانہ میں ہوا چنانچہ معبد جہنی غیلان دمشقی، یونس اسواری نے اسی زمانہ میں قضا وقدر کا انکار کیا۔[1] تابعین کے زمانے میں اس قسم کے اور بھی بہت سے گمراہ پیدا ہوئے، چنانچہ جعد بن درہم نے بنی امیہ کے زمانے میں ایک عجیب وغریب خیال ظاہر کیا، اس نے صراحۃً دعویٰ کیا کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا اور نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔[2] اس جرم پر اس کو خالد بن عبد اللہ قسری نے جو ہشام بن عبد الملک کی طرف سے عراق کا گورنر تھا۔ عید اضحیٰ کے دن عجیب شان سے قتل کیا۔ پہلے اس نے ایک عام اعلان کیا کہ میں آج خدا کی راہ میں قربانی کرنا چاہتا ہوں جس کو شریک ہونا ہو شریک ہو، اس طور پر اس نے مسلمانوں کے مجمع عام میں قربانی کی۔[3] اس کے

---

[1] ملل ونحل شہرستانی وحاشیہ ملل ابن حزم جلد اول مطبعہ ادبیہ مصر طبع اول، ۱۳۲۱ھ و شرح مواقف ج ۲ [2] میزان الاعتدال ذہبی جلد ۱ مطبعہ سعادت مصر ۱۳۲۵ھ [3] اس کا واقعہ نہایت مشہور ہے اسی کی طرف علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ فقتل علی ذالک بالعراق یوم النحر قصۃ مشہورۃ میزان الاعتدال جلد اوّل۔

راس کا عام مذاق پیدا ہوگیا اور نہایت کثرت سے لوگوں نے محدثین کے خلاف اپنے خیالات ظاہر
ناشروع کئے۔ جہم بن صفوان نے جس کی طرف فرقہ جہمیہ منسوب ہے، نصر بن سیار کے زمانے میں
رمیں اپنی بدعت کی اشاعت کی، وہ جبریہ اعتقاد رکھتا تھا۔ اس لئے بندے کو مجبور محض قرار دیتا تھا
ءجرم پر سالم بن احوز المازنی نے اس کو بنی امیہ کے آخری زمانے میں مرو میں قتل کر ڈالا[1]۔ تقریباً
ءزمانے میں بصرہ میں واصل بن عطاء الغزال جو حسن بصری کا شاگرد تھا اور اس کے شاگرد عمرو بن
ید نے اعتزال کی بنیاد قائم کی۔ مقاتل بن سلیمان مفسر نے خراسان میں خدا کے لئے ہر قسم کی
فات ثابت کیں اور جسمیت کا قائل ہوا، ان سب کے بعد سجستان میں ابو عبداللہ بن کرام نے چند
اہب سے کچھ مسائل اخذ کر کے ایک جدید مذہب قائم کیا اور اس کو ایک کتاب کے ذریعے سے
اسان وغیرہ میں رواج عام دیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایمان محض قول باللسان کا نام ہے۔ اس لحاظ
ے اگر کوئی شخص دل میں کفر کا اعتقاد رکھے اور زبان سے خدا اور شریعت کا اقرار کرے تو وہ
ون ہے اس بنا پر نیشاپور میں آٹھ سال تک قید رہا۔ اس کے بعد بیت المقدس چلا گیا، اور شام
ی ۲۵۵ھ میں وفات پائی اور اس کے معتقدین و اصحاب نے اس کی قبر پر اعتکاف کیا[2]۔ اس
کے علاوہ اور بھی بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے، لیکن ہم کو جہاں تک معلوم ہے ان گمراہ سازوں
ین روایتوں کے گڑھنے میں صرف عمرو بن عبید، مقاتل بن سلیمان اور کرامیہ مشہور ہیں۔ جہم بن
صفوان کے متعلق تو علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں صاف تصریح کر دی ہے۔

وما علمته روی شیئا ولکنه زرع شرا عظیما (جلد اول)[3]
ہمارے خیال میں اس نے کوئی روایت نہیں کی البتہ بہت بڑی برائی کا بیج بوگیا۔

اسی طرح غیلان دمشقی، یونس اسواری، جعد بن درہم وغیرہ کا بھی رواۃ حدیث میں شمار نہیں،
کرامیہ عموماً ترغیب و ترہیب کے متعلق وضع احادیث کو جائز رکھتے تھے اور بعض ریاکار زاہد
بھی اس خیال میں ان ہی کے ہمزبان تھے۔ ان کا دعویٰ محض زبانی نہ تھا، بلکہ اس کو استدلال سے

---

[1] ملل و نحل شہرستانی جلد اول [2] ایضاً [3] میزان الاعتدال ذہبی ج ۳

Marfat.com

بھی ثابت کرتے تھے، مثلاً ایک روایت میں ہے،

مَن کذب علیّ متعمداً لیضل به فلیتبوأ مقعده من النار	یعنی گمراہ سازی کے لیئے جو میری طرف جھوٹ باتیں منسوب کرتا ہے اس کو جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالینا چاہیئے۔

اور چونکہ ترغیب وترہیب کے لئے جھوٹ بولنا گمراہ سازی میں داخل نہیں اس لئے اس کا مرتکب شرعی مجرم نہیں قرار پاسکتا، اسی طرح بعض کا یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ اس دروغ مصلحت آمیز سے آنحضرتؐ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا[۱]۔ اس لئے اس پر من کذب علیّ[۲] کا حکم نہیں جاری ہوسکتا، لیکن اس کا مجرم صرف کرامیہ اور زہاد کو قرار دینا خلافِ انصاف ہے، خود ہمارے علماء بھی اس قسم کی حدیثوں میں بہت کچھ سہل انگاری کرتے ہیں[۳]۔ مقاتل بن سلیمان کا وضع حدیث میں جو پایہ تھا، اس کا اندازہ میزان الاعتدال کی اس عبارت سے ہوسکتا ہے۔

عن النسائی قال والکذابون المعروفون بوضع الحدیث ابن ابی یحییٰ بالمدینة والواقدی ببغداد ومقاتل بن سلیمان بخراسان ومحمد بن سعید الشامی۔ (جلد ۲ صد ۶۳)	یعنی امام نسائی نے فرمایا کہ مدینہ میں ابن ابی یحییٰ بغداد میں واقدی، خراسان میں مقاتل بن سلیمان اور شام میں محمد بن سعید نہایت جھوٹے اور وضع حدیث میں مشہور ہیں۔

معتزلہ کا گروہ چونکہ زیادہ تر عقلیات کا شیفتہ تھا، اس لئے روایتوں سے بہت کم اعتنا رکھتا تھا لیکن اس گروہ میں صرف عمرو بن عبید ننگ خاندان ہے اس کو حسن بصری کی صحبت کا شرف حاصل تھا اس لئے اکثر روایتوں کو غلط طور پر ان کی طرف منسوب کردیتا تھا، اور اسی کے ساتھ بعض اس قسم کی روایتیں بھی بیان کرتا تھا جس سے معتزلہ کے مذہب کی تائید ہوتی تھی۔

---

[۱] نووی حاشیہ مقدمہ مسلم [۲] مطلب یہ کہ علی الضرر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اس لئے جب ترغیب وترہیب سے شرعی فائدے حاصل ہوتے ہیں تو اس قسم کے جھوٹ بولنے میں کیا حرج ہے [۳] حاشیہ نووی مطبوعہ ہند۔

Marfat.com

حدثنی عمرو بن علی ابو حفص قال سمعت معاذ بن معاذ یقول قلت لعوف بن جمیلہ ان عمرو بن عبید حدثنا عن الحسن ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من حمل علینا السلاح فلیس منا قال کذب واللہ عمرو ولکنہ اراد ان یحوزھا الی قولہ الخبیث۔

(مقدمہ صحیح مسلم ص۱۰)

مجھ سے عمرو بن علی حفص نے روایت کی کہ میں نے معاذ بن معاذ سے یہ کہتے ہوئے سُنا کہ میں نے عوف بن جمیلہ سے کہا کہ ہم سے عمرو بن عبید نے حسن بصری سے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم سے نہیں، انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم، عمرو جھوٹ کہتا ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس روایت کو اپنے مردود قول کی طرف الٹ پھیر کر لائے۔

اس حدیث کی صحت میں کوئی کلام نہیں، لیکن چونکہ عمرو بن عبید نے اس کو غلط طور پر حسن بصری کی طرف منسوب کر دیا تھا، اس لئے عوف بن جمیلہ نے اس کو مردود قرار دیا کیونکہ عمرو بن عبید کو اس حدیث سے معتزلہ کے ایک خیال کی تائید منظور تھی، معتزلہ کا مذہب ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب دائرۂ ایمان سے نکل کر ہمیشہ کے لئے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے، وہ لوگ اس قسم کے مجرم کو فاسق کا خطاب دیتے ہیں، چنانچہ عمرو بن عبید کو اس حدیث کے ظاہری معنی سے اسی خیال کی تائید کرنا منظور تھی، اس کے علاوہ عمرو بن عبید میں یہ کمال بھی تھا کہ خفیف تغیر و تبدل سے احادیث کے اصلی معنی بدل دیا کرتا تھا۔

حدثنی حجاج بن الشاعر قال حدثنا سلیمان بن حرب حدثنا ابن زید، یعنی حمادا قال قیل لایوب ان عمرو بن عبید روی عن الحسن قال لا

مجھ سے حجاج بن شاعر اور ان سے سلیمان ابن حرب اور ان سے ابن زید یعنی حماد نے بیان کیا کہ ایوب سے کہا گیا کہ عمرو بن عبید نے حسن بصری سے روایت کی

Marfat.com

یجلد السکران من النبیذ فقال کذب انما سمعت الحسن یقول یجلد السکران من النبیذ۔ (مقدمہ مسلم)

ہے کہ تاڑی سے نشہ کرنے والے شخص کو کوڑے نہیں مارے جائیں گے انہوں نے فرمایا کہ وہ جھوٹ کہتا ہے میں نے تو ان سے سنا ہے کہ ایسے شخص کو کوڑا مارا جائے گا۔

اس روایت میں عمرو بن عبید نے صرف لفظ "لا" کے بڑھا دینے سے ایسا عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا۔ مختصر یہ کہ اعتزال کی وجہ سے عمرو بن عبید روایت حدیث میں سخت بدنام تھا۔

حدثنی حجاج قال نا سلیمان بن حرب قال سمعت سلام بن ابی مطیع یقول بلغ ایوب انی آتی عمل فاقبل علی یوماً فقال ارأیت رجلا لا تأمنه علی دینه کیف تأمنه علی الحدیث۔ (مقدمہ صحیح مسلم)

مجھ سے حجاج اور ان سے سلیمان بن حرب نے بیان کیا کہ میں نے سلام بن ابی مطیع کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایوب کو معلوم ہوا کہ میں عمرو کے پاس آمد و رفت رکھتا ہوں تو وہ میرے پاس آئے اور فرمایا کہ تمہیں جس شخص کے مذہب پر اعتماد نہیں اس کی حدیثوں پر کیونکر اعتماد کرتے ہو۔

اسی سلسلہ میں محمد بن سعید مصلوب اور عبداللہ بن مسعود ابو جعفر المدنی بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، محمد بن سعید مصلوب کو وضع حدیث میں جو جرأت اور بے باکی تھی، اس کا اندازہ شارح نووی کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے۔

قال خالد بن یزید سمعته یقول اذا کان کلام حسن لم ار بأسا ان اجعل له اسناداً۔

یعنی خالد بن یزید کا بیان ہے کہ میں نے خود اس کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب کوئی اچھا کلام مل جاتا ہے تو مجھے اس کے لئے اسناد گڑھ لینے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔

اسی ضعف روایت کی وجہ سے محدثین نے اس کے سینکڑوں نام بدلے ہیں، تاکہ انہیں مصنوعی ں کے پردے میں اس کا عیب چھپ جائے، اس کے ساتھ یہ مذہبی حیثیت سے بھی متہم تھا چنانچہ احمد نبل کا بیان ہے کہ اس کو زندقہ کی تہمت میں ابوجعفر نے قتل کر ڈالا۔ عبداللہ بن مسور اگرچہ مذہبی حیثیت بدنام نہ تھا تاہم وضع حدیث میں وہ بھی محمد بن سعید کا ہم خیال تھا۔

حدثنا عثمان بن ابی شیبة قال نا جریر عن رقبة ان اباجعفر الهاشمی المدنی کان یضع احادیث کلام حق ولیست من احادیث النبی صلی الله علیه وسلم وکان یرویها عن النبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔ (مقدمہ مسلم)

ہم سے عثمان بن ابی شیبہ نے اور ان سے جریر نے رقبہ کے ذریعے سے روایت کی کہ ابوجعفر ہاشمی مدنی اچھے کلام کو حدیث کے قالب میں ڈھال کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتا تھا حالانکہ وہ آنحضرت صلعم کا کلام نہیں ہوتا تھا۔

اسی طرح عبدالقدوس شامی بھی عام طور پر کذاب خیال کیا جاتا تھا۔

حدثنی احمد بن یوسف الازدی قال سمعت عبدالرزاق یقول ما رأیت ابن المبارك یفصح بقوله کذاب الا لعبد القدوس فانی سمعته یقول له کذاب۔ (مقدمہ مسلم)

مجھ سے احمد بن یوسف ازدی نے بیان کیا کہ میں نے عبدالرزاق سے سنا کہ ابن مبارک کسی شخص کو کذاب نہیں کہتے تھے لیکن میں نے ان کو عبدالقدوس کو کذاب کہتے ہوئے سنا۔

اس فرقہ مبتدعہ میں روافض کا بھی شمار ہے بلکہ اہل حدیث زیادہ تر اسی گروہ سے نالاں ہیں ونکہ یہی لوگ زیادہ تر اپنے مذہب کی تائید میں موضوع اور غلط حدیثیں روایت کرتے تھے چنانچہ ا پر امام شافعیؒ ان کی حدیثوں کو مطلقاً دائرۂ اعتبار سے خارج سمجھتے ہیں حالانکہ ان کو عام طور اہل بدعت کی روایتوں کے قبول کرنے میں اس قدر تشدد نہیں۔

لوذی

حدثنی سلمة بن شبیب قال انا	مجھ سے سلمہ بن شبیب اور ان سے حمیدی
الحمیدی قال نا سفیان قال کان	اور ان سے ابو سفیان نے بیان کیا کہ
الناس یحملون عن جابر قبل ان	قبل اس کے کہ جابر اپنا خیال ظاہر کرے
یظھر ما اظھر فلما اظھر ما اظھر	لوگ اس سے حدیثیں روایت کرتے تھے
اتھمہ الناس فی حدیثہ وترکہ	لیکن جب اس نے اپنا خیال ظاہر کیا تو
بعض الناس فقیل لہ وما اظھر	لوگ اس کو متہم کرتے تھے بلکہ بعض لوگوں
قال الایمان بالرجعة۔[1]	نے اس کو بالکل متروک الحدیث قرار دیا۔
	پھر ان سے پوچھا گیا کہ اس نے کیا خیال ظاہر
	کیا، فرمایا ایمان بالرجعۃ۔
حدثنی حسن الحلوانی قال نا ابو یحیٰی	مجھ سے حسن حلوانی اور ان سے ابو یحییٰ حمانی
الحمانی قال نا قبیصة واخوہ انھما	اور ان سے قبیصہ اور ان کے بھائی نے
سمعا الجراح بن ملیح یقول سمعت	روایت کی کہ ہم دونوں نے جراح بن ملیح
جابر بن یزید عندی سبعون	سے سُنا کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے خود
الف حدیث عن ابی جعفر عن النبی	جابر بن یزید سے یہ سُنا کہ میرے پاس ۷۰
صلی اللہ علیہ وسلم کلھا۔	ہزار حدیثیں ہیں جو کل کی کل آنحضرتؐ سے
(مقدمہ صحیح مسلم)	ابو جعفر کے ذریعہ سے مروی ہیں۔

لیکن بایں ہمہ ہم کو اس گروہ کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اس نے علم حدیث کے متعلق قدماء کی رائے میں ایک نہایت مفید انقلاب پیدا کر دیا، چنانچہ اس کے پہلے، اسناد کا اس قدر التزام نہ تھا، یا تھا تو کم از کم اس کے متعلق اس قدر تشدد سے کام نہیں لیا جاتا تھا لیکن جب بدعت نے زیادہ زور پکڑا تو

[1] روافض کا خیال ہے کہ حضرت علی بادلوں کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں، چنانچہ جب وہ آسمان سے پکاریں گے تو ہم ان کی اولاد کے ساتھ خروج کریں گے۔

محدثین نے اس کی طرف خاص توجہ کی اور اس کو لوازم مذہب سے قرار دیا۔

حدثنا ابوجعفر محمد بن الصباح
قال ثنا اسمٰعیل بن زکریا عن
عاصم الاحول عن ابن سیرین
قال لم یکونوا یسئلون عن الاسناد
فلما وقعت الفتنہ قالوا سموالنا
رجالکم فینظر الی اھل السنۃ
فیوخذ حدیثھم وینظر الی اھل البدع
فلا یوخذ حدیثھم۔ (مقدمہ صحیح مسلم)

ہم سے ابوجعفر محمد بن صباح اور ان سے
اسماعیل بن زکریا اور ان سے عاصم احول
نے ابن سیرین سے روایت کی کہ لوگوں
سے پہلے اسناد نہیں پوچھے جاتے تھے
لیکن جب فتنہ پھیلا، تو لوگ کہنے لگے
کہ ہم کو اپنے راویوں کے نام بتاؤ تاکہ اہل
سنت کو دیکھ کر حدیثیں قبول کی جائیں اور
اہل بدعت کی حدیثیں نہ لی جائیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اسی گروہ کی برکت سے احادیث کی تالیف وتدوین کا سلسلہ قائم ہوا، کیونکہ عمرو بن عبید، جہم بن صفوان، واصل بن عطاء، مقاتل بن سلیمان کے ظہور کا زمانہ، وہ پُرآشوب زمانہ تھا، جس میں ملکی انقلاب کا حشر برپا تھا، حوادث زمانہ نے بنو امیہ کا دفتر الٹ کر بنی عباس کو صاحب تخت وتاج قرار دیا تھا، علماء ومحدثین بھی اس قیامت خیز انقلاب سے محفوظ نہ تھے خراسانی لشکر نے سینکڑوں اہل قلم کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ اس لئے خوف تھا کہ ملکی تغیر کے ساتھ ان خانہ براندازوں کے خیالات سے اسلام کے اصلی عقائد میں کہیں انقلاب نہ پیدا ہو جائے۔ اس بنا پر علماء نے تدوین کتب کی طرف توجہ کی اور علوم شریعت صحابہ اور تابعین کے مقدس سینوں سے نکل کر منظر عام پر آ گئے۔ یہ سچ ہے کہ اس ذریعہ سے مسلمانوں کا اصلی جوہر دقوت حافظہ مٹ گیا لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آج ہمارے پاس جو کچھ بچا کھچا سرمایہ رہ گیا ہے وہ ان ہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

بہرحال یہاں تک جو بحث تھی اس کا تعلق ایک خاص گروہ کے ساتھ تھا، لیکن ایک عام بات جس کا تعلق ہر گروہ اور ہر شخص کے ساتھ ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ کثرت روایت سے احتراز کیا

Marfat.com

جائے، اور اسی کے ساتھ ہر شخص کے فہم و درایت کے موافق روایتیں کی جائیں اور عموماً ہر کس و ناکس سے روایتوں کے قبول کرنے میں سختی اور احتیاط سے کام لیا جائے، چنانچہ صحابہ اور تابعین میں جو لوگ نکتہ سنج اور حقیقت شناس تھے وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔

حدثنا یحیی بن یحیی قال انا ھشیم عن سلیمان التیمی عن ابی عثمان النھدی قال قال عمر بن الخطاب بحسب المومن الکذب ان یحدث بکل ما سمع۔ (مقدمہ مسلم)	ہم سے یحیٰی بن یحیٰی نے روایت کی کہ ہم کو ہشیم نے سلیمان تیمی سے اور ان سے عثمان نہدی نے خبر دی کہ حضرت عمرؓ بن خطاب فرماتے تھے کہ آدمی کے لئے یہی جھوٹ بہت ہے کہ جو کچھ سنے اس کو روایت کر دے۔
حدثنی ابو الطاھر احمد بن عمرو بن عبد اللہ بن عمرو بن سرح قال انا ابن وھب قال قال لی مالک اعلم انہ لیس یسلم رجل حدث بکل ما سمع ولا یکون اماما وھو یحدث بکل ما سمع۔ (مقدمہ صحیح مسلم)	ہم سے ابو الطاہر احمد بن عمرو بن عبد اللہ بن عمرو بن سرح نے روایت کی کہ ہم کو ابن وہب نے خبر دی کہ مجھ سے امام مالک نے فرمایا کہ تم خوب سمجھ لو کہ جو شخص جو کچھ سنتا ہے اور اس کی روایت کرتا ہے وہ خطا سے نہیں بچ سکتا اور وہ شخص امام نہیں ہو سکتا۔
حدثنی ابو الطاھر وحرملۃ بن یحیی قالا انا ابن وھب قال اخبرنی یونس عن ابن شھاب عن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبۃ ان عبد اللہ بن مسعود قال ما انت بمحدث	ہم سے ابو الطاہر اور حرملہ بن یحیٰی نے روایت کی کہ ہم دونوں کو ابن وہب نے خبر دی کہ ہم سے یونس نے اور ان سے ابن شہاب نے اور ان سے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ نے روایت کی کہ عبداللہ

Marfat.com

قوماحدیثاً لاتبلغه عقولهم الّاکان لبعضهم فتنة۔

(مقدمہ مسلم)

بن مسعود فرماتے ہیں کہ جب تم کسی قوم کے مبلغ عقل سے باہر حدیث بیان کرو گے تو وہ یقیناً ان میں سے بعض کے لئے فتنہ وفساد ہو گی۔

حدثنی الفضل بن سھل قال حدثنی عفان بن مسلم قال انا ھمام قال قدم علینا ابوداؤد الاعمیٰ فجعل یقول ثنا البراء وثنا زید بن ارقم فذکرنا ذلك لقتادة فقال کذب ماسمع منھم انما کان ذالك سائل یتکفف الناس زمن الطاعون الجارف۔

(مقدمہ مسلم)

مجھ سے فضل بن سہل نے بیان کیا کہ مجھ سے عفان بن مسلم نے روایت کی کہ ہم کو ہمام نے خبر دی کہ میرے پاس ابو داؤد دوا عمی آئے اور کہنے لگے کہ مجھ سے برار نے حدیث بیان کی اور زید بن ارقم نے حدیث بیان کی تو میں نے اس کا ذکر قتادہ کے سامنے کیا، انہوں نے کہا وہ جھوٹ کہتا ہے اس نے ان میں سے کسی سے نہیں سُنا۔ وہ تو طاعون جارف کے زمانے میں لوگوں سے بھیک مانگا کرتا تھا۔

اور درحقیقت قدماء کے یہ اقوال بالکل دور اندیشی پر مبنی ہیں، کیونکہ عادۃً ہر شخص جھوٹی بچی باتیں سُنا کرتا ہے اس لئے کثرت روایت سے کوئی شخص جھوٹ سے نہیں بچ سکتا۔ اسی طرح بہت سی حدیثیں عام لوگوں کے دائرۂ عقل سے خارج ہوتی ہیں اس لئے ان کے سامنے اس قسم کی حدیثوں کے بیان کرنے میں نہایت دقیق اور خطرناک غلطیوں کا احتمال ہے۔

انہی عام غلطیوں میں تدلیس اور واقعہ تاریخی کے خلاف روایتیں بھی ہیں، تدلیس کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اکثر لوگ روایت حدیث میں مجہول اور ضعیف ہوتے تھے

اس لئے اکثر رواۃ ان کے عیوب کی پردہ پوشی کے لئے ان کے نام کو کنیت اور کنیت کو نام سے بدل کر روایات کیا کرتے تھے تاکہ وہ لوگ جن نام اور کنیت کے ساتھ ضعیف مشہور ہیں ان میں التباس اور اشتباہ پیدا ہو جائے۔ اسی طرح بہت سے لوگ واقعۂ تاریخی کے خلاف روایتیں کیا کرتے تھے۔

حدثنا اسحاق بن ابراهيم الحنظلي قال سمعت بعض اصحاب عبد الله قال قال ابن المبارك نعم الرجل بقية لولا انه يكني الاسامي ويسمي الكنى كان دهرا الحديث عن ابي سعيد الوحاظي فاذا هو عبد القدوس.

(مقدمہ مسلم)

ہم سے اسحاق بن ابراہیم حنظلی نے روایت کی کہ میں نے عبداللہ بن مبارک کے بعض اصحاب سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ بقیہ کیا اچھا آدمی تھا۔ اگر وہ ناموں کو کنیت اور کنیت کو ناموں سے نہ بدلتا۔ ایک زمانے تک وہ ابو سعید وحاظی سے روایت کرتا تھا، آخر وہ عبدالقدوس نکلا۔

حدثني عبد الله بن عبد الرحمن الدارمي قال سمعت ابانعيم وذكر المعلى بن عرفان فقال قال حدثنا ابو وائل قال خرج علينا ابن مسعود بصفين فقال ابونعيم اتراه بعث بعد الموت.

(مقدمہ صحیح مسلم)

ہم سے عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی نے روایت کی کہ ہم نے ابونعیم سے معلی بن عرفان کا ذکر سنا وہ فرماتے تھے کہ معلی نے ہم سے ابو وائل کی سند سے روایت کی کہ ہم پر حضرت ابن مسعود نے جنگ صفین میں چڑھائی کی راوی کا بیان ہے کہ ابونعیم نے اس سے کہا کہ کیا تمہارے نزدیک وہ قبر سے اٹھ کر آئے تھے۔

مطلب یہ کہ معلیٰ نے ابو وائل کی طرف اس حدیث کی غلط نسبت کی، کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کی خلافت ختم ہونے سے تین برس پہلے ۳۲ھ یا ۳۳ھ میں وفات پائی اور جنگ صفین حضرت علیؓ کے زمانے میں واقع ہوئی، اس لئے ابو وائل جیسے ثقہ اور ضابط شخص ایسی خلاف عقل حدیث کیوں کر روایت کر سکتے تھے؟ ان تحقیقات کے بعد امام صاحب نے معنعن حدیث کی بحث چھیڑی ہے۔ اور نہایت سختی کے ساتھ امام بخاری کے مذہب کو باطل کیا ہے۔ معنعن روایتوں کے متعلق محدثین کی رائیں نہایت مختلف ہیں، امام بخاری کا مذہب یہ ہے کہ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات ثابت ہونی چاہیئے، متاخرین نے اس سے بھی زیادہ سختی سے کام لیا ہے، چنانچہ قابسی کے نزدیک مطلق لقا بھی کافی نہیں بلکہ اچھی طرح ملاقات کرنی چاہیئے۔ ابوالمظفر سمعانی نے استداد صحبت کی قید لگائی، ابو عمرو الدانی المقری نے ان تمام شرائط پر اس شرط کا بھی اضافہ کیا ہے کہ دونوں میں روایت بھی ثابت ہو، لیکن امام مسلم کے نزدیک صرف راوی اور مروی عنہ کی ہم عمری اور امکان ملاقات صحت روایت کے لئے کافی ہو سکتا ہے بشرطیکہ راوی مدلس نہ ہو۔[1]

اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے[2]۔ ان کا استدلال ہے کہ ثبوت لقا کے بعد معنعن روایت عموماً متصل الاسناد سمجھی جاتی ہے، حالانکہ اس صورت میں ارسال کا احتمال قائم رہتا ہے، فرض کرو، زید نے عمرو سے عمرو نے بکر سے روایت کی، زید اور عمرو میں لقا بھی ثابت ہے، زید ثقہ بھی ہے، لیکن پھر بھی یہ احتمال باقی ہے کہ زید اور عمرو کے درمیان میں کوئی واسطہ ہو، مگر صحت روایت پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا، اسی طرح امکان لقا، کی صورت میں راوی کے غیر مدلس اور ثقہ ثابت ہونے کے بعد ارسال اور انقطاع کا شبہ قابل اعتبار نہیں۔ لیکن درحقیقت امام صاحب کا یہ مذہب صحیح نہیں، کیونکہ جب راوی ثقہ اور غیر مدلس ہے اور لقا بھی ثابت ہے تو اس صورت میں ظن غالب ہے کہ وہ بلا واسطہ روایت کرتا ہے، کیونکہ ثقہ اور غیر مدلس راویوں کے حالات کے تتبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس طور پر حدیثیں اسی

---

[1] مقدمہ مسلم نووی و تدریب الراوی۔ [2] ایضاً

وقت روایت کرتے تھے، جب بذاتِ خود سُن لیتے تھے، لیکن عدم لقا کی صورت میں اس قسم کا غلبہ ظن نہیں پیدا ہو سکتا۔ اب اس تحقیق کے بعد ہم مسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

صحیح مسلم اور اس کی خصوصیات اوپر گزر چکا ہے کہ امام صاحب نے جس زمانے میں صحیح مسلم کو مرتب کیا، اس میں موضوع، ضعیف، غلط ہر قسم کی حدیثیں موجود تھیں، اس بنا پر انہوں نے صحیح کے مقدمہ میں احادیث کی تین قسمیں اور راویوں کے تین طبقے قرار دیئے ہیں :۔

(۱) وہ حدیثیں جو بالکل صحیح ہوں، اور ان کے رواۃ عموماً متقن، حافظ، ضابط اور ثقہ تسلیم کئے گئے ہوں۔

(۲) وہ حدیثیں جن کے رواۃ باعتبار ثقاہت اور حفظ و اتقان پہلے قسم کے راویوں سے کم درجہ رکھتے ہوں۔

(۳) وہ حدیثیں جن کے رواۃ کو عموماً یا اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہو۔

امام صاحب نے تصریح کی ہے کہ میں پہلی قسم کی حدیثوں کے بعد دوسری قسم کی روایتوں کو درج کروں گا۔ لیکن مجھ کو تیسری قسم کی حدیثوں سے کچھ تعلق نہیں[۱]، اس تصریح کے موافق طبقہ ثالثہ کی روایتوں کے متعلق تو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا تھا، البتہ اس مسئلہ میں اہلِ علم نہایت مختلف الرائے ہیں، کہ صحیح مسلم میں دوسرے طبقہ کی حدیثیں درج ہوئیں یا نہیں۔

حافظ ابو عبداللہ حاکم اور حافظ ابو بکر بیہقی کا خیال ہے کہ امام صاحب کو موت نے دوسرے طبقے کی حدیثوں کے تخریج کا موقع نہیں دیا، اس لئے صحیح مسلم میں صرف طبقہ اوّل کی حدیثیں درج ہو سکیں، امام ابو سفیان کا جو خود امام صاحب کے ہم صحبت ہیں، بیان ہے کہ امام صاحب نے ہر طبقہ کے لئے الگ الگ کتابیں مرتب کیں، اور ان میں بالاستقلال ہر طبقہ کی روایتیں جمع کیں، چنانچہ ان ہی کتابوں میں سے ایک صحیح مسلم بھی ہے۔ لیکن قاضی عیاض کی تحقیق ہے کہ صحیح مسلم میں دونوں طبقہ کی حدیثیں موجود ہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ دوسری قسم کی حدیثیں

---

[۱] مقدمہ مسلم

Marfat.com

متابعۃً یا شواہداً درج کی گئی ہیں، اسی طرح ان ابواب میں بھی اس قسم کی حدیثیں آگئی ہیں جن میں پہلے طبقہ کی حدیثیں دستیاب نہ ہوسکیں، اسی طور پر ان راویوں کی روایتوں سے بھی تعرض کیا گیا ہے جن کو بعض محدثین نے معتبر اور بعض نے غیر معتبر قرار دیا ہے، یا یہ کہ ان کے رواۃ متہم بالبدعہ ہیں، جیساکہ خود امام بخاریؒ نے کیا ہے، اس تحقیق کے موافق صحیح مسلم میں بجز ان حدیثوں کے جن کے رواۃ کو عموماً یا اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہے، ہر قسم کی روایتیں درج ہیں[1]۔

بہرحال صحیح یعنی قسم اول کی حدیثوں میں امام صاحب کی شرط یہ ہے کہ حدیث متصل الاسناد ہو، شروع سے اخیر تک ثقہ راویوں کے ذریعے سے مروی ہو، شذوذ و علۃ سے خالی ہو، اس میں امام صاحب کی خصوصیت نہیں بلکہ عموماً محدثین کے نزدیک جب کسی حدیث میں یہ تمام شروط پائے جاتے ہیں تو وہ صحیح تسلیم کی جاتی ہے البتہ اختلاف اس وقت ہوتا ہے جب ان شرائط میں سے کوئی شرط موجود نہ ہو اور ان میں باہم اس شرط کے اشتراط میں اختلاف زیادہ ہو، زیادہ تر اختلاف ان روایتوں میں ہوتا ہے جن میں ایک فریق کے نزدیک صحیح کے تمام شرائط موجود ہوں، اور دوسرے کے نزدیک معدوم، مثلاً امام بخاری کے نزدیک ابو زبیر مکی، سہیل بن ابی صالح، حماد بن سلمہ وغیرہ میں صحیح کے تمام شرائط موجود نہیں، اس لئے وہ ان سے روایت نہیں کرتے، اس کے بخلاف یہ لوگ امام مسلم کے نزدیک قابلِ اعتبار ہیں، اسی طرح عکرمہ، عمرو بن مرزوق سے امام بخاری روایت کرتے ہیں، لیکن امام مسلم ان کو قابلِ روایت نہیں قرار دیتے، اس بنا پر امام مسلم نے امام بخاری کے چار سو چونتیس راویوں سے اور امام بخاری نے امام مسلم کے چھ سو پچیس راویوں سے رویت نہیں کی[2]۔

اس موقع پر اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ بخاری کو قوت اسناد کے لحاظ سے مسلم پر ترجیح ہے، تاہم مسلم میں بھی چند خصوصیتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو امام بخاری کے مقابل میں مرجحانہ حیثیت سے پیش کی جاسکتی ہیں، چنانچہ ہم ان کو ایک خاص ترتیب سے درج کرتے ہیں۔

---

[1] مقدمہ نووی [2] نووی۔

(۱) حسن ترتیب :۔ صحیح مسلم کو جن حیثیتوں سے ایک بے نظیر تصنیف کا خطاب دیا گیا ہے ان میں ایک عام وصف اس کتاب کی طرز ادا، اور حسن ترتیب ہے [1]۔ امام بخاری نے اگرچہ روایتوں کی تنقید میں نہایت احتیاط اور نکتہ سنجی سے کام لیا ہے، تاہم چونکہ وہ متون حدیث سے ایک خاص نتیجہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس لئے ان احادیث کو متعدد طریقوں سے مختلف بابوں میں درج کرتے ہیں، بلکہ اکثر احادیث کو ان ابواب میں درج کر دیتے ہیں، جو بظاہر ان کے بالکل مناسب نہیں ہوتے، اس لحاظ سے بخاری میں اس قدر سوء ترتیبی پیدا ہو گئی ہے کہ متاخرین کے ایک گروہ نے بخاری کی ان روایتوں کا کلیۃً انکار کر دیا، جو نامناسب ابواب میں درج تھیں، کیوں کہ ابواب کے عدم تناسب اور غیر موزونی سے ان کی طرف خیال بھی مائل نہیں ہو سکتا تھا اس کے بخلاف امام مسلم ہر حدیث کو ایک خاص اور مناسب باب میں درج کرتے ہیں، اور اسی کے ساتھ طرق مختلفہ اور اسانید کی تشریح اور رواۃ کے خاص خاص الفاظ کی طرف بھی اشارہ کرتے جاتے ہیں، اس لئے مسلم میں حسن ترتیب کے ساتھ احادیث کی تحقیق اور تفتیش کا موقع بھی نہایت آسانی سے مل سکتا ہے [2]۔

(۲) امام بخاری چونکہ فقہی مسائل کے استباط کی غرض سے احادیث پر مجتہدانہ نظر ڈالتے ہیں، اس لئے اسناد کے متصل ہونے کا بہت کم خیال رکھتے ہیں۔ چنانچہ بخاری میں غیر مسند روایتیں اور تعلیقات کی کثرت اسی کا نتیجہ ہے [3]۔ اسی طرح وہ اجتہاد کے موقعوں پر اکثر ان احادیث کی طرف جو پہلے گزر چکی ہیں، نہایت خفیف اشارہ کرتے جاتے ہیں، اس بنا پر اس طریقہ سے اگرچہ ان کی دقتِ نظر اور اجتہادی قوت کا پتہ چلتا ہے، اور وہ حدیثیں بھی درحقیقت متصل الاسناد اور صحیح ہوتی ہیں، تاہم بظاہر ان کے متعلق بہت سے خدشے پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ ابن حزم ظاہری نے حرمت ملاہی کا اسی بنا پر انکار کر دیا کہ بخاری میں اس کے متعلق جو حدیث مروی ہے وہ منقطع یعنی معلق ہے، لیکن امام مسلم نے چونکہ احادیث کو محض محدثانہ حیثیت سے

---

[1] نووی [2] ایضاً۔ [3] مقدمہ نووی

دیکھا ہے، اس لئے مسلم میں یہ ظاہری فروگذاشت بہت کم نظر آتی ہے۔ چنانچہ تحقیقی رائے کے مطابق اس میں صرف بارہ جگہ تعلیقات یعنی منقطع روایتیں پائی جاتی ہیں۔

(۳) امام بخاری اہل شام سے جو روایتیں کرتے ہیں، ان کے نام اور کنیت میں اکثر ان کو اشتباہ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ نام اور کنیت کے لحاظ سے ان کو مختلف موقعوں پر دو شخص سمجھ جاتے ہیں، لیکن امام مسلم کو کسی موقع پر اس قسم کا دھوکہ نہیں ہوا۔ اس سے امام صاحب کی قوت ممیزہ اور وسعتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔

(۴) امام بخاری کی حدیثوں میں تقدیم و تاخیر، حذف اور اسقاط کی وجہ سے اکثر تعقید اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں، لیکن مسلم کی نشست الفاظ میں کہیں اس قسم کی تعقید نہیں پائی جاتی، یہ سچ ہے کہ بخاری کی دوسری روایتوں کی اعانت سے تعقید کی یہ گرہ کھل جاتی ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ مسلم کا طرزِ ادا بخاری کی نسبت زیادہ صاف، واضح اور قریب الفہم ہے، ان خصوصیتوں کے علاوہ امام صاحب نے عموماً صحیح مسلم میں حزم اور احتیاط کے جو پہلو اختیار کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) محدثین کی درسگاہ میں عموماً درس و تدریس کے دو طریقے معین تھے، ایک تو یہ کہ اساتذہ خود حدیثوں کو پڑھتے تھے اور ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی کرتے جاتے تھے، دوسرے یہ کہ اساتذہ اپنے مجموعہ حدیث کو خود شاگرد کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، وہ اس کو پڑھتا تھا اور شیخ کو محض تشریحِ مطلب کی زحمت گوارا کرنی پڑتی تھی، ان دونوں طریقوں سے اگرچہ احادیث کی صحت اور قطعیت پر مساویانہ اثر پڑتا ہے، تاہم راویانہ حیثیت سے یہ بحث آپڑتی ہے کہ دوسری قسم کی حدیثوں کو "حدثنا" کے ساتھ روایت کر سکتے ہیں، یا نہیں؟ امام بخاری امام زہری، یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ کے نزدیک اس لفظ کے ساتھ روایت کر سکتے ہیں لیکن محدثین کا ایک بہت بڑا گروہ جن میں امام شافعیؒ، امام اوزاعی، امام نسائی جیسے اکابر فن داخل ہیں، ان دونوں قسموں میں تفریق کرتا ہے، اور دوسری قسم کی روایتوں کو صرف "اخبرنا"

سے جائز رکھتا ہے، امام مسلم بھی انہی بزرگوں کے ہم خیال ہیں[1]۔ اس لئے ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ طریقہ کس قدر حزم، احتیاط اور دوراندیشی پر مبنی ہے۔

اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے سب سے پہلے لفظ "حدیث اور خبر" کی حقیقت پر غور کرنا چاہیئے، خبر ایک عام لفظ ہے کیونکہ اس کے لئے بالذات یا بواسطہ محض اظہار واقعہ کی ضرورت ہے، اس کے بخلاف حدیث (گفتگو) ایک ایسی چیز ہے، کہ اس کا وجود بغیر اپنی زبان کے ہو ہی نہیں سکتا، اور اگر کسی دوسرے ذریعہ سے ہو تو وہ محض ترجمانی یا اخبار ہوگا اس بنا پر صرف انہی حدیثوں کو "حدثنا" سے روایت کر سکتے ہیں جن کو شیخ نے خاص اپنی زبان سے بیان کیا ہے[2]۔

(۲) اکثر روایتوں میں راویوں کے الفاظ، متن حدیث کے بعض حروف اور رواۃ کے اوصاف اور نام ونسب میں اختلاف ہو جاتا ہے، اس لئے امام صاحب نہایت احتیاط کے ساتھ ہر ایک کی تفصیل کر دیتے ہیں، جن سے متعدد نتائج پیدا ہوتے ہیں، اولاً تو خود امام صاحب کی وسعتِ نظر اور صداقت کا پتہ چلتا ہے، دوسرے یہ کہ اختلاف لفظ کی وجہ سے بعض موقعوں پر معنوی اختلاف بھی پیدا ہو جاتا ہے[3]۔

(۳) محدثین کے زمانے میں علم حدیث کی وسعت نے بعض ایسے مجموعے پیدا کر دیئے تھے جن میں صرف ایک ہی روایت اور ایک ہی اسناد سے، تمام حدیثیں مروی ہوتی تھیں، اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس قسم کے مجموعوں سے متعدد روایتیں کی جائیں تو بوقتِ روایت ہر حدیث کے لئے تجدید اسناد کی ضرورت ہوگی یا احادیث کے متحد الاسناد ہونے کی وجہ سے بعد کی دوسری حدیثیں، اسی پہلی اسناد پر محمول کر دی جائیں گی، وکیع بن جراح اور یحیٰی بن معین کے نزدیک تجدید اسناد کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن استاذ ابو اسحاق اسفرائینی جو اصولِ حدیث کے بہت بڑے امام ہیں اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں، اور ہر حدیث کو بقید اسناد

---

[1] مقدمہ نووی [2] ایضاً [3] ایضاً

روایت کرنا ضروری سمجھتے ہیں، امام مسلم بھی انہی کے ہم زبان ہیں، اور اپنی خاص روایتوں میں اس کی تفریق کر دیتے ہیں، چنانچہ صحیفۂ ابن ہمام سے جو روایتیں کی ہیں اسی اصول پر کی ہیں[1]۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ امام صاحب کا یہ طرزِ عمل، کس قدر دوراندیشی پر مبنی ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تجدید اسناد سے راوی کی احتیاط اور دیانت کا ٹھیک پتہ چل جاتا ہے، لیکن اس سے قطع نظر کرکے اگر عام طور پر اس طریقہ سے سہل انگاری کی جائے تو آئندہ چل کر رواۃ کی بے احتیاطی سے اکثر حدیثوں میں اختلاط پیدا ہو جائے، اس لئے صداقت اور تورّع کے علاوہ امام صاحب کا یہ اصول بالکل عقل کے موافق ہے۔

(۴) امام صاحب احادیث کی روایت میں اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں کہ لغزش کا گمان بھی نہیں ہو سکتا، چنانچہ سلسلۂ روایت میں ایک موقع پر سلیمان بن بلال اور یحییٰ بن سعید کا نام آگیا ہے لیکن چونکہ امام صاحب نے اپنے شیخ سے ان راویوں کا نام بقید نسب نہیں سنا تھا، اس لئے سلسلۂ روایت میں ان کے نسب کا ذکر اس تصریح کے ساتھ کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خود امام صاحب کا ذاتی اضافہ ہے اس سے امام صاحب کی صداقت اور دیانت کا پتہ چلتا ہے[2]۔

صحیح مسلم کا طریق روایت | ان اصولوں اور شرائط ہی کے لحاظ سے صحیح مسلم ایک بے نظیر اور مستند تصنیف نہیں بلکہ جن ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے، ان میں بھی وہی قطعیت اور قوت پائی جاتی ہے جو اس کتاب کے لئے موزوں تھی، عام طور پر جن بزرگوں کی متصل الاسناد روایتوں کے ذریعہ سے اس کتاب نے شہرت پائی ہے ان کے نام یہ ہیں، ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن سفیان، ابو احمد محمد بن عیسیٰ الجلودی، ابو الحسین عبد الغافر فارسی، ابو عبد اللہ محمد بن الفضل فراوی، امام فقیہ الحرمین ابو الفتح منصور بن عبد المنعم فراری، ابو اسحاق ابراہیم بن ابی حفص، عمرو بن مضر الواسطی۔ ان بزرگوں میں سب سے پہلے امام ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن سفیان

---

[1] مقدمہ نووی [2] ایضاً

نے خود امام مسلم سے روایت کی اس کے بعد علی سبیل الترتیب یہ مبارک سلسلہ امام ابو اسحاق واسطی تک پہنچا، چنانچہ شیخ محی الدین نووی شارح مسلم نے جامع دمشق میں انہی سے پوری کتاب کی سماعت کی، ان بزرگوں میں فضل و کمال اور ثقاہت کے علاوہ جو بات خاص لحاظ کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ یہ تمام اصحاب نیشاپوری اور سن رسیدہ ہیں ان میں اگرچہ امام ابو اسحاق ابراہیم واسطی ہیں، لیکن چونکہ انہوں نے ایک مدت تک نیشاپور میں اقامت کی ہے اس لئے یہ بھی درحقیقت اسی سلسلہ میں داخل ہیں۔ طریق روایت کی اس خصوصیت نے مسلم کو اور بھی قطعی اور یقینی بنا دیا ہے لیکن اس کے علاوہ اہل مغرب کے نزدیک یہ کتاب ابی محمد بن علی القلانسی کی روایت سے بھی مشہور ہے، ابو محمد قلانسی سے ابو بکر احمد بن یحییٰ کے توسط سے ابی العلاء، عبد الوہاب بن عیسٰی نے روایت کی تھی چنانچہ ابو عبد اللہ محمد بن یحییٰ نے مصر میں ان سے اس کتاب کی سماعت کی، اور اس کو خاص اپنی روایت کے ذریعے سے مغرب میں پہنچایا، مگر مغرب کے سوا یہ طریقۂ روایت عام طور پر نہ پھیل سکا، اس لیے تمام تر دار و مدار ابو اسحاق ابراہیم بن سفیان کی روایت پر آجاتا ہے[۱]۔

مسلم کے شروح وغیرہ صحیح مسلم کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی ہو سکتا ہے کہ تعلیقات اور شروح کے علاوہ اہل علم کے ایک بہت بڑے گروہ نے (جن میں وہ اصحاب بھی شامل ہیں جنہوں نے مسلم کے اکثر شیوخ کی آنکھیں دیکھی تھیں) مسلم کے طرز پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں اور مسلم کی احادیث کو خاص اپنی اسانید سے جمع کیا۔ ان کتابوں میں اگرچہ مسلم کی خصوصیتیں نہ پیدا ہو سکیں، تاہم چونکہ اسی پیمانہ پر لکھی گئی تھیں، اس لئے صحت اور [illegible]ت کی جھلک ان میں بھی نظر آتی ہے، اور اسی کے ساتھ چونکہ وہ لوگ اپنی خاص خاص [illegible]نید سے روایتیں کرتے ہیں، اس لئے روایت کے متعدد طرق پیدا ہو جاتے ہیں، اور اس ذریعہ سے علو اسناد کے ساتھ احادیث میں نہایت قوت آجاتی ہے۔ چنانچہ ان میں چند کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

Marfat.com

(۱) تخریج ابی جعفر احمد بن حمدان بن علی النیشا فوری المتوفی ۳۱۱ھ

(۲) تخریج ابی نصر محمد بن محمد الطوسی الشافعی المتوفی ۳۴۴ھ

(۳) مسند الصحیح لابی بکر محمد بن رجا النیشاپوری الاسفرائنی المتوفی ۲۸۶ھ

(۴) مختصر المسند الصحیح علی مسلم للحافظ ابی عوانہ یعقوب بن اسحاق الاسفرائنی المتوفی ۳۱۶ھ

(۵) تخریج ابی حامد احمد بن محمد الشاذکی الفقیہ الشافعی الہروی المتوفی ۳۰۵ھ

(۶) مسند صحیح لابی بکر محمد بن عبداللہ الجوزقی النیشاپوری الشافعی المتوفی ۳۸۸ھ

(۷) المسند المستخرج علی کتاب مسلم للحافظ ابی نعیم احمد بن عبداللہ الاصفہانی المتوفی ۴۳۰ھ

(۸) المخرج علی صحیح مسلم لابی الولید حسان بن محمد القرشی الفقیہ الشافعی ۳۴۹ھ [1]

شروح کی تعداد ان کتابوں سے بھی زیادہ ہے اور ان میں بعض شرحیں قاضی عیاض اور امام جلال الدین سیوطی جیسے ائمہ فن کے قلم سے نکلی ہیں، لیکن آج کل عام طور پر شیخ محی الدین نووی کی شرح زیادہ مشہور اور عام طور پر متداول ہے، شروح کی کثرت کے ساتھ شراح کے سلسلے میں شافعی مالکی، حنفی، غرض ہر مذہب کے لوگ داخل ہیں، اس سے قیاس ہوتا کہ ہر فرقہ بلا تخصیص مذہب مسلم کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

مسلم پر اعتراضات اہل فن نے تنقیدی حیثیت سے مسلم پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں وہ اگرچہ اس کی خوبیوں کے مقابل میں اس قدر کم وقعت اور بے حقیقت ہیں کہ ان کی طرف خیال بھی مائل نہیں ہو سکتا، تاہم چونکہ اس سے اس امر کا اندازہ ہوگا کہ مسلم کی صحت اور خصوصیات کے مقابل میں جب اس زمانہ میں اس سے زیادہ نہ ہو سکا، تو اب اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا، اس لئے ہم خاص طور ان کا ذکر کرتے ہیں۔

مسلم پر ایک عام اعتراض جس میں امام بخاری بھی شامل ہیں، یہ ہے کہ امام مسلم اور بخاری نے بہت سی حدیثوں کو چھوڑ دیا جن کے راویوں کے سند سے وہ خود صحیحین میں روایت کرتے ہیں۔

---

[1] مقدمہ نووی ج ۱ اس سلسلے میں مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی فتح الملہم بھی قابل ذکر ہے۔

یہاں تک کہ اکثر اُن حدیثوں سے بھی اعراض کر گئے ہیں جن کو صحابہؓ کی ایک جماعت نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی تھی، اور صحابہ کے بعد وہ حدیثیں نہایت صحیح طور پر مروی ہوئیں اس سے بڑھ کر یہ کہ صحیفہ ابن ہمام کو یہ دونوں بزرگ بالاتفاق صحیح تسلیم کرتے ہیں، لیکن روایتوں میں خاص خاص حدیثیں منتخب کر لیتے ہیں، حالانکہ صحت اور قطعیت میں وہ تمام مساوی ہیں، اس لحاظ سے بخاری اور مسلم کو احادیث صحیحہ کا کامل مجموعہ نہیں کہا جا سکتا، اس کے علاوہ مسلم نے ضعفاء اور طبقہ ثانیہ کے رواۃ سے بھی روایتیں کی ہیں، حالانکہ صحیح مسلم میں طبقۂ اولیٰ کی روایتوں کا التزام کیا گیا ہے۔[1]

امام ابوالحسن دارقطنی نے خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام الاستدراکات والتتبع ہے۔ اس میں انہوں نے استقراء کر کے صحیحین کی ان روایتوں کی تعداد دو سو بتائی ہے۔[2] لیکن یہ اعتراضات درحقیقت محض عامیانہ اعتراضات ہیں کیونکہ بخاری اور مسلم کو اگر احادیث صحیحہ کا مجموعہ تسلیم کیا گیا ہے، تو صرف اس بنا پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ان میں جو حدیثیں درج ہیں، وہ تمام صحیح اور منقح ہیں، اس لئے اگر بہت سی حدیثیں، ان کتابوں میں درج نہ ہو سکیں تو ان پر کوئی الزام نہیں آ سکتا کیونکہ ان میں تمام صحیح حدیثوں کا حصر مقصود نہیں، اسی طرح مسلم پر ضعف رواۃ اور عدم صحت کا الزام بھی نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ انہوں نے اس قسم کی روایتوں کو متابعات اور شواہد کے سلسلے میں قوت اسناد کے لئے درج کر دیا ہے، اس لئے اس ذریعہ سے اصل حدیث پر کوئی حرف نہیں آ سکتا، اور اس کے ساتھ اکثر راویوں کا ضعف امام صاحب کی روایت کے بعد ظاہر ہوا ہے، چنانچہ احمد بن عبدالرحمٰن بن وہب اسی قسم کے راوی ہیں، اس لئے اس ضعف کا اثر خود امام صاحب کی روایت پر نہیں پڑ سکتا۔

ان اعتراضات سے قطع نظر کر کے جو بات خاص لحاظ کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ معنعن روایتوں کے متعلق اگرچہ امام صاحب کا مذہب صحیح نہیں، تاہم اس کا اثر خود ان کی کتاب پر کچھ نہیں

---

[1] مقدمہ نووی [2] ایضاً

Marfat.com

پڑ سکتا۔ کیونکہ طرق روایت کی کثرت سے صحیح مسلم میں کوئی ایسی حدیث نہیں مل سکتی، جس میں اس غلط اصول پر عمل کیا گیا ہو، چنانچہ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں۔

وان کنا لا نحکم علی مسلم بعمله فی صحیحه بهذا المذهب لکونه یجمع طرقا کثیرة یتعذر معها وجود هذا الحکم الذی جوزه[1]

بہرحال ان معمولی اعتراضات کی بناء پر مسلم کی صحت، تنقید اور احتیاط کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] مقدمہ نووی

امام ابن ماجہؒ

متوفی ۲۷۳ھ

نام و نسب محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، ابن ماجہ لقب اور سلسلۂ نسب یہ ہے:۔

محمد بن یزید بن عبداللہ[1]

ماجہ کو بعض لوگوں نے آپ کے دادا اور بعض نے آپ کی ماں کا نام بتایا ہے لیکن علماء محققین کے نزدیک آپ کے والد کا لقب تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

"ماجہ لقب پدر ابوعبداللہ است نہ لقب جد او نہ نام مادر او۔

قزوین کے مشہور مورخ خلیلی کا بیان ہے کہ "ماجہ یزید کا عرف تھا"، اور محدث رافعی لکھتے ہیں۔

"ان کا نام محمد بن یزید ہے اور ماجہ یزید کا لقب ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان کا شجرۂ نسب اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے: "محمد بن یزید بن ماجہ" مگر پہلی بات زیادہ ثابت ہے[2]"

ولادت ان کا خود بیان ہے کہ میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوا[3]۔

خاندان اور وطن ماجہ سے جو در اصل ماہ یا ماہچہ کا معرب ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابن ماجہ عجمی نژاد تھے، لیکن عرب کے مشہور قبیلہ ربیعہ سے ان کا رشتہ موالات تھا، اس لئے ربعی اور مولی ربیعہ کہلاتے ہیں، عراق، عجم (ایران) کے مشہور اور مردم خیز شہر قزوین کو آپ کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے، اس نسبت سے آپ قزوینی کہے جاتے ہیں[4]۔

---

[1] بستان المحدثین [2] بحوالہ نافعہ ومفوائد جامعہ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ وتہذیب ج ۹ [3] وفیات الاعیان ابن خلکان ج ۲ وشروط الائمۃ الستہ [4] وفیات الاعیان ج ۲ والمنتظم ابن جوزی ج ۵۔

اساتذہ اور شیوخ ان کے شیوخ کی تعداد بکثرت ہے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سو سے زیادہ شیوخ سے استفادہ کیا تھا، امام مالک اور لیث کے تلامذہ سے بھی آپ کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہے، حافظ ابوالقاسم علی بن حسن متوفی ۵۰۱ھ نے ائمہ صحاح کے شیوخ پر ایک مستقل رسالہ تحریر کیا تھا، اس میں ابن ماجہ کے اساتذہ کا بھی ذکر ہے، چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن منذر حزامی م ۲۳۶ھ، ابوبکر بن ابی شیبہ دم ۲۳۵ھ، جبارہ بن مغلس دم ۲۴۱ھ، حمد بن عمارہ بغدادی، داؤد بن رشید دم ۲۳۹ھ، سہل بن اسحاق بن ابراہیم واسطی، عبداللہ بن محمد معروف بحافظ ابوبکر بن ابی الدنیا بغدادی، عبداللہ بن معاویہ دم ۲۴۳ھ، علی بن حسن ہرثمی، علی بن سعید نسائی، محمد بن احمد جوزجانی، محمد بن رمح دم ۲۴۲ھ، محمد بن سعید بغدادی، محمد بن عبداللہ بن نمیر دم ۲۳۴ھ، ابوجعفر محمد بن ہارون بغدادی اور ہشام بن عمار دم ۲۴۵ھ[1]

تلامذہ ابن ماجہ کے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن دینار جرشی، احمد بن ابراہیم قزوینی، ابوالطیب احمد بن روح شعرانی، احمد بن محمد مدنی، اسحاق بن محمد قزوینی، جعفر بن ادریس، ابوبکر حامد ابہری، حسین بن علی، سعدون، سلیمان بن یزید قزوینی، ابوالحسن علی ابراہیم قطان قزوینی، علی بن سعید غدانی، محمد بن عیسیٰ صفار[2]۔

رحلت وسفر امام ابن ماجہ کے زمانہ میں محدثین اطراف عالم میں پھیلے ہوئے تھے، اس لئے انہوں نے حصول حدیث کے لئے مختلف ملکوں کا سفر کیا، خراسان، عراق، حجاز، مصر، شام، بصرہ، کوفہ، مکہ، رے اور بغداد وغیرہ کی تصریح کتابوں میں موجود ہے، شروع میں اکیس، بائیس سال کی عمر تک اپنے وطن قزوین ہی میں جو خود علم وفن کا گہوارہ اور علماء ومحدثین کا مرکز تھا، حدیث اور دوسرے علوم کی تکمیل فرماتے رہے۔ بعد ۲۳۰ھ میں علم کی تلاش وجستجو میں اپنے وطن سے باہر نکلے[3]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ وتہذیب التہذیب ج ۹ [2] ایضاً [3] تاریخ ابن خلکان ج ۲ وتذکرۃ الحفاظ وتہذیب التہذیب ج ۹، خلاصہ تذہیب، تہذیب الکمال۔

حدیث میں امتیاز انہوں نے جب آنکھیں کھولیں تو اس وقت ہر طرف حدیث کے درس و تدریس اور اس کی کتابت و تحریر کا کام سرگرمی سے جاری تھا، اور اسی کی طلب و تکمیل کو فضیلت و کمال کا اصلی معیار خیال کیا جاتا تھا، اس لئے ان کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بھی یہی فن بنا اور اکابر حفاظ و محدثین کی کثرت کے باوجود انہوں نے اس میں اتنا امتیاز و کمال اور ایسی شہرت حاصل کی کہ ان کی علمی جلالت کا سکہ بیٹھ گیا اور بڑے بڑے ائمہ فن ان کی عظمت و برتری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کا اندازہ درج ذیل اقوال سے ہوتا ہے:

اعتراف کمال حافظ ابو یعلی خلیلی فرماتے ہیں "وہ ایک بلند پایہ، معتبر اور لائق حجت محدث تھے، ان کی عظمت و ثقاہت پر اتفاق ہے، ان کو فن حدیث سے پوری واقفیت تھی اور وہ اس کے جلیل القدر حافظ تھے" ابو القاسم رافعی فرماتے ہیں کہ "ائمہ مسلمین میں ابن ماجہ بھی ایک بڑے معتبر امام ہیں، ان کی قبولیت پر سب کا اتفاق ہے" علامہ ابن جوزی تحریر فرماتے ہیں کہ وہ حدیث و تاریخ اور تفسیر کے ممتاز ماہر تھے" علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں "وہ فن حدیث کے امام اور اس کے متعلقات پر بڑا عبور رکھتے تھے" علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ "ابن ماجہ عظیم الشان حافظ و ضابط، صادق القول اور وسیع العلم تھے" علامہ ابن اثیر رقمطراز ہیں کہ "وہ ذی عقل، صاحب علم اور امام حدیث تھے" جمال الدین تغزی بروی لکھتے ہیں "ابن ماجہ امام، حافظ، حجت اور ناقد حدیث تھے ۔۔۔۔۔ ان کو متعدد فنون میں مہارت حاصل تھی" ابن ناصر الدین ارشاد فرماتے ہیں "مشہور علمائے اسلام میں ایک ابن ماجہ بھی ہیں ۔۔۔ وہ حدیثوں کے حافظ اور اس میں نہایت معتبر اور بلند پایہ شخص تھے" حافظ ابن حجر عسقلانی کا بیان ہے کہ "وہ صاحب سنن، حافظ حدیث اور امام فن تھے"[1]

ان اقوال سے ان کے محدثانہ کمال و عظمت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

فقہی مسلک ان کے فقہی مسلک کے بارے میں یقینی طور سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی

---

[1] وفیات الاعیان ابن خلکان ج ۲. تہذیب التہذیب ج ۹، المنتظم فی اخبار الملوک والامم ج ۵، کامل ابن اثیر مطبوعہ لیڈن ج ۷، وشذرات الذہب ج ۲ وغیرہ۔

Marfat.com

گمان غالب یہ ہے کہ وہ بھی عام محدثین کی طرح کسی خاص مذہب فقہ سے وابستہ نہ رہے ہوں گے،
البتہ اہل عراق کے مقابلہ میں ان کا رجحان اہل حجاز کی طرف زیادہ تھا، اس کا اندازہ ان کی سنن سے بھی ہوتا ہے، اسی بنا پر بعض علماء ان کو حنبلی اور شافعی کہہ دیتے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔ علامہ ابن طاہر جزائری فرماتے ہیں "ابن ماجہ وغیرہ علمائے حدیث ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے مقلد نہیں تھے، البتہ فقہاء محدثین امام شافعی، احمد اور اسحاق بن راہویہ وغیرہ کے قول کی طرف میلان رکھتے تھے [۱]"

اعمال و اخلاق امام ابن ماجہ کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں، اس لئے ان کے اعمال و اخلاق کے بارہ میں کوئی تفصیل نہیں بیان کی جا سکتی، حافظ ابن کثیر نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ وہ علم و فضل کی طرح تدوین و تقویٰ اور زہد و صلاح کے بھی جامع تھے، احکام شریعت کی شدت سے پابندی کرتے تھے اور اصول و فروع میں پورے طور پر متبع سنت تھے، اس پر خود ان کی سنن شاہد ہے [۲]۔

متعلقین اور اہل خاندان ان کے خاندانی حالات اور ازواج و اولاد کی بھی تفصیل نہیں ملتی، صرف ان کے ایک صاحبزادے عبداللہ اور دو بھائیوں ابوبکر اور ابو عبداللہ کا محمد بن طاہر نے ان کی وفات اور تجہیز و تکفین کے سلسلے میں ذکر کیا ہے [۳]۔

وفات امام ابن ماجہ نے دوشنبہ ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۳ھ کو چونسٹھ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ دوسرے دن سہ شنبہ کو تجہیز و تکفین ہوئی [۴]۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ۲۷۵ھ میں وفات پائی، ان کے سانحہ وفات پر بعض شعراء نے نہایت پُردرد مرثیے کہے، محمد بن اسود قزوینی کے مرثیہ کا پہلا شعر یہ ہے:-

لقد اوھی دعائم عرش علم　　　وضعضع رکنہ فقد ابن ماجہ

ترجمہ:- ابن ماجہ کی وفات سے علم کے پایہ تخت کے ستون ڈھے گئے۔

---

[۱] توجیہ النظر [۲] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ [۳] شروط الائمۃ الستۃ
[۴] ایضاً۔

یحیٰی بن زکریا طائفی کہتا ہے :-

ایا قبر بن ماجۃ غثت قطرا　　مثنا بالغداۃ و بالعشی[۱]

ترجمہ :- اے ابن ماجہ کی قبر تو صبح و شام باران رحمت سے سیراب ہو۔

تصنیفات | ابن ماجہ کی علمی و تصنیفی یادگاروں میں تین اہم اور مشہور تصنیفات ہیں۔

تفسیر | اس کی اہمیت کا اندازہ علامہ ابن کثیر کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

ولابن ماجۃ تفسیر حافل　　یعنی ابن ماجہ کی ایک ضخیم و جامع تفسیر ہے۔

علامہ سیوطی نے دور صحابہ و تابعین کے بعد کی تفسیروں کا تذکرہ کرنے کے بعد تفسیر ابن جریر کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک اہم ماثوری و منقولی تفسیر اور ابن جریر کی طرح اس میں بھی احادیث و آثار صحابہ و تابعین کو بالاسناد نقل کیا گیا تھا۔

تاریخ | ان کو تاریخ میں بھی درک تھا، اور تاریخ میں بھی کوئی کتاب لکھی تھی، ابن خلکان نے تاریخ ملیح اور حافظ ابن کثیرؒ نے تاریخ کامل کے وصف سے اس کا ذکر کیا ہے۔ حافظ ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ میری نظر سے قزوین میں ابن ماجہ کی تاریخ گذری تھی، یہ دراصل عہد صحابہ سے لے کر مصنف کے زمانہ تک کی تاریخ اور بلاد اسلامیہ اور راویان حدیث کے حالات پر مشتمل ہے[۲] اس سے اس تاریخ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ یہ دست برد زمانہ سے معدوم ہو گئی۔

سنن | ابن ماجہ کا سب سے بڑا علمی و تصنیفی اور دینی کارنامہ ان کی ممتاز اور شہرۂ آفاق تصنیف سنن ہے۔ اس کی بدولت ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، موجودہ کتب احادیث میں ایک اہم اور متداول کتاب خیال کی جاتی ہے، اور اکثر مدارس کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

ترتیب و تعداد احادیث | عام کتب سنن کی طرح اس میں بھی ایمانیات سے وصایا تک کے جملہ ابواب فقہی ترتیب کے مطابق درج ہیں اور یہ بتیس کتب، پندرہ سو ابواب

---

[۱] تہذیب ج ۹ [۲] تذکرۃ الحفاظ۔

Marfat.com

اور چار ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے۔

رواۃ رافعی کا بیان ہے کہ ابن ماجہ سے ان کے جن تلامذہ نے سنن کی روایت کی ہے ان میں چار اشخاص زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) ابوالحسن قطان (۲) سلیمان بن یزید (۳) ابوجعفر محمد بن عیسٰی (۴) ابوبکر حامد ابہری، حافظ ابن حجر نے اس فہرست میں دو ناموں کا اور اضافہ کیا ہے۔ سعدون، ابراہیم بن دینار۔[۱] ان تمام رواۃ میں حافظ ابوالحسن قطان کی روایت کو زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

"ابوالحسن قطان کہ صاحب روایت سنن او ست از جملہ شاگردان رشید او ست[۲]"

سنن کا جو نسخہ ابوالحسن سے مروی ہے اس کی بہت سی روایتیں خود ان کی سند سے بھی منقول ہیں۔

اہمیت سنن ابن ماجہ، حدیث کی ان چھ مشہور اور معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جو صحاح ستہ کہلاتی ہیں، علمائے فن کو اعتراف ہے کہ "یہ اسلامیات کی عظیم ترین اور حدیث کی امہات کتب میں ہے"؛ حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ "سنن سے ابن ماجہ کے علمی تبحر اور کثرت معلومات کا پتہ چلتا ہے" حافظ ابوزرعہ جیسے باکمال محدث کا ارشاد ہے کہ "اگر یہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی تو حدیث کی سب یا اکثر کتابیں بالکل معطل ہو جائیں گی"؛ حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ یہ نہایت جامع وجید کتاب اور بے شمار ابواب و غرائب پر مشتمل ہے۔ سنن ابن ماجہ کی اس عظمت و اہمیت کی بنا پر اس کو ہر زمانہ میں نہایت مستند اور قابل حجت خیال کیا گیا ہے۔ رافعی فرماتے ہیں "محدثین نے اس کو صحیحین اور سنن ابی داؤد و سنن نسائی کے ساتھ شامل کیا ہے اور اس کے مرویات کو حجت و مستند قرار دیا ہے[۳]"

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و بستان المحدثین والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ [۲] تہذیب التہذیب ج ۹ [۳] بستان المحدثین [۴] شذرات جلد ۲۔

خصوصیات سنن ابن ماجہ کو صحاح میں آخری درجہ پہ رکھا گیا ہے تاہم اس میں بھی بعض اہم خصوصیات پائے جاتے ہیں:۔

(۱) اس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جن سے صحاح ستہ کی دوسری کتابیں خالی ہیں، علمائے فن نے اس کی اسی خصوصیت کی بنا پر اس کو صحاح میں شامل کیا ہے[۱]۔

(۲) حسن ترتیب و تبویب کے لحاظ سے تمام کتب حدیث اور صحاح میں اس کو امتیاز حاصل ہے، یعنی جس خوبی کے ساتھ احادیث کو ابواب کے اندر بلا تکرار، اختصار کے ساتھ اس میں نقل کیا گیا ہے، دوسری کتابیں اس سے خالی ہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں

"فی الواقع از حسن ترتیب و سرد احادیث بے تکرار آنچہ کہ ایں کتاب دارد ہیچ از کتب ندارد[۲]"

اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "اس مفید ترین کتاب کی بتویب فقہی اعتبار سے نہایت عمدہ ہے"

(۳) عدم تکرار اور اختصار کے باوجود سنن ابن ماجہ نہایت جامع کتاب ہے اور دوسری کتابوں کی بہ نسبت زیادہ مسائل و معلومات پر مشتمل ہے۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ "ابن ماجہ کی کتاب سنن و احکام کی حیثیت سے بہت عمدہ اور جامع ہے۔ غالباً اسی خوبی کی بنا پہ حافظ ابوزرعہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس کے سامنے حدیث کے دوسرے جوامع اور مصنفات بے کار ہو جائیں گے، ان کا یہ خیال بڑی حد تک صحیح ثابت ہوا چنانچہ حدیث کی بہت سی کتابیں جو صحت و جودت کے لحاظ سے اس سے زیادہ اہم اور بلند پایہ ہیں لیکن ان کو اس کے جیسی شہرت و مقبولیت نہیں حاصل ہو سکی۔ حضرت شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ "اگر کسی شخص کو بہت زیادہ متون پر مشتمل کتاب کی تلاش ہو تو اس کو سنن ابن ماجہ کا مطالعہ کرنا چاہیئے، اس وصف میں وہ دوسری کتب حدیث سے منفرد و ممتاز ہے[۳]"

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ تذکرہ ج ۲ و تہذیب جلد ۹ [۲] بستان [۳] حواشی سعدی۔

(۴) سنن ابن ماجہ میں پانچ ثلاثی روایتیں ہیں، اس خصوصیت میں اس کو صحیح بخاری کے سوا تمام کتب صحاح پر فوقیت حاصل ہے۔

(۵) کتب حدیث کی عام خصوصیات یعنی متعدد اور گوناں گوں تشریحات اور حدیثوں کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں اس میں بھی موجود ہیں بعض حدیثوں کے بارے میں اس قسم کی تصریح بھی ہے کہ "یہ فلاں شہر والوں کی حدیث ہے"۔

کیا سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل نہیں ہے؟ اگرچہ جمہور اور متاخرین علماء کے نزدیک یہ صحاح ستہ میں شامل ہے تاہم بعض لوگوں نے اس کے بجائے موطاء امام مالک اور سنن دارمی کو یہ درجہ دیا ہے، اس لئے اس مسئلہ کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔

شروع میں صرف صحیحین اور سنن ابی داؤد و سنن نسائی کو حدیث کی اہم ترین کتابیں خیال کیا جاتا تھا، حافظ ابن السکن اور حافظ ابن مندہ وغیرہ سے اس کی تصریح منقول ہے[1]۔ اس کے بعد حافظ ابو طاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی ان کتابوں میں شامل کر لیا، ساتویں صدی ہجری کے نامور محدثین میں علامہ ابن صلاح اور علامہ نووی نے بھی ان ہی پانچوں مصنفین کی وفیات ذکر کی ہیں، لیکن غالباً پہلی مرتبہ محمد بن طاہر مقدسی م ۵۰۷ھ نے جو شروط الائمۃ الستہ اور اطراف الکتب الستہ کے مصنف ہیں، امام ابن ماجہ کو بھی مصنفین صحاح کے زمرہ میں شامل کر لیا اور حافظ عبد الغنی مقدسی م ۶۰۰ھ نے پانچوں کتابوں کی طرح اس کے رجال کو بھی مدون کیا، ان کے بعد جمہور متاخرین کے نزدیک یہ روایت چل نکلی، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ "ابن طاہر کے بعد مصنفینِ اطراف و رجال نے ان کی متابعت کی[2]"۔ اسی بنا پر ساتویں صدی ہجری کے نامور محدث نووی کے متعلق جنہوں نے ابن ماجہ کی سنن کو نظر انداز کر دیا تھا حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[3]: "مصنف نے سنن ابن ماجہ کو صحاح میں داخل نہیں کیا۔ حالانکہ خود ان کے عہد میں اور اس کے بعد اس کا چھٹا اہم اور بنیادی کتابوں میں شمار ہونا شہرت پذیر ہو چکا

---

[1] شروط الائمۃ الستہ [2] تدریب الراوی [3] ایضاً

تھا؛ اس سلسلے میں دوسرے علماء اور ائمہ فن کے اقوال یہ ہیں:۔

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ "صحاح ستہ کی ایک کتاب سنن ابن ماجہ بھی ہے"۔ ابن عماد نے بھی اس قول کو نقل کیا ہے، علامہ ابن ناصر الدین فرماتے ہیں۔ "ابن ماجہ کی سنن اسلامیات کی بنیادی کتابوں میں ہے"۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں"۔ ابن ماجہ اس سنن کے مصنف ہیں جو صحاح ستہ میں شامل ہے"۔ ابوالقاسم رافعی فرماتے ہیں"۔ محدثین نے سنن ابن ماجہ کو صحیحین اور سنن ابی داؤد وسنن نسائی کے ساتھ شامل کیا ہے"۔ صاحب مراۃ الجنان لکھتے ہیں"۔ ان کی کتاب ان چھ کتابوں میں سے ایک ہے جس کو بنیادی کتب اور امہات فن میں شمار کیا جاتا ہے۔ حافظ عبدالقادر قرشی کا بیان ہے کہ" جب محدثین کسی روایت کے متعلق رواۃ الائمۃ الستۃ کہتے ہیں، "تو اس سے امام بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کو مراد لیتے ہیں"۔ حافظ سخاوی لکھتے ہیں "علماء نے سنن ابن ماجہ کو موطا پر اس لئے مقدم اور صحاح میں شامل کیا ہے کہ اس میں کتب خمسہ سے بہت سی روایتیں زیادہ ہیں"۔ شارح سندی ارشاد فرماتے ہیں۔"عام متاخرین اس بات کے حق میں ہیں کہ ان کی سنن صحاح کی چھٹی کتاب ہے"۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ "ابن ماجہ جن مفید اور نفع بخش کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں یہ سنن بھی ہے جو صحاح ستہ میں ہے" نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں:"شاہ عبدالحق صاحب دہلوی کا بیان ہے کہ "ابن ماجہ کی سنن کا شمار ان اہم ترین اسلامی وحدیثی کتابوں میں ہوتا ہے جن کو اصول ستہ، کتب ستہ اور صحاح ستہ کہا جاتا ہے، میں اس میں امہات ستہ کا اضافہ کرتا ہوں اور جب محدثین رواہ الجماعۃ کہتے ہیں تو اس سے یہی چھ اشخاص مراد ہوتے ہیں، اور جب رواہ الاربعہ کہتے ہیں تو ان کی مراد شیخین کے بجائے، امام ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ سے ہوتی ہے[1]"۔ دوسرے علماء تراجم وفہرست نے بھی اس کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے[1]۔

---

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۲ وشذرات الذہب ج ۲، الباعث الحثیث، مراۃ الجنان ج ۲، مقدمہ شرح سندی باب ذکر الادیم وتفضل قزوین، فتح المغیث، بستان المحدثین والحطہ فی ذکر الصحاح الستہ۔

لیکن علماء کی ایک جماعت کو مؤطا کو صحاح کی چھٹی کتاب ماننے پر اصرار ہے۔ رزین بن معاویہ عبدری م ۵۲۵ھ نے کتاب التجرید للصحاح والسنن میں کتب خمسہ اور مؤطا امام مالک کی روایتیں درج کی ہیں، ابن اثیر جزری م ۶۰۶ھ نے بھی اپنی کتاب جامع الاصول میں اسی کی تقلید کی ہے، حافظ ابو جعفر بن زبیر غرناطی کہتے ہیں "ان سب میں بہتر وہ کتابیں ہیں جن کے اعتماد پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اور یہ وہی کتب خمسہ اور موطا ہے جو تصنیف میں ان پر مقدم اور مرتبہ میں کمتر نہیں، عبدالغنی نابلسی کا بیان ہے کہ اہل مشرق کے نزدیک چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ اور اہل مغرب کے نزدیک امام مالک کی مؤطا ہے[1]۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنن ابن ماجہ کے مقابلہ میں مؤطا کے ماننے والوں کی تعداد بہت کم ہے، اس لئے یہ قول مرجوح سمجھا جائے گا، لیکن جہاں تک مؤطا کی صحت و جودت اور اہمیت وعظمت کا سوال ہے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ وہ حدیث کی طرح فقہ، آثار اور فتاوائے صحابہ و تابعین سب کا مجموعہ ہے اور مرفوع، موقوف، مرسل و مسند ہر قسم کی روایتوں پر مشتمل ہے، اس لئے اس کی موجودہ شکل و صورت میں اس کا حدیث کی مروج و متداول کتابوں سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس کا جو مقام ہے اس میں حدیث کی کوئی بھی کتاب اس کی ہمسری نہیں کر سکتی، اس کی قدامت، عظمت اور صحت کی وجہ سے اکثر محققین علماء نے صحیحین پر بھی اس کو فوقیت دی ہے، خطیب کے نزدیک وہ تمام جوامع و مسانید سے بڑھ کر ہے[2]۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا بھی یہی خیال ہے، نواب صدیق حسن خان صاحب دہلوی اور ان لوگوں کے نزدیک جو ان کے ہمنوا ہیں، حدیث و فقہ میں صحیح ترین کتاب مؤطا ہے پھر بخاری پھر مسلم، شاہ صاحب نے شرح مؤطا یعنی مصفیٰ کے شروع میں روئے زمین کی تمام کتابوں پر مؤطا کی ترجیح کے سلسلے میں بڑی لمبی بحث کی ہے اور یہی صحیح ہے[3]۔

سنن ابن ماجہ کو مؤطا پر مقدم کرنے کی وجہ اس کی مزید افادیت ہے، جو بہت سی زائد

---

[1] بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث [2] تدریب الراوی [3] مسک الختام شرح بلوغ المرام

حدیثوں کے درج کرنے سے اس میں پیدا ہو گئی ہے، ورنہ صحت و قوت کے اعتبار سے سنن ابن ماجہ کیا صحاح ستہ کی کوئی کتاب بھی موطا کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جا سکتی۔

رہا سنن دارمی کا معاملہ تو اس کے قائل صرف حافظ صلاح الدین خلیل علائی م ۷۶۱ھ ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ "اس میں ضعیف رواۃ اور شاذ و منکر روایتیں بہت کم ہیں، اس لئے سنن ابن ماجہ کے بجائے اس کو صحاح کی چھٹی کتاب قرار دینا بہتر ہے"[1] حافظ ابن حجر کی جانب بھی اس قسم کا قول منسوب کیا جاتا ہے، مگر ان سے اس کے برعکس باتیں بھی منقول ہیں، محمد بن اسمٰعیل امیر یمانی کا بیان ہے کہ وہ موطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شامل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ شارح سنن علاؤ الدین مغلطائی پر جن کے قول پر علامہ خلیل علائی کی رائے میں بنیاد ہے۔ ابن حجر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "دارمی کو مغلطائی سے پہلے کسی نے صحاح میں شامل نہیں کیا اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ انہوں نے حافظ منذری کے قلم سے یہی لکھا دیکھا تھا"[2] حافظ ابن حجر کے ان مختلف اقوال کی بنا پر ان کو علائی کا موید نہیں کہا جا سکتا، لیکن علائی کے قول کا دار و مدار مغلطائی کے ایک خیال پر مبنی ہے جس کے متعلق امیر یمانی لکھتے ہیں کہ علائی کو مغلطائی کے قول سے مغالطہ ہوا ہے حالانکہ مغلطائی کے قول میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ وہ سنن دارمی کو صحاح ستہ میں داخل کرتے ہیں، بلکہ اصلی احتمال یہ ہے کہ انہوں نے اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے کہ اس کے رجال و روایات اکثر و بیشتر صحیح ہیں، سنن ابن ماجہ پر اس کو مقدم اور اہم قرار دیا ہے[3]

بہر حال سنن دارمی کو خواہ صحت و قوت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی سنن پر فوقیت کیوں نہ حاصل ہو لیکن تنہا اس خصوصیت کی بنا پر اس کو ابن ماجہ کی جگہ صحاح ستہ میں نہیں رکھا جا سکتا اور نہ علائی کے ایک منفرد خیال کی وجہ سے جمہور کی رائے کو مسترد کیا جا سکتا ہے۔

صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کا درجہ ان بیانات سے اتنا تو واضح ہو گیا کہ ابن ماجہ کی سنن صحاح ستہ میں شامل ہے، لیکن اس کا مرتبہ پانچوں سے کمتر ہے۔ شارح سندی کہتے ہیں

---

[1] مقدمہ سنن دارمی [2] تدریب الراوی [3] ماتمس الیہ الحاجہ

"وہ کتب خمسہ سے کمتر ہے"۔ ابن وزیر یمانی کا بیان ہے کہ اس کا درجہ سنن نسائی وسنن ابی داؤد کے بعد ہے، لیکن یہ ترجیح مجموعی حیثیت سے ہے، یعنی اس میں دوسری کتابوں کے مقابلہ میں ضعیف روایتیں زیادہ ہیں"۔ مگر کتب خمسہ کی ہر روایت صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی ہر روایت پر فوقیت نہیں رکھتی، بعض علماء کا بیان ہے کہ ابن ماجہ کی بعض روایتیں صحیح بخاری کی بعض حدیثوں سے بھی واضح ہیں[1]

سنن ابن ماجہ کی ضعیف ومنکر روایتیں امام ابن ماجہ کی احتیاط اور کوشش کے باوجود سنن میں ضعیف روایتیں بھی شامل ہوگئی ہیں مگر علمائے فن کے ایک گروہ کے نزدیک ان کی تعداد بہت کم ہے، چنانچہ ابوزرعہ رازی کا بیان ہے کہ "مجھے اس میں بہت کم ایسی حدیثیں ملیں جن میں کسی قسم کا شک یا خرابی ہو، دس سے کچھ زیادہ روایتیں ایسی ہوں گی، ان کی دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے تیس سے کم حدیثوں کو ضعیف الاسناد قرار دیا۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "سنن ابن ماجہ کی تھوڑی حدیثوں کے سوا سب بہتر اور عمدہ ہیں[2]"

مگر حافظ ابن حجر کہتے ہیں "اس میں ضعیف روایتیں بہت زیادہ ہیں"۔ علامہ ذہبی، حافظ ابوزرعہ کے مذکورہ بالا قول پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "تیس سے ان کی مراد ساقط الاسناد حدیثیں ہوں گی، ورنہ جن حدیثوں سے حجت قائم نہیں ہوتی، ان کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے، شاید ایک ہزار کے قریب ہوں"۔ اسی طرح علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ "ابن طاہر نے ابوزرعہ سے جو روایت کی ہے وہ صحیح نہیں ہے، اس کی سند منقطع ہے اگر اس کو محفوظ تسلیم کیا جائے تو غالباً اس سے ابوزرعہ کی مراد ساقط الاعتبار روایتیں ہوں گی، یا ان کی نظر سے اس وقت تک اس کتاب کا تھوڑا حصہ گزرا تھا، ورنہ ابوزرعہ نے سنن ابن ماجہ کی بہت ساری روایتوں کو منکر، باطل اور ساقط بتایا ہے۔

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ بحوالہ امام ابن ماجہ اور علم حدیث [2] شروط الائمۃ الستہ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲۔ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱۔

ان اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن ماجہ میں بھی دوسری کتابوں کی طرح ضعیف روایات ہیں اور ان کی تعداد کتب خمسہ کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ ہے، اسی لئے اس کا درجہ ان کے مقابلہ میں کمتر سمجھا جاتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس سے اس کی اہمیت اور عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ کسی کتاب کا صحاح ستہ میں ہونا اس کی تمام روایتوں کی صحت واسناد کا ثبوت نہیں ہے بلکہ مجموعی حیثیت کے اعتبار سے ان کو صحاح میں شامل کیا گیا ہے۔ شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں "ان چاروں کتابوں (ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ) میں حدیث کی جملہ اقسام، یعنی صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی روایتیں پائی جاتی ہیں اور ان کو صحاح کا نام علی وجہ التغلیب دیا جاتا ہے[1]۔

(۲) محدثین اور علماء رجال نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ سنن کے اندر منکر واہی اور موضوع روایتیں بھی ہیں، صرف حافظ ابن حجر کی رائے ہے کہ اس کی منکر حدیثوں کی تعداد زیادہ ہے ورنہ سیوطی اور ذہبی کے گذشتہ بیانوں سے ظاہر ہے کہ ساقط الاعتبار روایتوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، حافظ ذہبی نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "سنن ابن ماجہ بہترین کتاب ہے کاش اس کو چند واہی حدیثیں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے خراب نہ کردیتیں"[2] علامہ ابن جوزی نے چونتیس حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانی نے ان سب کو اور آٹھ مزید روایات یعنی کل بیالیس حدیثیں نقل کرکے ان پر فنی حیثیت سے بحث کی ہے[3]۔

اس تفصیل سے اگرچہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنن میں منکر روایتیں بھی ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور نہ اتنے بڑے ذخیرہ میں چند منکر و واہی روایات کا پایا جانا کوئی خاص عیب ہے۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ وتوضیح الافکار بحوالہ امام ابن ماجہ اور علم حدیث ومقدمہ زہر الربی علی المجتبیٰ د حواشی سعدی [2] تہذیب ج ۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲، [3] ما تمس الیہ الحاجہ۔

(٣) اس سلسلے کی آخری مگر اہم بحث یہ ہے کہ "ابن ماجہ کے تفردات ضعیف ہیں" حافظ ابن حجر نے ابوالحجاج مزی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ "ابن ماجہ کی وہ سب روایتیں ضعیف ہیں جن میں وہ ائمہ خمسہ سے منفرد ہیں"[1] لیکن حافظ ابن حجر کو خود اس اصول وکلیہ سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اگرچہ سنن ابن ماجہ میں ضعیف ومنکر روایتیں زیادہ ہیں لیکن میرے استقصاء وتتبع کے مطابق ان کے تفردات کے بارہ میں مطلقاً یہ حکم لگانا درست نہیں ہے۔ . . . . . مزی کے قول کو رجال پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔ حدیثوں پر اس کا اطلاق صحیح نہیں ہے کیونکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جن روایتوں میں ابن ماجہ منفرد ہیں ان میں صحیح وحسن ہر قسم کی حدیثیں ہیں"[1] شارح سندی کا بیان ہے کہ "سنن ابن ماجہ میں صحاح خمسہ پر زوائد بہت ہیں اور مشہور یہ ہے کہ ان کے تفردات ضعیف ہوا کرتے ہیں حالانکہ یہ کلیہ صحیح نہیں ہے" مولانا عبدالرشید نعمانی نے حافظ ابن حجر کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "رجال کے متعلق بھی کلی طور پر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا" اور اس کی چند مثالیں دے کر تردید کی ہے[3]۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ضعیف اور بعض منکر روایتوں کے باوجود سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل ہے اور جن حدیثوں میں انہوں نے ائمہ خمسہ سے تفرد کیا ہے۔ ان میں صحیح حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں۔

شروح وتعلیقات سنن ابن ماجہ کے ساتھ علماء نے بڑا اعتناء کیا اور اس کے متعدد حواشی وشروح لکھے جن کی تعداد نسائی کے شروح وحواشی سے زیادہ ہے۔

(١) شرح سنن ابن ماجہ۔ سب سے پہلے علاؤالدین مغلطائی بن قلیج م ٧٦٢ھ نے سنن ابن ماجہ کی ایک جامع شرح لکھنا شروع کی تھی، مگر وہ اس کو مکمل نہ کرسکے، یہ نامکمل شرح پانچ جلدوں میں ہے[2]۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک میں موجود ہے[3]۔

---

[1] تہذیب جلد ٩ ص ٥٣١، انس الساری ص [2] کشف الظنون ج ٢ [3] امام ابن ماجہ اور علم حدیث

(۲) ماتمس الیہ الحاجۃ علیٰ سنن ابن ماجہ۔ شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن م ۸۰۴ھ نے سنن کی ان حدیثوں کی جو کتب خمسہ میں نہیں ہیں، آٹھ جلدوں میں ایک مفصل شرح لکھی،

(۳) شرح سنن ابن ماجہ۔ ابن رجب زبیری کی یہ شرح نایاب ہے، شیخ ابوالحسن سندی نے اپنے حواشی میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۴) الدیباجہ فی شرح سنن ابن ماجہ۔ شیخ کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری م ۸۰۸ھ نے پانچ جلدوں میں شرح لکھی مگر تسوید و تبییض سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔

(۵) شرح سنن ابن ماجہ۔ ابن سبط عجمی برہان الدین ابراہیم بن محمد حلبی م ۸۴۱ھ کی سنن پر ایک لطیف تعلیق ہے۔

(۶) مصباح الزجاجہ۔ علامہ جلال الدین سیوطی م ۹۱۱ھ کا مختصر حاشیہ جو نہایت مقبول و متداول اور سنن کے ساتھ طبع ہو چکا ہے، مصر سے اس کا اختصار بھی شائع ہوا ہے۔

(۷) شرح سنن ابن ماجہ۔ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندی م ۱۱۳۸ھ نے صحاح کی دوسری کتابوں کی طرح اس کا بھی حاشیہ لکھا، جو سنن کے ساتھ چھپ کر بہت مقبول ہوا، اس میں مشکل اور غریب الفاظ اور اعراب کی وضاحت کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے[۱]۔

(۸) شرح انجاح الحاجہ۔ شیخ عبدالغنی بن ابوسعید مجددی دہلوی م ۱۲۹۵ھ کی یہ مختصر مگر جامع شرح ہے اور سنن کے ساتھ حاشیہ پر دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

(۹) حاشیہ بر سنن ابن ماجہ۔ مولانا فخرالحسن گنگوہی نے اس تعلیق کے اندر علامہ سیوطی اور مولانا مجددی دونوں شرحوں کو مفید اضافہ کے ساتھ جمع کیا ہے جو کئی مرتبہ چھپ چکی ہے

(۱۰) مفتاح الحاجہ۔ یہ شیخ محمد علوی کا حاشیہ ہے جو اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا ہے

(۱۱) رفع العجاجہ عن سنن ابن ماجہ۔ مشہور عالم اور مترجم حدیث مولانا وحیدالزماں وقار نواز جنگ نے سنن ابن ماجہ کا اردو ترجمہ اور اس کی مختصر شرح اردو میں لکھی ہے، جو متوسط

---

[۱] کشف الظنون ج ۲ و اضواءالام ج ۱۔

Marfat.com

تقطیع کی تین ضخیم جلدوں میں مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۱۰ھ میں چھپ چکی ہے۔

شرحوں اور حواشی کے علاوہ سنن کے زوائد، رجال اور اس کی دوسری حیثیتوں پر بھی کام کئے گئے ہیں۔

(۱۲) الجزو فی اسماء رجال ابن ماجہ، علامہ ذہبی نے اس میں ابن ماجہ کے ان رواۃ کا تذکرہ کیا ہے، جن سے صحیحین میں کوئی روایت درج نہیں ہے، اس کا قلمی نسخہ دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ میں بیس ورقوں میں موجود ہے۔

(۱۳) زوائد ابن ماجہ۔ یہ حافظ شہاب الدین بوصیری م ۸۴۰ھ کی تالیف ہے۔ اس میں ہر روایت کے اسناد کی قوت وضعف کو بیان کیا گیا ہے، یہ کتاب اگرچہ ناپید ہے لیکن علامہ سندی نے اپنی شرح میں اس کی اہم اور ضروری باتیں نقل کر دی ہیں۔

(۱۴) ماتمس الیہ الحاجہ لمن یطالع سنن ابن ماجہ: یہ دونوں مفید کتابیں مولانا عبدالرشید نعمانی ابن ماجہ اور علم حدیث نے عربی اور اردو میں لکھی ہیں، ان میں ابن ماجہ کے حالات وسوانح اور سنن پر مبسوط تبصرہ کے علاوہ، حدیث کی حجیت، تاریخ و تدوین اور ائمہ اربعہ اور مصنفین صحاح کے شرائط اور امام ابن ماجہ کے عہد تک کے بعض اکابر محدثین کا مختصر تذکرہ بھی ہے۔

Marfat.com

امام ابوداؤد سجستانی

(متوفی ۲۷۵ھ)

نام ونسب سلیمان نام، ابوداؤد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد بن عمر بن عمران[1]

بعض مورخین سے نسب نامہ میں معمولی اختلاف بھی منقول ہے۔

امام کے جد اعلیٰ عمران کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جنگ صفین میں حضرت علی رضی کے ساتھ تھے اور اسی میں ان کی شہادت ہوئی۔[2]

ولادت وخاندان امام ابوداؤد کا خود بیان ہے کہ وہ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے تھے[3] اور مشہور قبیلہ ازد سے ان کا نسبی تعلق تھا اس لئے ازدی کہلاتے ہیں۔

وطن خراسان کے مشہور علاقہ سجستان (سیستان) کو امام صاحب کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے، لیکن بعض لوگوں نے بصرہ کے ایک گاؤں سجستان یا سجستانہ کو آپ کا وطن بتایا ہے، جو صحیح نہیں، محمد بن طاہر مقدسی لکھتے ہیں "میں نے محمد بن نصر رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ امام ابوداؤد کا وطن بصرہ کا ایک گاؤں سجستان ہے، جو خراسان کے سجستان سے الگ ہے، اسی طرح کی ایک اور روایت بھی ہے، لیکن ابن نصر کا یہ بھی بیان ہے کہ انہوں نے جب بصرہ والوں سے اس کی تحقیق کی تو پتہ چلا کہ وہاں کے لوگ اس نام کے کسی گاؤں سے واقف نہیں، یہ روایات ناقابل اعتماد ہیں، دوسرے معتبر علما و حفاظ حدیث

---

[1] تاریخ بغداد ج ۹۔ و کتاب الانساب ۱۵۔ و تاریخ ابن خلکان ۱۵۰۔ [2] کتاب الانساب۔ و تہذیب التہذیب ج ۴۔

[3] تاریخ بغداد ۹ھ۔

میں سے بھی کسی نے اس طرح کی تصریح نہیں کی ہے کہ ان کا وطن مشہور سجستان کے علاوہ کسی اور جگہ تھا[1]" علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ سجستانی سجستان کی جانب نسبت ہے جو کابل کے ایک مشہور شہر کا نام ہے[2]"۔ شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں" ابن خلکان کو انساب میں مہارت اور تاریخ دانی میں کمال کے باوجود اس نسبت کے متعلق غلط فہمی ہو گئی ہے[3]" اور بقول صاحب طبقات علامہ تاج الدین سبکی یہ وہم ہے' صحیح یہ ہے کہ یہ نسبت سیستان (سجستان) کی جانب ہے جو ایک مشہور ملک اور سندھ و ہرات کے درمیان قندھار کے قریب واقع ہے۔ چشت بھی جو بزرگان چشت کا مسکن ہے اسی ملک کے اندر ہے' اور قدیم زمانہ میں اس ملک کا پایہ تخت بست تھا[3]۔

مگر علامہ ابن خلکان بھی جمہور کے قول کو راجح سمجھتے ہیں' ان کا بیان ہے کہ "سجستانی ..... کی نسبت مشہور شہر سجستان کی جانب ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بصرہ کے ایک گاؤں سجستان یا سجستانہ کی جانب منسوب ہے، واللہ اعلم[4]"

علامہ ذہبی نے بھی دونوں اقوال ذکر کئے ہیں وہ لکھتے ہیں" ابوداؤد کا وطن سجستان ہے جو مکران اور سندھ کے اطراف وجوانب اور ہراں کے مقابل میں واقع ہے۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا تعلق بصرہ کے ایک گاؤں سجستان سے تھا[5]"۔

اس غلط فہمی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ امام صاحب نے آخری عمر میں بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اس لئے بعض لوگوں نے ان کا اصلی وطن بھی اس کے قرب وجوار ہی کے علاقہ کو سمجھ لیا۔

---

[1] کتاب الانساب مقدسی۔ [2] کتاب الانساب سمعانی۔ [3] بستان المحدثین والطبقات۔ [4] تاریخ ابن خلکان [5] تذکرۃ الحفاظ

Marfat.com

اساتذہ و شیوخ حافظ ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب ہے، ان میں امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ابو ثور جیسے بلند پایہ فقہائے محدثین اور یحییٰ بن معین، ہشام بن عبدالملک طیالسی، ابوبکر بن ابی شیبہ اور عثمان بن ابی شیبہ جیسے نامور ناقدین فن اور آئمہ محدثین شامل ہیں، چند اور مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

حیوۃ بن شریح، خلف بن ہشام بغدادی، ربیع بن نافع حلبی، زہیر بن حرب، سعید بن سلیمان، بزار واسطی، سعید بن منصور، سلیمان بن حرب، سلیمان بن عبدالرحمٰن دمشقی شجاع بن مخلد، صفوان بن صالح دمشقی، عبداللہ بن رجاء بصری، عبداللہ بن محمد نفیلی دمشقی عمرو بن عون بزار واسطی، ابو رجاء قتیبہ بن سعید، محمد بن بشار بندار بصری، محمد بن صباح بزار دلابی، محمد بن منہال، مسدد بن مسرہد، ہشام بن خالد ازرق دمشقی، ہناد بن عمرو اور ابو محمد وہب بن بقیہ وغیرہ[1]

تلامذہ امام صاحب کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے، سنن کے رواۃ میں ابو عمرو احمد بن علی بن حسن بصری، ابو علی محمد بن احمد عمرو لؤلؤی، ابو الطیب احمد بن ابراہیم اشنانی، ابو سعید احمد بن محمد بن زیاد اعرابی، ابوبکر محمد بن عبدالرزاق بن داسہ، ابو الحسن علی بن حسن بن عبد انصاری، ابو عیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید رملی، اور ابو اسامہ محمد بن عبدالملک بن یزید رواس۔

دوسری کتابوں کے رواۃ یہ ہیں: ابو عبداللہ محمد بن احمد بصری، ابوبکر احمد بن سلیمان نجار، اسماعیل بن محمد صفار، ابو عبید محمد بن علی بن عثمان آجری اور دوسرے مشہور علماء میں آپ کے صاحبزادے ابوبکر بن ابی داؤد، ابو عوانہ، یعقوب بن اسحاق

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ و مقدمہ غایۃ المقصود۔

Marfat.com

الفرائض، حرب بن اسماعیل کرمانی، زکریا ساجی، ابوبکر احمد بن محمد خلال اور احمد بن محمد بن لیسین ہروی وغیرہ۔

صحاح ستہ کے مصنفین میں امام ترمذی اور امام نسائی کو بھی آپ سے تلمذ حاصل ہے[1]۔ اور امام احمد نے بھی جو ان کے اساتذہ میں تھے، ایک حدیث ان سے روایت کی ہے[2]، امام ابوداؤد کے تلامذہ میں چار اشخاص زیادہ مشہور و ممتاز ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں۔

"وچہار کس از جملہ شاگرد ان او خیلے سرآمد محدثین شدند اول پسرش ابوبکر بن ابی داؤد، دوم لولوی، سوم ابن الاعرابی، چہارم ابن داسہ[3]"

سماع حدیث کے لئے سفر ابوداؤد نے اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق حصول حدیث کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ وہ سجستان میں پیدا ہوئے، لیکن بصرہ کو مسکن بنایا، جو اس زمانہ میں علم وفن اور محدثین وفقہا کا بڑا مرکز تھا، کئی بار بغداد تشریف لے گئے۔ حجاز، عراق، خراسان، مصر، شام، جزیرہ، نیشاپور، مرو اور اصبہان وغیرہ کے محدثین کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر ان سے استفادہ کریں[4]۔

حفظ وضبط ان کا حافظہ نہایت قوی اور ذہن بڑا رسا تھا، محمد بن لیسین ہروی فرماتے ہیں "حفاظ حدیث میں ابوداؤد بھی ایک مشہور حافظ ہیں" ابوحاتم کا بیان ہے کہ وہ حفظ کے اعتبار سے دنیا کے اماموں میں ایک امام تھے۔ محمد بن مخلد فرماتے ہیں کہ ابوداؤد ہزاروں حدیثوں کا مذاکرہ کرتے تھے اور جب انہوں نے سنن مرتب کی تو تمام اہل زمانہ ان کے حفظ و تقدم کے معترف ہو گئے[1]، امام نووی فرماتے ہیں کہ جمہور اسلام کو ان کے کمال حفظ کا اعتراف ہے[2]۔

---

[1] تہذیب ج، تہذیب الاسماء واللغات، تہذیب التہذیب ج والمنتظم۔
[2] تہذیب ج ۴ و تہذیب الاسماء واللغات ۲۲۵

جرح وتعدیل حفظ وضبط اور ثقاہت وعدالت کی طرح جرح وتعدیل میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا اور صحیح وسقیم، قوی وضعیف، مشہور ومنکر اور حسن و شاذ ہر قسم کی روایتوں کے پرکھنے میں ان کو پورا ملکہ حاصل تھا، ان کی قوتِ تمیز، نقد ونظر اور ثقاہت وعدالت پر اساطین فن کا اتفاق ہے، محمد بن یٰسین ہروی فرماتے ہیں کہ "وہ احادیث نبوی کے حافظ وواقف کار بھی تھے اور ان کی اسناد وعلل کے ماہر بھی،، ابوعبداللہ بن مندہ کا بیان ہے کہ "احادیث کی تخریج، معلول وثابت اور غلط وصحیح میں تمیز کرنے والے چار آدمی ہیں، امام بخاری اور امام مسلم اور ان کے بعد ابوداؤد اور نسائی" حافظ ابن جوزی جیسے سخت گیر کو بھی علل حدیث میں ان کی معرفت کا اعتراف ہے" ابوحاتم فرماتے ہیں کہ "وہ احادیث میں نہایت معتبر ومتقین اور امام تھے[1]"

حدیث میں کمال ابوداؤد اس دور میں پیدا ہوئے تھے جب دنیائے اسلام نامور محدثین سے معمور تھی، اس زمانہ میں انہوں نے اس فن میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ائمہ حدیث اور اساطین فن میں ان کو امتیازی درجہ حاصل ہوگیا۔ اور سب نے ان کی جلالتِ قدر کا اعتراف کیا۔ ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ "فن حدیث ان کے لئے اس طرح آسان ہوگیا تھا، جس طرح حضرت داؤد کے لیے لوہا نرم اور موم بن گیا تھا" موسیٰ بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ "وہ دنیا میں تحصیل حدیث اور عقبیٰ میں جنت کے لئے پیدا کئے گئے تھے، میں نے ان سے زیادہ افضل وبرتر کوئی آدمی نہیں دیکھا" احمد بن یٰسین ہروی نے ان کو "فرسان حدیث" میں شمار کیا ہے، حاکم صاحب مستدرک کی رائے ہے کہ "وہ اپنے دور میں امام المحدثین تھے" امام نووی فرماتے ہیں کہ "علما اسلام ابوداؤد کی مدح وتوصیف ان کے وفورِ علم، حدیث میں فہم صائب اور ذہن رسا پر متفق ہیں"۔ محمد بن مخلد کہتے ہیں کہ ابوداؤد کے معاصرین اور اہلِ زمانہ ان

[1] تہذیب التہذیب ج ۴، والمنتظم ج ۵

Marfat.com

کی امامت فن کے معترف تھے۔[۱]

فقہ و اجتہاد اگرچہ امام ابو داؤد کی شہرت محدث کی حیثیت سے زیادہ ہے لیکن فقہ و اجتہاد میں بھی ان کو بڑی بصیرت حاصل تھی اور حدیث کی طرح فقہ میں بھی ان کی نظر وسیع اور گہری تھی، ابو حاتم ان کو امام فقہ قرار دیتے ہیں — صاحب شذرات اور یافعی نے لکھا ہے کہ وہ "حدیث و فقہ دونوں میں ممتاز اور بلند حیثیت رکھتے تھے"۔ بعض علما کا بیان ہے کہ "اصحاب صحاح میں امام بخاری کے بعد اجتہاد و فقہ کے لحاظ سے ابوداؤد کا مرتبہ سب سے بلند ہے" ان پر فقہی ذوق اتنا غالب تھا کہ تمام ارباب صحاح ستہ میں صرف ان ہی کو ابو اسحاق شیرازی نے طبقات الفقہاء میں شامل کیا ہے، اسی فقہی ذوق کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں صرف احکام و مسائل کے متعلق حدیثیں درج کی ہیں۔

تفسیر و دیگر علوم تفسیر کے بھی عالم تھے، اس موضوع پر انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی، حدیث، فقہ و تفسیر کے علاوہ دوسرے علوم سے بھی ان کو پوری واقفیت تھی۔ ابو بکر خلال کا بیان ہے کہ "ابوداؤد اپنے زمانہ کے صاحب فضیلت اور پیش رو امام تھے، علوم کی تخریج و معرفت اور ان کے مواقع و مقامات کی واقفیت و آگاہی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا"

فقہی مذہب ابو اسحاق شیرازی نے طبقات الفقہاء میں ابوداؤد کو حنابلہ میں شمار کیا ہے، ان کے حنبلی ہونے کا ایک قوی قرینہ یہ ہے کہ وہ امام احمد کے خاص شاگرد اور متعدد مسائل میں ان کے ہمنوا تھے۔ لیکن بعض لوگوں نے ان کو شافعی المذہب قرار دیا ہے۔[۲]

تدین و تقویٰ علم و فن کی طرح وہ زہد و تقویٰ کے بھی امام تھے، ابو حاتم کا بیان ہے کہ "وہ فقہ و علم، حفظ و ضبط اور عبادت و تقویٰ ہر اعتبار سے دنیا کے اماموں میں ایک امام تھے"۔ یلین ہروی فرماتے ہیں "وہ بے مثال عالم و حافظ ہونے کے علاوہ عبادت و ریاضت

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۹، ابن خلکان ج ۱، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و تہذیب الاسماء واللغات [۲] اتحاف النبلاء۔

عفت و پاک دامنی، خیر و صلاح اور ورع و تقویٰ میں بھی منفرد خصوصیات کے مالک تھے[1]، آدابِ شریعت کی پابندی اور سنتِ نبوی کے اتباع کا خاص اہتمام تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

"درحفظ حدیث و اتقان، روایت و عبادت و تقویٰ و صلاح و احتیاط درجہ عالی داشت"۔

علامہ ابن کثیر کا بیان ہے: وکان فی اعلی درجۃ النسک والعفاف والصلاح[2] والورع

دنیوی جاہ و حشمت سے بیزاری امام صاحب کو دنیا اور اس کے لذائذ و مرغوبات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، امراء و سلاطین کے دربار سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور دنیاوی جاہ و حشمت اور اعزاز و اکرام کی کبھی طلب نہیں کی، خلفاء کی وجاہت کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں تھا، اور وہ ان کو عام لوگوں سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے، اور نہ ان کے ساتھ کوئی امتیاز برتتے تھے، ان کے خادم ابوبکر بن جابر کا بیان ہے کہ "میں امام صاحب کے ساتھ بغداد میں مقیم تھا ایک دن جب وہ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہوئے تو کچھ دیر کے بعد دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی میں نے دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ امیر ابواحمد موفق امام صاحب سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ میں نے اطلاع کی آپ نے ان کو اندر بلوا لیا اور پوچھا کہ کیسے زحمت فرمائی؟ انہوں نے کہا کہ میں تین درخواستیں لے کر حاضر ہوا ہوں، ایک تو یہ کہ آپ بصرہ میں مستقل قیام فرمائیں، تاکہ مختلف مقامات کے طالبانِ حدیث آپ سے استفادہ کر سکیں، دوسرے میرے بچوں کے لئے مخصوص نشست کا انتظام فرما دیں! امام صاحب نے فرمایا کہ پہلی دونوں باتیں مناسب ہیں لیکن تیسری بات ناممکن ہے، علم کے معاملے میں شریف و وضیع، اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہیں، اس لئے کوئی امتیاز نہیں برتا جا سکتا، چنانچہ امیر کے لڑکے بھی عام لوگوں کی طرح حلقۂ درس میں شریک ہو کر سماع حدیث کرتے[3]۔

وفات و اولاد بہتر سال کی عمر میں بروز جمعہ بروز سولہ شوال ۲۷۵ھ کو امام صاحب نے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ [2] بستان المحدثین والبدایہ والنہایہ ج ۔ [3] دیباچہ غایۃ المقصود

عالم آخرت کا سفر اختیار کیا، عباس بن عبد الواحد نے نماز جنازہ پڑھائی، اولاد میں ایک صاحبزادہ ابوبکر عبد اللہ کا جو آپ کے شاگرد اور نامور محدث تھے ذکر ملتا ہے۔

تصنیفات | امام صاحب کی جن تصنیفات کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

(۱) کتاب الرد علی اہل القدر۔ اس کے راوی ابو عبد اللہ بصری ہیں۔

(۲) کتاب الناسخ والمنسوخ۔ ابوبکر نجار اس کے راوی ہیں۔

(۳) کتاب المسائل۔ ابو عبید آجری نے اس کی روایت کی ہے اور اس میں ان کے وہ سوالات درج ہیں، جو انہوں نے اپنے استاذ امام احمد سے کئے تھے[۲]۔

(۴) مسند مالک۔ اسماعیل بن محمد صفار اس کے راوی ہیں۔

(۵) کتاب المراسیل۔ یہ رسالہ ۱۳۱۰ھ میں مطبع علمی سے شائع ہوا ہے اور چھپن صفحات پر مشتمل ہے[۳]۔

(۶) و (۷)، کتاب المصابیح و کتاب المصاحف۔ صاحب کشف الظنون نے ان دونوں کو امام صاحب کے صاحبزادہ ابوبکر عبد اللہ کی تصنیف بتایا ہے، لیکن ابن ندیم نے امام صاحب کی تصنیفات میں ان کو شمار کیا ہے[۴]۔

(۸)، کتاب البعث والنشور (۹) کتاب التفسیر (۱۰) کتاب نظم القرآن (۱۱) کتاب فضائل القرآن (۱۲)، کتاب شریعۃ التفسیر (۱۳) کتاب شریعۃ المقاری (۱۴) سنن ابی داؤد۔ یہ امام صاحب کی سب سے مشہور و مقبول اور فن حدیث کی بڑی اہم اور مستند کتاب ہے اس کا مفصل تعارف درج ذیل ہے۔

سنن ابی داؤد | یہ چار ہزار آٹھ سو منتخب حدیثوں پر مشتمل ہے، امام صاحب نے اس کی ترتیب و تالیف کا کام ۲۴۱ھ سے پہلے بغداد میں انجام دیا[۵]۔ سنن ابی داؤد سے پہلے

---

[۱] اتحاف النبلاء [۲] کشف الظنون ج ۲ [۳] معجم المطبوعات [۴] کشف الظنون ج ۲ و الفہرست [۵] معالم السنن ج ۱ طبقات الشافعیہ ج ۲ و تاریخ بغداد۔

حدیث کی کتابیں لکھی گئیں ان کا تعلق جوامع ومسانید سے ہے یعنی ان میں سنن، احکام، تفسیر، قصص، اخبار، مواعظ و آداب ہر قسم کی روایتیں ہیں لیکن امام ابوداؤد نے اپنی راہ سب سے الگ نکالی، تمام محدثین میں ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے صرف سنن و احکام کی روایات اپنے مجموعہ میں درج کی ہیں، اہل مکہ کے نام اپنے رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں "میں نے سنن میں صرف احکامی روایات جمع کی ہیں، زہد اور فضائل اعمال وغیرہ کی حدیثیں اس میں شامل نہیں ہیں، اس کی جملہ چار ہزار حدیثیں احکام و مسائل سے متعلق ہیں[1]"

سنن کی اہمیت سنن ابی داؤد کا شمار حدیث کی امہات کتب اور صحاح ستہ میں ہوتا ہے، اکثر علمائے اسلام نے صحیحین کے بعد کتب حدیث میں اس کو سب سے اہم بتایا ہے، اس کتاب کو مرتب کرنے کے بعد جب اس کو امام احمد کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کو بہت پسند کیا اور اس کی تعریف کی، زکریا ساجی کا بیان ہے کہ قرآن مجید اسلام کی اصل بنیاد اور سنن ابوداؤد اس کا ستون ہے، ابن الاعرابی فرماتے ہیں "مصحف یعنی کتاب اللہ اور سنن ابوداؤد کے بعد کسی اور چیز سے واقفیت کی ضرورت نہیں" محمد بن مخلد کہتے ہیں کہ "ابوداؤد نے سنن مرتب کرنے بعد جب لوگوں کے سامنے اس کو بیان کیا تو محدثین نے اس کو مصحف کی طرح قابل اتباع سمجھا" امام خطابی فرماتے ہیں "سنن ابی داؤد ایک عمدہ اور نفیس کتاب ہے، علوم دینیہ میں ایسی بے نظیر کتاب نہیں لکھی گئی، تمام لوگوں میں اسے حسن قبول حاصل ہوا۔ اور وہ اہل علم اور فقہا کے مختلف طبقات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے، اس میں ہر ایک کی آسودگی کا سامان موجود ہے اور عراق، مصر، بلاد مغرب اور اکثر ملکوں کے لوگوں کا اس پر اعتماد و دارومدار ہے" علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں "ابوداؤد کبار محدثین اور ماہرین فن علما میں تھے اور ان کی سنن جیسی کتاب کسی نے نہیں لکھی" حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں "سنن ابی داؤد علماء کے درمیان مشہور و متداول

---

[1] رسالہ ابی داؤد الی اہل مکہ۔

اور مقبول تصنیف خیال کی جاتی ہے"۔ ابو العلاء محسن کا بیان ہے کہ انہوں نے خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔

من اراد ان یستمسک بالسنن فلیقرأ سنن ابی داؤد۔	سنن کی اتباع کی آرزو رکھنے والوں کو سنن ابوداؤد کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

امام ابوداؤد خود فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد اس کتاب سے زیادہ کسی اور چیز کا علم ضروری نہیں، اگر کسی شخص کو ان دونوں کے علاوہ کسی اور چیز سے واقفیت نہ ہو تو اس کو کوئی نقصان نہ ہوگا۔[1]

خصوصیات (۱) سنن ابی داؤد کی سب سے اہم خصوصیت اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف احکام و مسائل سے متعلق روایات و اخبار پر مشتمل ہے، امام ابوداؤد سے پہلے اس قسم کی حدیث کی کتابیں لکھنے کا رواج نہ تھا، امام نووی کا بیان ہے کہ اپنی اس خصوصیات کی بنا پر وہ ائمہ حدیث اور علماء حدیث اور رجال آثار کی توجہات کا مرکز بن گئی، اور گو اس تخصیص کی بنا پر وہ احادیث کے بہت سے ابواب سے خالی ہے لیکن فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے وہ صحاح ستہ کی کسی اور کتاب میں نہیں۔ حافظ ابوجعفر بن زبیر غرناطی متوفی ۸۰۷ھ نے صحاح ستہ کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ولابی داؤد فی حصر احادیث الاحکام واستیعابھا مالیس لغیرہ۔	اور فقہی حدیثوں کے حصر و استیعاب کے سلسلہ میں ابوداؤد کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ دوسرے مصنفین کو نہیں

احکام و مسائل میں اس کی جامعیت کی بنا پر علمائے امت نے کتاب اللہ کے بعد دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کی تعلیم کو زیادہ ضروری قرار دیا ہے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ

[1] تاریخ بغداد ج ۹ و ابن خلکان ج ا و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ مقدمہ معالم السنن ج ا تہذیب التہذیب ج ۴ صفحہ ن د۔

Marfat.com

فقہا و مجتہدین کا معتمد علیہ ماخذ رہی ہے، زاہد الکوثری لکھتے ہیں "حلال و حرام کے متعلق احکامی احادیث کے لئے یہ نہایت مفید اور نفع بخش کتاب ہے" بعض علمائے اصول کا بیان ہے کہ مجتہدین کے لئے اس کی احادیث سے واقفیت کافی ہے" ابوبکر جصاص کی احکام و مسائل کے متعلق جملہ کتابوں (احکام القرآن، جامع کبیر، شرح مختصر طحاوی اور شرح مختصر کرخی وغیرہ) کا خاص ماخذ و مرجع یہی کتاب ہے۔[1]

(۲) فقہ و استنباط احکام و مسائل کے لحاظ سے بھی یہ بڑی بلند پایہ کتاب ہے کیونکہ امام ابوداؤد کا درجہ فقہ و اجتہاد میں بھی نہایت بلند تھا۔

(۳) امام ترمذی کی طرح ابوداؤد کی بھی اکثر و بیشتر روایتیں علما، ائمہ مجتہدین، فقہا امصار، صحابہ و تابعین اور تبع تابعین وغیرہ کی معمول بہا ہیں، خصوصاً امام مالک، سفیان ثوری اور امام اوزاعی وغیرہ محدثین اور فقہاء کے مسالک و مذاہب کے لئے تو وہ اصل بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے علامہ خطابی کا بیان ہے کہ "وہ فقہا و مجتہدین کے اختلافات کے درمیان حکم اور حجت ہے اور عراق، مصر، بلاد مغرب اور دیگر ممالک کے لوگوں کا اس کا دار و مدار ہے"[1]

(۴) سنن میں صحیح الاسناد، قوی متصل اور مرفوع حدیثوں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے اس کی صحت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امام صاحب نے پہلے پانچ لاکھ حدیثیں جمع کی تھیں، پھر ان میں کل چار ہزار آٹھ سو حدیثیں منتخب کیں اس سلسلہ میں خود لکھتے ہیں۔

"سنن میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں شامل ہیں، جو سب صحیح یا قریب قریب صحیح ہیں، میں نے اپنے علم و یقین بھر صحیح بلکہ اصح روایتیں نقل کرنے کی کوشش کی ہے، اور ہمیشہ ان حدیثوں کو ترجیح دی ہے، جو سند کے اعتبار سے جید اور اعلیٰ درجہ کی ہیں، مرسل حدیثیں اس وقت نقل کرتا ہوں جب مسند اور متصل روایتیں نہیں ملتیں کیونکہ مراسیل بھی ائمہ متقدمین، مالک، ثوری اور اوزاعی وغیرہ کے نزدیک لائق حجت اور قابل استناد ہیں۔ امام شافعی اور امام احمد کو ان کی حجیت میں کلام ہے۔ میرے نزدیک مسند و متصل روایات کے

---

[1] مقدمہ معالم السنن۔

Marfat.com

نہ ہونے کی صورت میں وہ معتبر و مستند ہیں لیکن ان کی طرح ان کو قوی نہیں سمجھتا، میں نے اس میں کوئی ایسی حدیث نہیں درج کی جس کے متروک اور ساقط ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہو...... اسی طرح متروک الاحادیث راویوں سے روایت کرنے میں بھی پرہیز کیا ہے، منکر اور ضعیف الاسناد روایتوں کو میں قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا، لیکن صحیح روایتوں کے نہ ہونے کی صورت میں ان کو ان کے ضعف اور وجوہِ نکارت کی تصریح کے بعد نقل کیا ہے، جن غیر صحیح الاسناد روایتوں کے بارہ میں سکوت اختیار کیا ہے، وہ قابل احتجاج اور صالح سمجھی جائیں گی، اسی طرح غریب اور شاذ روایات کے بجائے مشہور اور معمول بہ روایتیں جمع کرنے پر خاص دھیان دیا ہے[1]۔

(۵) امام ابوداؤد کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی سند اور ایک ہی متن میں متعدد اسانید اور مختلف متون کو جمع کر دیتے ہیں، اور ہر حدیث کے الفاظ کو علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ہیں۔

(۶) روایتوں کے تکرار سے حدیث کی کوئی کتاب خالی نہیں، لیکن امام ابوداؤد نے حتی الامکان تکرار سے احتراز، کثرتِ طرق کو نظر انداز اور طویل حدیثوں کو مختصر کر دیا ہے، تکرار سے اسی وقت کام لیا ہے، جب روایت میں کوئی خاص اور نئی بات نظر آئی ہے۔

(۷) نقلِ روایات میں استقصار و جامعیت کے علاوہ اس میں حسنِ ترتیب و تالیف کی بھی شان پائی جاتی ہے، علامہ خطابی فرماتے ہیں:۔

الا ان کتاب ابی داؤد احسن رصفا۔

یعنی ابوداؤد کی سنن ترتیب و حسنِ تالیف کے لحاظ سے سب میں عمدہ ہے، پڑھنے والوں کے مذاق و طبیعت کے لحاظ کی وجہ ہی سے انہوں نے تکرار، کثرتِ طرق اور طول بیان سے پرہیز کیا ہے۔

(۸) سنن ابی داؤد میں ایک ثلاثی روایت بھی ہے۔

(۹) رواۃ کے ناموں، کنیتوں اور القاب کے اجمال و ابہام کی تفصیل و توضیح، ان کی ثقاہت

---

[1] رسالہ ابی داؤد بحوالہ مکی۔

وعدم ثقاہت کی نشاندہی اور روایات کے حسن وقبح اور صحت وسقم وغیرہ کی وضاحت بھی کی ہے۔

سنن ابی داؤد کی چار حدیثیں امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ میرے اس منتخب مجموعۂ احادیث میں صرف چار حدیثیں انسان کو دین پر عمل کرنے کے لئے کافی ہیں اور وہ یہ ہیں، انما الاعمال بالنیات من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ، لایکون المومن مومنا حتی یرضیٰ لاخیہ ما یرضاہ لنفسہ اور الحلال بین والحرام بین وبینہما متشبہات۔

امام صاحب کی اس تصریح میں بڑی بصیرت وحکمت پوشیدہ ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "ایک مجتہد ومرشد کو شریعت کے کلی قاعدوں اور مہمات امور سے واقف ہونے کے بعد جزئی مسائل اور واقعات میں ان کے سوا کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ پہلی حدیث عبادات کی صحت ودرستگی، دوسری عمر عزیز کے اوقات کی حفاظت کے لئے تیسری پڑوسیوں، قرابت داروں، متعارف لوگوں اور دوسرے متعلقین وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کے لئے اور چوتھی ان تمام شکوک وشبہات کے ازالہ کے لئے کافی ہیں جو علماء کے اختلافات ودلائل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں[1]

سنن کے متداول نسخے اور ان کے رواۃ امام ابوداؤد سے ان کے سات تلامذہ نے سنن کی روایت کی ہے، لیکن ان میں چار تلامذہ زیادہ مشہور ہیں، اور ان کی نسبت سے ہر زمانہ میں سنن کے چار نسخے مشہور ومتداول رہے ہیں[2]

(۱) **نسخۂ لؤلؤی** یعنی ابوعلی محمد بن احمد بن عمرو لؤلؤی کا نسخہ جو ہندوستان اور بلاد مشرق میں رائج ومقبول ہے اور سب سے زیادہ مستند ومعتبر سمجھا جاتا ہے کیونکہ امام صاحب نے آخر عمر میں یعنی ۲۷۵ھ میں اس کا املا کرایا تھا، اس کے بعد ان کی وفات ہوگئی تھی، اس لئے گویا یہ آخری نسخہ ہے۔

(۲) **نسخۂ ابن داسہ** یعنی حافظ ابوبکر محمد بن بکر تمار بصری کا نسخہ، یہ بلاد مغرب میں مشہور و

---

[1] بستان المحدثین [2] مقدمہ معالم السنن

مقبول تھا، اس میں اور لولوی کے نسخے میں بڑی یکسانیت ہے، کہیں کہیں محض تقدیم و تاخیر کا جزوی اختلاف ہے، کمی بیشی کا کوئی فرق نہیں، بعض علماء کے نزدیک سب سے زیادہ کامل اور جامع یہی نسخہ ہے، مشہور شارح سنن علامہ خطابی کے پیش نظر یہی تھا، انہوں نے ابن داسہ سے براہ راست تحصیل علم اور روایت کی تھی۔

(۳) **نسخۂ آملی** یعنی حافظ ابو عیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید آملی کا نسخہ، یہ تقریباً ابن داسہ کے نسخے سے ملتا جلتا ہے، آملی ابوداؤد کے وراق تھے۔

(۴) **نسخۂ ابن اعرابی** اس میں اور دوسرے نسخوں میں بڑا فرق و اختلاف ہے اور ان کے مقابلہ میں اس میں کمی بھی ہے، کتاب الفتن والملاحم، کتاب الحروف، کتاب الخاتم وغیرہ مکمل اور کتاب اللباس کا نصف حصہ اور کتاب الوضوء، کتاب الصلوٰۃ اور کتاب النکاح کے بھی بیشتر حصے اس میں درج نہیں ہیں[1]۔

شروح و تعلیقات

سنن ابی داؤد کی اہمیت اور افادیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علماء نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، اس کے مختصرات مرتب کئے اس کی شرحیں اور حواشی لکھے جس میں اہم مباحث و مشکلات کا حل رواۃ اور غریب الفاظ وغیرہ کی تحقیقات کی گئی ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:۔

معالم السنن مشہور محدث امام ابو سلیمان احمد بن محمد خطابی م ۳۸۸ھ کی شرح جو سب سے قدیم اور مشہور اور سب میں ممتاز ہے، اس کو مطبعہ علمیہ حلب نے ۱۳۵۱ھ میں نہایت اہتمام سے شائع کیا۔

شرح قطب الدین قطب الدین ابوبکر بن احمد بن دعین یمنی شافعی م ۷۵۲ھ نے اس کی چار ضخیم جلدوں میں شرح لکھی تھی مگر نایاب ہے۔

تلخیص منذری ابو محمد زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی منذری م ۶۵۶ھ نے سنن ابو داؤد

---

[1] مقدمہ غایۃ المقصود، مقدمہ معالم السنن

کا اختصار کیا تھا اور اس کا نام مجتبیٰ رکھا۔ غایۃ المقصود کے ساتھ اس کو بھی شائع کیا گیا ہے۔

شرح نووی | مشہور محدث اور باکمال شارح حدیث ابوزکریا محی الدین یحییٰ ابن شرف نووی م ۶۷۶ھ نے بھی اس کی شرح لکھنا شروع کی تھی مگر مکمل نہیں کر سکے[1]۔

شرح ابن قیم | حجۃ الاسلام شمس الدین محمد بن ابوبکر قیم جوزی م ۷۵۱ھ نے منذری کی تہذیب کے مطابق ابوداؤد کی شرح وتہذیب کی تھی جو نہایت بلند پایہ اور مفید کتاب ہے اس کے مشکلات سے تعرض اور معلول احادیث پر فاضلانہ بحثیں کی گئی ہیں۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ غایۃ المقصود کی پہلی جلد کے ساتھ یہ بھی شامل ہے۔

شرح مغلطائی | یہ حافظ علاؤالدین مغلطائی بن قلیج م ۷۶۲ھ کی ناتمام شرح ہے۔

انتحار السنن باعجالۃ العالم | ابومحمود شہاب الدین احمد بن محمد مقدسی م ۷۶۵ھ نے خطابی کی معالم السنن کی تلخیص کی اور اس کا نام انتحار السنن واقتفاء السنن رکھا۔ بعض لوگوں نے اس کا نام عجالۃ العالم من کتاب المعالم بتایا ہے، مکتبہ آستانہ سے چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

شرح ابن ملقن | شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن شافعی م ۸۰۴ھ نے زوائد علی الصحیحین کے نام سے دو جلدوں میں ابوداؤد کی ان روایتوں کی شرح کی ہے۔ جو صحیحین میں نہیں ہیں۔

شرح عراقی | ابوزرعہ ولی الدین احمد بن عبدالرحیم زین الدین عراقی م ۸۲۶ھ نے بھی اس کی ایک ناتمام شرح لکھی جو ابتداء سے سجدۂ سہو تک سات جلدوں میں ہے، ایک اور جلد میں صیام، حج اور جہاد وغیرہ ابواب کی بھی شرح ہے، اگر یہ شرح مکمل ہوتی تو تقریباً چالیس جلدوں پر مشتمل ہوتی۔

شرح ابن رسلان | ابوالعباس احمد بن حسین رملی مقدسی معروف بہ ابن رسلان م ۸۴۴ھ نے سنن ابوداؤد کی بڑی مکمل اور جامع شرح لکھی تھی، جو سخاوی کے بیان کے مطابق گیارہ جلدوں میں ہے، لیکن علامہ حسین بن محسن انصاری کا بیان ہے کہ انہوں

---

[1] مقدمہ تحفۃ الاحوذی

نے یہ شرح عرب ممالک میں آٹھ ضخیم جلدوں میں دیکھی ہے جو نہایت مفید اور عمدہ مطالب پر مشتمل ہے، مولانا شمس الحق مرحوم لکھتے ہیں کہ میں نے اس کا ایک حصہ دیکھا تو ہے اس سے اندازہ ہوا کہ وہ نہایت عمدہ شرح ہے، زاہد الکوثری کا بیان ہے کہ وہ ابو داؤد کی نہایت عمدہ شرحوں میں ہے، اور کتب خانہ آستانہ میں اس کی چار جلدیں پائی جاتی ہیں، ابن رسلان، حافظ ابن حجر کے ارشد تلامذہ میں تھے، اس لئے انہوں نے اس شرح میں ان کے اقوال و آرا بھی نقل کئے ہیں۔

شرح عینی | علامہ بدر الدین عینی م ۸۵۵ھ کی شرح جو صرف ایک جزء پر مشتمل ہے۔

شرح سیوطی | علامہ جلال الدین سیوطی م ۹۱۱ھ نے مرقاۃ الصعود الی سنن ابی داؤد کے نام سے شرح لکھی۔

شرح سندی | علامہ ابو الحسن سندی م ۱۱۳۹ھ نے دیگر کتب صحاح کی طرح فتح الودود علی سنن ابی داؤد کے نام سے اس کا بھی حاشیہ لکھا تھا، جو نہایت مشہور اور مقبول ہے کشف الظنون نے اس کو شرح لطیف کہا ہے[۱]۔

غایۃ المقصود | مولانا شمس الحق عظیم آبادی مرحوم نے ۳۲ جلدوں میں سنن ابی داؤد کی ایک نہایت مبسوط و جامع اور مفصل شرح لکھی، اس کی صرف ایک ہی جلد دہلی کے مطبع انصاری سے شائع ہوئی ہے، یہ نہایت عمدہ شرح ہے، اس کے شروع میں ایک طویل مقدمہ بھی ہے جس میں ابوداؤد اور سنن کے متعلق بڑی مفید معلومات درج ہیں۔ اس کی اہمیت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے "میں نے شیخ ابو الطیب شمس الحق کی شرح غایۃ المقصود کا ایک حصہ دیکھا، وہ سنن ابو داؤد کے اسرار و غوامض کے کشف و اظہار کے لئے کافی ہے واللہ یہ خوب شرح ہے، مصنف نے اس میں پوری کاوش کی ہے اور تلاش و جستجو کا حق ادا کر دیا ہے[۱]، اس شرح کے ساتھ ابن قیم کی شرح اور منذری کی تلخیص بھی شامل ہے۔

---

[۱] مقدمہ بذل المجہود ج اول

Marfat.com

عون المعبود یہ بھی مولانا شمس الحق ہی کی شرح ہے اور سنن ابی داوٗد کے متن کے ساتھ چار جلدوں میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ یہ دراصل غایۃ المقصود کا خلاصہ ہے۔

عام طور سے اس کے موٗلف اور شارح مولانا شمس الحق ڈیانوی سمجھے جاتے ہیں لیکن شرح کی جلد اوّل کے خطبہ اور اسی جلد کے خاتمہ اور دوسری جلد کے خاتمہ میں مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا شرف الحق صاحب نے اس کو اپنی تصنیف بتایا ہے، مگر خود مولانا شمس الحق صاحب نے چوتھی جلد کے خاتمہ و آغاز اور تیسری جلد کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ ان کی تصنیف ہے مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور صاحب معجم المطبوعات نے اس کو مولانا اشرف ہی کی تصنیف قرار دیا ہے[1] مگر مولانا تلطف حسین صاحب نے جو مولانا شمس الحق صاحب کے ہمعصر و ہم سبق اور عون المعبود کے ناشر بھی ہیں لکھا ہے کہ "مولانا شمس الحق صاحب کو شرح ابی داوٗد لکھنے کا مبارک خیال مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کی ترغیب سے ہوا۔ انہوں نے سنن کے گیارہ نسخے جمع کئے اور ان کا مقابلہ کر کے ایک صحیح نسخہ تیار کیا، اور اسی کو اصل قرار دیا، مزی کی تحفۃ الاشراف، منذری کی تلخیص اور امام خطابی کی معالم السنن اور ابن اثیر کی جامع الاصول وغیرہ کو بھی پیش نظر رکھ کر غایۃ المقصود کی تالیف و ترتیب شروع کی مگر بعض وجوہ سے اس درمیان میں ایک مختصر شرح لکھنے کا خیال بھی ان کو ہوا تو عون المعبود کی تالیف شروع کی اور چند ممتاز علماء کو اس کام میں معاون بنایا، جنہوں نے متن کی تصحیح اور شرح کی تالیف میں ان کا ہاتھ بٹایا، اور مولانا نے ان سب سے ان کی استعداد کے مطابق کام لیا، ان علما کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) مولانا ابو عبدالرحمٰن شرف الحق محمد اشرف ڈیانوی جو شارح کے چھوٹے بھائی تھے
(۲) شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی۔
(۳) مولانا ابو عبداللہ محمد ادریس ڈیانوی جو شارح کے صاحبزادے ہیں۔

---

[1] مقدمہ بذل المجہود جلد اوّل و معجم المطبوعات کالم

Marfat.com

(۴) مولانا عبدالجبار بن نور احمد ڈیانوی جو مصنف کے ماموں زاد بھائی تھے[۱]۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام حضرات بھی عون المعبود کی تالیف میں کسی نہ کسی حیثیت سے مصنف مولانا شمس الحق کے شریک تھے، اور بقول مولانا تلطف حسین یہ تمام لوگ شارح عون المعبود مولانا شمس الحق صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے اور شب و روز اس خدمت کو انجام دیتے جو مولانا ان کے سپرد کرتے[۲]۔ لیکن اصل شارح مولانا شمس الحق ہی تھے، البتہ چند اور علماء نے ترتیب و تالیف میں ان کی اعانت کی تھی، مگر اس اعانت کی بنا پر ان کی جانب اس شرح کو منسوب کرنا صحیح نہیں ہے، یہ عام قاعدہ ہے کہ اساتذہ و شیوخ اپنے شاگردوں سے مواد و مآخذ و حوالے تلاش کراتے اور تصنیف و تالیف کے سلسلہ کے بعض امور ان کے سپرد کرتے ہیں بلکہ بعض ابواب و فصول بھی ان سے لکھوا کر ان میں حسب منشا معمولی یا غیر معمولی ترمیم کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اصل کتاب اساتذہ ہی کی جانب منسوب کی جاتی ہے اور اس کو معیوب نہیں خیال کیا جاتا، اس لئے مولانا اشرف صاحب کو اس کا مصنف و شارح قرار دینا غلط ہے، وہ صرف اس علمی بورڈ کے ایک رکن تھے۔ مولانا شمس الحق نے ان کی دل دہی کی وجہ سے کچھ اجزا ان کی جانب منسوب ہو جانے کو ناپسند نہیں کیا۔

التعلیق المحمود | اس کو شیخ فخر الحسن گنگوہی نے مرتب کیا ہے۔

الہدی المحمود لترجمہ سنن ابی داؤد | مشہور مترجم حدیث وقار نواز جنگ مولانا وحید الزمان ابن مسیح الزمان م ۱۹۲۰ء نے دو ضخیم جلدوں میں ایک شرح لکھی جو سنن کے اردو ترجمہ اور تشریحی فوائد پر مشتمل اور چھپ چکی ہے، صاحب شرح کے حالات میں مولانا عبدالحلیم چشتی نے ایک جامع کتاب لکھی ہے، جو مکتبہ نور محمد آرام باغ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

۱؎ خاتمہ عون المعبود جلد رابع۔ اس جماعت میں اور بھی بعض حضرات شامل تھے، مولوی ابو یحییٰ امام خان نوشہروی نے ان کی فہرست میں قاضی یوسف حسین خان پوری ہزاروی اور مولوی محمد شاہجہانپوری کے نام بھی تحریر کئے ہیں (تراجم علمائے حدیث)

۲؎ خاتمہ عون المعبود جلد رابع۔

بذل المجہود فی حل ابی داؤد مشہور حنفی عالم و محدث مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی شرح جو پانچ جلدوں پر مشتمل اور شائع ہو چکی ہے۔ یہ شرح مفید علمی و فنی مطالب پر مشتمل ہے۔

المنہل المورود۔ یہ مفید و مختصر شرح حال ہی میں حجاز سے شائع ہوئی ہے۔ لیکن ہماری نظر سے نہیں گذری۔

ایک اعتراض کا جواب بعض علمائے جرح و تعدیل نے سنن ابی داؤد میں موضوع روایتوں کی بھی نشاندہی کی ہے، علامہ ابن جوزی کے نزدیک اس قسم کی حدیثوں کی تعداد نو ہے۔ لیکن علمائے محققین نے اس اعتراض کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

"سنن ابی داؤد کی اعلیٰ و مستند ترین روایتیں وہ ہیں جن کی شیخین نے تخریج کی ہے اس قسم کی حدیثیں نصف کتاب پر مشتمل ہیں، اس کے بعد ان روایتوں کا نمبر ہے جن کی شیخین میں سے کسی ایک نے تخریج کی ہے۔ تیسرا درجہ ان روایتوں کا ہے جن کی گو صحیحین میں تخریج نہیں کی گئی ہے تاہم وہ علت و شذوذ سے پاک اور سنداً قوی و جید ہیں۔ اس کے بعد وہ روایتیں ہیں جو صحیح الاسناد اور صالح سمجھی جاتی ہیں اور دو تین طرق سے مروی ہونے کی بنا پر علمائے ان کو قبول کیا ہے بعض ایسی روایات بھی ہیں جو رواۃ کے سوء حفظ کی بنا پر ضعیف ہیں اور ان کے بارہ میں ابوداؤد نے سکوت اختیار کیا ہے۔ بعض احادیث باعتبار رواۃ ضعیف ہیں مگر ابوداؤد نے ان کے ضعف کی تصریح کر دی ہے لیکن بعض اوقات وہ ضعف کے متعلق اس لئے خاموش رہتے ہیں کہ نکارت کا پہلو بہت واضح اور نمایاں ہوتا ہے[1]۔"

امام خطابی فرماتے ہیں:

"محدثین کے نزدیک حدیث کی تین قسمیں ہیں (۱) صحیح (۲) حسن (۳) سقیم۔ امام ابوداؤد کی کتاب صحیح اور حسن دونوں قسموں کی جامع اور سقیم کی مختلف برای اور اہم قسموں مثلاً موضوع، مقلوب اور مجہول وغیرہ سے یکسر خالی ہے، اگر شاذ و نادر سقیم کی معمولی اور چھوٹی قسموں کی روایتیں درج

[1] سیرۃ النبلاء

ہوگئی ہیں تو امام صاحب اس کی حقیقت و نوعیت بیان کرکے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گئے ہیں۔[1]

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنن ابی داؤد موضوع روایتوں سے پاک ہے، البتہ ضعیف ومرسل روایتوں کے پائے جانے کا خود امام صاحب نے اپنے رسالہ میں ذکر و اعتراف کیا ہے لیکن اس سے اس کی اہمیت، شہرت، وثوق اور اعتبار و استناد میں کوئی فرق نہیں آتا۔

امام صاحب کا یہ بیان کہ "مالم یذکر فیہ شیئ فھو صالح" یعنی جن روایتوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے وہ صالح ہیں۔ علمائے فن کی بحث و نظر کا خاص موضوع ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام طور سے علماء نے اس طرح کی حدیثوں کو صحیح و حسن تسلیم کیا ہے لیکن مکمل استقصاء و تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی بعض حدیثیں ضعیف بھی ہیں۔ واللہ اعلم۔

---

[1] شرح معالم السنن ج ۱

امام بقی بن مخلد قرطبی

متوفی ۲۷۶ھ

نام ونسب | بقی نام، ابو عبدالرحمن کنیت اور شیخ الاسلام لقب تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے۔ بقی بن مخلد بن یزید۔

ولادت ووطن | اندلس کے مشہور شہر اور اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وثقافت کے مرکز قرطبہ میں سنہ ۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔[1]

اساتذہ وشیوخ | بقی بن مخلد نے تقریباً تین سو اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا، ان کا شمار امام احمد کے خاص اور مایۂ ناز شاگردوں میں ہوتا ہے، ان کے اکثر شیوخ کو امام مالک، سفیان بن عینیہ، امام شافعی اور حماد بن زید وغیرہ جلیل القدر محدثین اور فقہاء سے شرف تلمذ حاصل تھا، چند ممتاز مشائخ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن محمد شافعی، ابراہیم بن منذر حزامی، ابو ثور، ابو مصعب زہری، احمد بن ابراہیم دورقی، ابو طاہر احمد بن سرح، بکار بن عبداللہ، حارث بن مسکین، خلیفہ بن خیاط، دحیم، ابو خیثمہ، زہیر بن حرب، زہیر بن عباد، سحنون بن سعید، سلمہ بن شبیب، صفوان بن صالح، ابو بکر عبداللہ بن ابی شیبہ، عبداللہ بن ذکوان، ع... بن یوسف، محمد بن بشار بندار محمد بن عبداللہ بن نمیر، محمد بن عبید

---

[1] تاریخ ابن عساکر ۱۰/۳۔

بن حسان، محمد بن عیسیٰ اعشی، محمد بن عمر عدنی، محمد بن محمد مصطفیٰ حمصی، ہارون بن عبد اللہ جمال، یحییٰ بن عبد اللہ بن بکیر، یحییٰ بن عبد الحمید حمانی، یحییٰ بن یحییٰ لیثیؒ وغیرہ۔

تلامذہ ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، بعض کے نام حسب ذیل ہیں:

احمد بن بقی، احمد بن عبد اللہ اموی، اسلم بن عبد العزیز، حسن بن سعید (یا سعد) عبد اللہ بن یونس قبری مرادیؒ، محمد بن عمر لبابہ، محمد بن وزیر وغیرہ۔

طلب علم کے لئے سفر انہوں نے علم کی تحصیل و تکمیل کے لئے مغرب و مشرق کے اکثر شہروں کا سفر کیا تھا، مورخین نے ان کو ذو رحلۃ واسعۃ یعنی کثیر الاسفار بتایا ہے، ابن مندہ اور حمیدی کا بیان ہے کہ "رحلت اور طلب حدیث کے لئے ان کے سفر مشہور ہیں"۔

علم کی طلب و تحصیل میں تن آسانی کو ناپسند کرتے تھے، اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ طالب علم بنتے ہو؟ اس طرح بھی علم کی طلب کی جاتی ہے کہ جب تم فارغ ہوتے ہو اور تم کو کوئی ضرورت نہیں ہوتی تو حصول علم کے لئے نکلتے ہو، میں نے ایسے جانباز اور شوقین طالب علم دیکھے ہیں جن کے پاس کھانے کے لئے درخت کے پتوں کے سوا کچھ نہ تھا اور انہوں نے کاغذ خریدنے کے لئے اپنے پائجامے تک بیچ دیئے۔

حدیث میں درجہ و مرتبہ امام بقی نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق علم حدیث کی جانب زیادہ توجہ کی اور اس میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ان کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا ہے۔ مورخین اور علمائے سیر نے لکھا ہے کہ بالغ فی الجمع والروایۃ یعنی حدیث کی روایت و تحریر میں ان کو بڑا انہماک تھا، حفظ و ضبط اور صدق و ثقاہت میں بھی ممتاز تھے۔

علامہ ذہبی نے ان کو ثقہ حجت اور ثبت اور حافظ ابن عساکر نے الحافظ اور حمیدی نے من الحفاظ المحدثین لکھا ہے، حدیث کے ضبط و نقل میں ان کی احتیاط اس سے ظاہر

لہ تاریخ ابن عساکر، تذکرۃ الحفاظ و تاریخ العلماء والرواۃ للاندلس لابن الفرضی ج ۱، امام بقی کے بڑے ممتاز شاگرد اور ان کے راوی کہلاتے تھے، بقی کی کتابوں کی نشر و اشاعت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

Marfat.com

ہوتی ہے کہ ان کو کم سنی میں سفیان ثوریؒ کے بعض تلامذہ سے ملاقات و استفادہ کا موقع ملا تھا، مگر ان سے روایت کرنے سے احتراز کیا[1]

تفقہ واجتہاد فقہ و اجتہاد میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے، کسی خاص امام یا مذہب کے پابند نہ تھے بلکہ خود فقیہ و مجتہد اور صاحب اختیارات تھے، حافظ ذہبی اور علامہ ابن عساکر وغیرہ نے لکھا ہے، وکان مجتھدا متخیرا لا یقلد احدا[2] یعنی وہ مجتہد اور صاحب اختیارات اور کسی امام کے مقلد نہ تھے۔

علوم کی اشاعت ایک بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ممالک مشرق سے واپسی کے بعد اندلس کی سرزمین کو احادیث و روایات کی نشر و اشاعت سے معمور کر دیا۔ حافظ ابن عساکر وغیرہ کا بیان ہے۔

رجع الی الاندلس فملأھا علما جما۔ — یعنی اندلس واپس آکر اس کو علوم سے مملو کر دیا۔

متعدد اہم اور امہات کتب کو اندلس میں متعارف کرایا۔ مورخین کا بیان ہے:۔

کتب المصنفات الکبار وادخلھا الاندلس ونشر بھا علم الحدیث[3] — وہ بڑی اور بلند پایہ کتابوں کو نقل کرکے اندلس لائے اور یہاں علم کی اشاعت کی۔

ابن الفرضی نے تصریح کی ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الفقہ للامام شافعی کتاب التاریخ و کتاب الطبقات لخلیفہ بن خیاط اور سیر عمر بن عبدالعزیز کو وہی اندلس لائے اور اہل اندلس کو ان سے متعارف کرایا[4]

علم و فضل کا اعتراف محدثین اور ارباب کمال نے امام بقی کے دینی و علمی کمالات کا اعتراف کیا ہے، علامہ ذہبی نے ان کو امام، قدوہ، احد الائمۃ الاعلام، عدیم المثال اور

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و تاریخ ابن عساکر ج ۳ [2] ایضاً [3] تاریخ ابن عساکر ج ۳ [4] تاریخ العلماء والرواۃ للاندلس۔

یکتائے روزگار لکھا ہے۔ احمد بن ابی خیثمہ فرماتے ہیں کہ "جس شہر میں بقی جلوہ فرما ہوں، وہاں کے کسی آدمی کو ہم لوگوں کے پاس آنے کی کیا ضرورت"۔ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں کہ "وہ امام احمد کے مخصوص اور ارشد تلامذہ میں تھے اور امام بخاری، مسلم اور نسائی کے ہمسر و مثیل تھے۔ طاہر بن عبدالعزیز کا بیان ہے، کہ "میں نے مسند بقی کا ایک جز محمد بن اسماعیل صائغ کو دکھایا تو انہوں نے فرمایا کہ "یہ شخص بحر علم کا شناور ہے"۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ "عراق سے واپسی کے بعد میں اپنے محترم استاد یحییٰ بن بکیر کی خدمت میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو انہوں نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھایا اور مجھ سے سات حدیثیں سنیں[1]"۔

بعض فقہا کی مخالفت دوسرے ارباب کمال کی طرح ان کو بھی علماء و فقہاء کی ایک جماعت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بڑے متبع سنت تھے، اس لئے ائمہ مجتہدین اور فقہا کی تقلید کی بجائے براہ راست احادیث و آثار کی پیروی کرتے تھے۔ اس زمانے میں اندلس میں فقہ مالکی کا غلبہ تھا۔ اس لئے عموماً لوگوں کو مؤطا اور اہل مدینہ کی حدیثوں سے زیادہ واقفیت تھی اور اس کے مقابلے میں اہل عراق کے متعلق یہ گمان تھی کہ وہ قلیل الاحادیث ہیں، چنانچہ بقی نے جب مصنف ابن ابی شیبہ کا جس کو وہ لائے تھے درس دینا اور احادیث کی نشر و اشاعت شروع کی تو فقہا کی ایک جماعت مسائل میں اختلاف کو برداشت نہ کر سکی اور بقی کی مخالفت شروع کر دی۔ عوام کو بھی ان کے خلاف بھڑکا دیا، ان کو مخالفت کے اس طوفان سے مجبور ہو کر درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر دینا پڑا۔ جب فرمانروائے اندلس محمد بن عبدالرحمٰن بن حکم اموی کو جو خود بھی صاحب علم اور علم و فن اور علما کا بڑا قدر شناس تھا، اس ہنگامہ کی خبر ہوئی تو اس نے شیخ الاسلام اور ان کے مخالفین کو طلب کیا اور مصنف ابن ابی شیبہ کو منگا کر خود اس کا مطالعہ کیا اور اس قدر پسند کیا کہ اپنے کتب خانہ کے لئے اس کی نقل فراہم کرنے کا حکم دیا، اور کہا کہ ہمارا کتب خانہ ایسی اہم کتاب سے خالی نہ ہونا چاہیے اور شیخ الاسلام سے کہا کہ آپ علم کی نشر و اشاعت جاری رکھیں اور احادیث رسول کا جو ذخیرہ آپ کے پاس ہے اس سے لوگوں کو فیضیاب فرمائیں اور مخالفین کو بھی تنبیہ کی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و تاریخ ابن عساکر ج ۳ و تاریخ العلماء والرواۃ

Marfat.com

کہ ان سے آئندہ کسی قسم کا تعرض نہ کریں[۱]

زہد وتقویٰ | زہد وورع میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، مورخین اور علمائے سیر نے ان کو متدین، زاہد اور صاحب تقویٰ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ائمہ محدثین اور زہاد صالحین میں تھے۔

نماز | شب بیدار اور نوافل وتہجد کے پابند تھے، یافعی نے متبتل اور ذہبی نے عابد و متہجد لکھا ہے۔

تلاوت قرآن | تلاوت قرآن سے اتنا شغف تھا کہ ہر رات کو تہجد کی نماز میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔

روزہ | رمضان کے علاوہ بھی اکثر مسلسل روزے رکھتے تھے، لیکن جمعہ کو افطار کرتے تھے۔

حج بیت اللہ | تیس یا بتیس مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے دوبارہ بلاد مشرق تشریف لے گئے۔ پہلی مرتبہ بیس اور دوسری دفعہ چودہ سال تک وہاں مقیم رہے، دونوں مرتبہ ان کا معمول تھا کہ وہ سال بھر مختلف شہروں کے علمائے فن اور محدثین کی خدمت میں حاضر ہو کر علم وفن کی تحصیل کرتے تھے، اور حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ چلے جاتے اور حج وزیارت سے شرف اندوز ہوتے تھے۔

جہاد | ان میں جہاد کا بھی جذبہ تھا چنانچہ کئی جنگوں میں شریک ہوئے۔

دعا کی برکت | مستجاب الدعوات تھے اکثر لوگ ان کی دعا کی برکت وتاثیر کی وجہ سے ان سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔

اخلاق وعادات | بڑے ستودہ صفات، متواضع اور خلیق تھے، لوگوں کے درد وغم میں شریک رہتے، ان کی حاجت روائی کرتے، مریضوں کی عیادت اور جنازوں میں شرکت معمول تھا، ہر نیک کام سے رغبت تھی، کبھی کسی سائل کو واپس نہ کرتے، اگر کچھ نہ ہوتا تو کپڑے تک

---

[۱] تاریخ ابن عساکر ج ۳۔

دے دیتے۔

حق پسندی بڑے حق پسند اور حق گو تھے، سچی بات کہنے میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے[1]۔

وفات مشہور اور صحیح روایت کے مطابق انہوں نے سہ شنبہ ۲۹ جمادی الآخریٰ ۲۷۶ھ کو اندلس میں وفات پائی، امام دارقطنی نے ۲۷۳ھ کی بھی روایت کی ہے لیکن یہ ضعیف ہے، محمد بن یزید نے نماز جنازہ پڑھائی اور بنو عباس کی جانب منسوب ایک قبرستان میں دفن کئے گئے[2]۔

حلیہ دراز قد تھے۔ داڑھی گھنی تھی، بالوں میں خطاب لگاتے تھے[3]۔

تصنیفات علامہ لقی کثیر التصانیف اور صاحب کمال مصنف تھے، ابن عساکر نے لکھا ہے [4]انہوں نے نہایت عمدہ کتابیں لکھیں، جو ان کی جامعیت، دقتِ نظر، کثرت مطالعہ اور وسعتِ معلومات پر شاہد ہیں، ان کی تصنیفات بے نظیر اور اسلام کی اہم اور بنیادی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں[5]۔ مگر افسوس ہے کہ بہت سے قدما کی طرح ان کی کتابیں بھی ناپید ہوگئیں، جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فتاوائے صحابہؓ و تابعین و من دونہم۔

۲۔ کتاب التفسیر۔ اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ علامہ ذہبی و یافعی نے اس کو جلیل القدر بتایا ہے، علامہ ابن حزم کے خیال میں یہ لاجواب اور عدیم المثال تفسیر تھی، وہ اس کو تفسیر ابن جریر پر بھی ترجیح دیتے تھے۔

۳۔ ان کی تصنیفات میں مسند کبیر سب سے اہم اور عظیم الشان تصنیف ہے۔ جو ایک ہزار تین سے زیادہ صحابہؓ کی حدیثوں پر مشتمل ہے۔ حافظ ابن جوزی اور علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سولہ سو سے زیادہ صحابہؓ کی حدیثیں اس میں درج تھیں۔ اس کی ترتیب فقہی ابواب

لہ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و تاریخ ابن عساکر [illegible] تاریخ ابن عساکر ج ۳ و تاریخ العلماء الاندلس [illegible] تذکرۃ [illegible] ج ۲ [illegible] ابن عساکر ج ۳

پر ہے اس لئے اس کو مصنف و مسند دونوں کہا جاتا ہے۔ ابن حزم کے حسب ذیل بیان سے اس کی اہمیت اور صحت و اعتبار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ :

"اس کتاب کو انہوں نے صحابہ کے ناموں پر مرتب کیا ہے، اس میں ایک ہزار تین سو سے زیادہ صحابہ کی روایات ہیں، ہر صحابی کی حدیث کو فقہ و احکام کے ابواب و عنوانات کے تحت نقل کیا گیا ہے، اس اعتبار سے یہ مسند بھی ہے اور مصنف بھی، میرے علم میں اس مرتبہ و اہمیت کی اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ انہوں نے اپنی ثقاہت، ضبط، اتقان، حدیث میں جامعیت اور جودت شیوخ کے باوجود ایک سو چراسی راویوں سے اس کی روایت کی ہے جو قریب قریب سب مشہور اور بلند پایہ محدث ہیں[1]۔"

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ "ابن حزم نے اس کو مسند احمد بن حنبل پر ترجیح دی ہے، جو میرے خیال میں محل نظر ہے، مسند ابن حنبل اس سے بھی زیادہ جامع و جید کتاب ہے[2]۔"

---

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۲ و کشف الظنون ج ۲ [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۱

Marfat.com

امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ

متوفی ۲۷۹ھ

نام ونسب امام موصوف نسباً قبیلۂ بنی سلیم سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد نام، ابو عیسیٰ کنیت ہے اور نسب نامہ یہ ہے:

محمد بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک، سلمی ترمذی بوغی۔ علامہ سمعانی نے ضحاک کی بجائے شداد لکھا ہے۔

وطن خراسان اور ماوراء النہر کا خطہ ہمیشہ سے علم وفن اور ارباب کمال کا مرکز رہا ہے۔ تاریخ اسلام کے بہت سے نامور علماء اسی خاک سے اٹھے۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی بھی اسی مردم خیز سرزمین کے فرزند تھے۔ صغانیان کے مشہور شہر ترمذ کو آپ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ترمذ کا لفظ تِرمِذ، تَرمَذ، تُرمُذ تینوں طریقوں سے ہے لیکن عام طور پر ترمذ ہی مشہور ہے۔ یاقوت نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ یہ شہر دریائے جیحون کے مشرقی کنارے پر بلخ کے محاذ میں کسی زمانہ میں بڑا آباد اور بارونق شہر تھا۔ یہاں بڑے بڑے ارباب کمال پیدا ہوئے۔ سمعانی اور یاقوت نے بعض کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ بوغی ایک قریہ بوغ کی جانب نسبت ہے جو ترمذ سے چھ فرسخ کی مسافت پر ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق امام ترمذی اسی میں آسودۂ خواب ہیں۔[1]

پیدائش امام موصوف ۲۰۹ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے۔ اس کی تفصیل نہیں ملتی کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی لیکن اس زمانہ میں خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ علم وفن کا مرکز بن چکا تھا اور امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث کی مسند علم بچھ چکی تھی اور دور دور کے تشنگان علم یہاں پہنچ پہنچ کر آتے تھے اس لئے قیاس یہی ہے کہ امام ترمذی نے ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی ہوگی۔

سماع حدیث کے لئے سفر اسلام کی تعلیمات اور علم دین کی بنیاد کتاب اللہ کے بعد حدیث نبوی پر

---

[1] دیکھو کتاب الانساب سمعانی ترمذی، معجم البلدان ج ۲ ذکر ترمذ، ابن خلکان ج ۲

ہے۔ اس کے بغیر دین کا صحیح اور پورا علم نہیں ہو سکتا، اس لئے ہر دور میں مسلمانوں نے اس کی جانب بڑا اعتنا کیا، خصوصاً ابتدائی چند صدیوں میں اس کی اشاعت و حفاظت کا اتنا اہتمام کیا جس کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی، نفس حدیث کے متعلق بہت سے علوم ایجاد ہو گئے۔ حجاز، عراق، خراسان، ماوراء النہر شام و مصر و مغرب وغیرہ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں مرکز حدیث قائم ہو گئے تھے، حجاز کے بعد عراق و خراسان کو اس باب میں ایک خاص امتیاز حاصل رہا ہے اکثر بڑے بڑے محدثین یہیں پیدا ہوئے اس لئے ان مقامات میں حدیث کا ذوق و شوق عام تھا۔ امام بخاری کے علم و شہرت نے اس شوق کو اور بڑھایا، اسی ماحول میں امام ترمذی کا نشوونما ہوا خود ان کے وطن میں امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث پیدا ہو چکے تھے اس لئے امام ترمذی کو بھی حدیث نبوی کا شوق دامن گیر ہوا چنانچہ انہوں نے خراسان اور ماوراء النہر کے علاوہ سماع حدیث کے لئے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں کا سفر کیا حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

طاف البلاد وسمع خلقا من الخراسانيين والعراقيين والحجازيين[1] یعنی انہوں نے متعدد شہروں کا سفر کیا اور خراسان و عراق اور حجاز کے ارباب کمال سے سماع کیا۔

اساتذہ ان کے شیوخ کی تعداد بیشمار ہے ان کے ناموں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس دور کے ہر خرمن حدیث سے خوشہ چینی کی، ان میں امام بخاری و مسلم کے شیوخ بھی ہیں، ان سب کا استقصاء دشوار ہے، سمعانی اور ذہبی نے بعض ممتاز شیوخ کے نام لکھے ہیں، امام بخاری، مسلم، علی بن حجر مروزی، ہناد بن سری، ابوکریب، محمد بن العلاء، محمد بن موسیٰ الزمن، محمد بن بشار، عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی، قتیبہ بن سعید، ابو مصعب، ابراہیم بن عبداللہ ہروی، اسماعیل بن موسیٰ، سوید بن نصر، محمد بن عبدالملک، عبداللہ بن معاویہ جمحی وغیرہ[2] یہ تمام شیوخ اپنے عہد کے جلیل القدر محدث تھے اکثر اصحاب صحاح نے ان سے استفادہ کیا ہے ان کے مختصر حالات یہ ہیں:

۱۔ ابوالحسن علی بن حجر بن ایاس، سعدی مروزی بڑے متبحر عالم اور اکابر حفاظ حدیث میں تھے شعر و ادب کا بھی ذوق رکھتے تھے، حدیث کے علاوہ قرآن کے بڑے عالم تھے، ذہبی نے ان کی کتاب احکام القرآن کا ذکر

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ [2] کتاب الانساب نسبت ترمذی و تذکرۃ الحفاظ ج ۲

کیا ہے ۲۴۲ھ میں وفات پائی۔[1]

۲۔ ابوالسری ہناد بن سری تمیمی، بڑے عابد و مرتاض محدث تھے ذہبی انہی کی وجہ سے قدوہ، زاہد اور شیخ الکوفہ لکھتے ہیں، ساری عمر علائق دنیوی سے آزاد ہو کر عبادت و ریاضت میں بسر کی، زہد و عبادت کی وجہ سے کوفہ کے راہب کہلاتے تھے امام احمد لوگوں کو ان کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے زہد پر ایک کتاب بھی لکھی تھی ۲۴۳ھ میں وفات پائی۔[2]

۳۔ ابوکریب محمد بن العلاء، بڑے جلیل القدر حافظ تھے کوفہ میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا حفظ حدیث میں وہ اپنے شیوخ سے بھی زیادہ معتبر مانے جاتے تھے۔ انھوں نے کوفہ میں ... لاکھ حدیثوں کی اشاعت کی ان کے ایک شاگرد موسیٰ بن اسحٰق نے ان سے ایک لاکھ حدیثیں سنی تھیں ۲۴۸ھ میں وفات پائی۔[3]

۴۔ ابوبکر محمد بن بشار بن عثمان عبدی، بصرہ کے بڑے حافظ حدیث تھے ان کے تلامذہ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے ان کی روایات میں بعض محدثین نے کلام کیا ہے لیکن ان کا درجہ اس سے ظاہر ہے کہ بخاری و مسلم ان سے حدیثیں لیتے تھے ۲۵۲ھ میں وفات پائی۔[4]

۵۔ ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن تمیمی، دارمی، سمرقند کے جلیل القدر عالم اور حافظ حدیث تھے ان کی علمی جلالت اور حفظ حدیث پر محدثین کا اتفاق ہے۔ امام احمد بن حنبل انہیں امام حدیث کہتے تھے فقہ و تفسیر میں بھی کمال حاصل تھا زہد و ورع میں بھی ممتاز تھے محمد بن ابراہیم کا بیان ہے کہ وہ عقل و دیانت کے انتہائی درجہ پر تھے ان کا علم حفظ و درایت اور زہد و عبادت ضرب المثل تھا۔ سمرقند میں ان ہی کی ذات سے حدیث و آثار کی اشاعت ہوئی، وہ مفسر کامل اور فقیہ عالم تھے فن حدیث و تفسیر میں ان کی تصانیف ہیں ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ حافظ و متقن اور زاہد و متورع تھے انہوں نے حفظ کے ساتھ حدیثوں کو جمع کیا ان کو سمجھا، اس پر کتاب لکھی سنت کو پھیلایا اس کی حفاظت کی، اس کی دعوت دی اس کے مخالفوں کو مٹایا خطیب لکھتے ہیں کہ انہوں نے حدیث کی تلاش میں بڑے طویل سفر کئے، وہ حفظ و اتقان، صدق و ورع، زہد و عبادت تمام کمالات کے جامع تھے بخاری مسلم ابوداؤد، ترمذی سب نے ان سے فیض حاصل کیا ہے دنیاوی وجاہت سے بھاگتے

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ج ۹ ...

تھے ایک مرتبہ اصرار سے مجبور ہو کر عہدۂ قضا قبول کر لیا تھا لیکن پھر ایک فیصلہ کے بعد مستعفی ہو گئے۔ ۲۵۵ھ میں وفات پائی[۵]۔

۶۔ ابورجا قتیبہ بن سعید بلخی بغلانی، خراسان کے نامور حافظ حدیث تھے حافظ انہیں شیخ الحفاظ اور محدث خراسان لکھتے ہیں۔ ان کے حفظ پر محدثین کا اتفاق ہے، دولت علم کے ساتھ دولت دنیا سے بھی بہرہ ور تھے ۲۴۰ھ میں وفات پائی[۶]۔

۷۔ ابومصعب احمد بن ابی بکر زہری، امام مالک کے شاگرد رشید اور مدینہ منورہ کے مشہور محدث فقیہ اور قاضی تھے فقہ میں ان کا پایہ بلند تھا، ذہبی انہیں امام الفقہ لکھتے ہیں، اہل مدینہ کے مذاہب پر بڑی وسیع نظر تھی ابن حجر نے سنہ وفات ۲۳۲ھ اور ذہبی نے ۲۹۰ھ لکھا ہے[۷]۔

۸۔ ابو اسحٰق ابراہیم بن عبد الرحمٰن ہروی، اصل وطن ہرات تھا لیکن بغداد میں متوطن ہو گئے تھے ہرات کے ممتاز حفاظ میں تھے[۸]۔

۹۔ ابو محمد اسماعیل بن موسیٰ فزاری کوفہ کے محدث تھے ان کے تشیع کی وجہ سے بعض محدثین نے ان کی روایات میں کلام کیا ہے لیکن ابن حبان نے ثقات میں لکھا ہے اور بخاری، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے روایت کی ہے ۲۴۵ھ میں وفات پائی[۹]۔

۱۰۔ ابوبکر محمد بن عبد الملک، امام احمد بن حنبل کے خاص اصحاب میں ہیں بغداد کے محدث تھے طلب حدیث میں بڑے طویل سفر کئے تمام اصحاب سنن نے ان سے روایتیں لی ہیں ۲۵۸ھ میں وفات پائی[۱۰]۔

۱۱۔ ابوجعفر عبد اللہ بن معاویہ جمحی، بصرہ کے محدث تھے، ابن حبان نے ثقات میں لکھا ہے اصحاب صحاح میں ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کے شیخ تھے ۲۴۳ھ میں وفات پائی[۱۱]۔

حافظہ امام ترمذی کے لئے قدرت کی جانب سے حفظ حدیث کے تمام سامان فراہم ہو گئے تھے ایک طرف شیوخ میں ایسے اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا دوسری طرف حافظہ نہایت قوی تھا۔۔۔

---

[۱] تہذیب ج ۵ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [۳] تہذیب ج ۱ و تذکرہ ج ۲ [۴] تہذیب تذکرہ ج ۱ [۵] تہذیب ج ۱ [۶] تذکرہ ج ۲ [۷] تہذیب ج ۶

Marfat.com

کا ایک حیرت انگیز واقعہ رجال کی تقریباً سب کتابوں میں موجود ہے کہ انہوں نے ایک شیخ سے ایک جزو کے بقدر حدیثیں قلم بند کیں، اتفاق سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کو پھر ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا انہوں نے شیخ مذکور سے دوبارہ سماع حدیث کی درخواست کی شیخ نے دوبارہ سنانا شروع کی، امام ترمذی کے ہاتھ میں ایک سادہ بیاض تھی شیخ کو شبہ ہوا کہ اس میں وہ حدیثیں لکھی ہوئی ہیں، ابو عیسیٰ امتحاناً ایسا کر رہے ہیں اس لئے ان کو ناگوار ہوا، ابو عیسیٰ نے یہ غلط فہمی دور کر کے کہا کہ مجھے آپ کی حدیثیں حفظ ہیں اور اسی وقت کل سنا دیں۔ شیخ نے کہا معلوم ہوتا ہے تم نے میرے پاس آنے سے پہلے ان کو حفظ کر لیا تھا ابو عیسیٰ نے کہا نہیں اگر آپ کو شبہ ہو تو دوسری حدیثیں سنا کر امتحان لے لیجئے، شیخ نے امتحاناً چالیس غریب حدیثیں سنائیں ابو عیسیٰ نے صرف ایک مرتبہ سن کر اسی وقت چالیسوں حدیثیں دہرا دیں یہ غیر معمولی حافظہ دیکھ کر شیخ کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔[1]

اعتراف کمال یوں تو امام ترمذی نے بہت سے شیوخ سے استفادہ کیا تھا لیکن جس سے ان کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا وہ امام بخاری ہیں، وہ امام بخاری کے خاص تلامذہ میں تھے، ان کے فیض اور امام ترمذی کے حافظہ، ذوق و شوق اور تلاش و جستجو نے ان کو اس عہد کا امام بنا دیا ان کے علم و کمال پر تمام محدثین اور علماء کا اتفاق ہے، ابن حبان لکھتے ہیں کہ امام ترمذی ان لوگوں میں تھے جنہوں نے حدیثوں کا ذخیرہ جمع کیا اس پر تصنیف کی اور انہیں حفظ کیا۔ حافظ ذہبی اور ابن حجر دونوں ان کو امام حدیث لکھتے ہیں، امام بخاری کے بعد خراسان میں ان سے بڑا کوئی محدث نہیں تھا "مات البخاری ولم یخلف بخراسان مثل ابی عیسیٰ فی العلم والورع" وہ امام بخاری کے خلیفہ شمار کئے جاتے تھے، خود امام بخاری کو لائق شاگرد پر ناز تھا۔ انہوں نے ان الفاظ میں ان کے کمال علم کی سند عطا کی تھی کہ تم نے مجھ سے جتنا فائدہ حاصل کیا اس سے زیادہ میں نے تم سے کیا۔ اس سند کے بعد امام ترمذی کے لئے اور کسی سند کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ امام بخاری نے ان سے ایک حدیث روایت کی ہے۔

تلامذہ ان کے علمی کمالات نے ان کی ذات کو طالبان حدیث کا مرجع بنا دیا تھا ان کے تلامذہ میں خراسان اور ترکستان کے علاوہ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمیوں کے نام ملتے ہیں، چند ممتاز تلامذہ کے

---

[1] بستان [2] تہذیب ج ۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و بستان المحدثین

... یہ ہیں:

ابو حامد احمد بن عبداللہ داؤد مروزی، ہیثم بن کلیب الشامی، محمد بن محبوب، ابوالعباس محبوبی مروزی، احمد بن یوسف نسفی، ابوالحارث اسد بن حمدویہ، داؤد بن نصر بن سہل بزدوزی، عبد بن محمد بن محمود نسفی، محمود بن نمیر، محمد بن محمود، محمد بن مکی بن نوح، ابوجعفر محمد بن سفیان بن النضر، محمد بن المنذر وغیرہ۔[1]

تفسیر حدیث امام ترمذی کا خاص فن تھا، اس کے علاوہ تفسیر میں پورا درک اور فقہ میں کمال رکھتے تھے۔ ترمذی میں انہوں نے ابواب تفسیر کے تحت میں آیات قرآنی کے متعلق جو احادیث نبویؐ اور آثار صحابہ جمع کئے ہیں ان سے تفسیر کے متعلق ان کے علم و نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

فقہ حفظ حدیث کے ساتھ وہ مجتہد فقیہ تھے ان کے تفقہ پر جامع ترمذی شاہد ہے ترمذی کا خاص امتیاز یہی ہے کہ وہ محض احادیث کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ فقہی اجتہاد کی کتاب بھی ہے، اس میں امام ترمذی نے مختلف ائمہ کے فقہی مذاہب، ان کے استنباطات اور دلائل کو جمع کر دیا ہے اور جا بجا اس پر تنقید بھی کرتے گئے ہیں، مزید بحث آئندہ آئے گی۔

عملی زندگی امام ترمذی میں جس درجہ کا علم تھا اسی درجہ کا عمل اور زہد و تقویٰ بھی تھا اور زہد و ورع میں بھی امام بخاری کے جانشین تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں

مات البخاری ولم یخلف بخراسان مثل ابی عیسیٰ فی العلم والحفظ والورع والزهد۔[2]

خشیت الٰہی ان کا دل خشیت الٰہی سے اتنا لبریز تھا کہ ہر وقت رویا کرتے تھے اور روتے روتے آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔[3] لیکن دل کی آنکھیں روشن ہو گئی تھیں، بعض روایتوں میں ہے کہ وہ پیدائشی نابینا تھے لیکن یہ صحیح روایتوں کے خلاف ہے اور یوں بھی خلاف قیاس ہے، اس لئے کہ نابینا

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲

کا ایسے زمانے میں جب کہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں ساری دنیائے اسلام کی خاک چھاننا عقل سے بعید ہے اور طلب حدیث کے لئے امام ترمذی کی سیاحت مسلم ہے۔

امام ترمذی کا مذہب امام ترمذی کا زمانہ ائمہ اربعہ کے بعد ہے لیکن وہ ان میں سے کسی کے مقلد نہ تھے بلکہ خود مجتہد تھے۔ بعض مسائل میں امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کی تائید سے بعضوں کو یہ گمان ہوا کہ وہ شافعی یا حنبلی تھے لیکن اس سے ان کی تقلید کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے بعض مسائل میں ان کی مخالفت بھی کی ہے مثلاً گرمی کی شدت میں نماز ظہر کی تاخیر کے مسئلہ میں ان کی رائے امام شافعی کے خلاف ہے وہ اپنی تحقیق سے جو رائے دیتے تھے وہ کبھی کسی کے موافق پڑ جاتی تھی اور کبھی مخالف، اس لئے کسی امام کی تائید سے ان کو اس کا مقلد سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

ایک التباس کا ازالہ امام ابو عیسیٰ ترمذی کے علاوہ دو اور محدثین ترمذی کی نسبت سے مشہور ہیں ایک ابو عبداللہ محمد بن علی المعروف بحکیم الترمذی، دوسرے ابوالحسن احمد بن حسن ترمذی۔ یہ دونوں صاحب تصنیف ہیں، حدیث میں حکیم ترمذی کی نوادر الاصول مشہور کتاب ہے لیکن یہ بہت غیر معتبر ہے اس لئے نام سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:۔

"حکیم ترمذی ابوعیسیٰ ترمذی کے علاوہ دوسرے شخص ہیں، حکیم ترمذی کی نوادر الاصول کی اکثر حدیثیں غیر معتبر ہیں، ناواقف حکیم ترمذی کو ابوعیسیٰ ترمذی سمجھ کر ان کی غیر معتبر حدیثیں امام ترمذی کی جانب منسوب کر دیتے ہیں ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے[۱]" ابوالحسن ترمذی البتہ بڑے پایہ کے محدث ہیں، امام احمد بن حنبل کے اصحاب میں تھے، بخاری، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ نے ان سے روایتیں کی ہیں سنہ ۲۷۰ھ میں وفات پائی[۲]

وفات مشہور روایت کے مطابق امام ترمذی نے سنہ ۲۷۹ھ میں وفات پائی[۳]

تصانیف مؤرخین کے اجمالی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذی کی بہت سی تصانیف تھیں،

---

۱ بستان المحدثین ۲ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ۳ اتحاف النبلا

لیکن ان کی تین تصانیف کا علم ہے جامع یا سنن ترمذی، شمائل ترمذی اور کتاب العلل، ابن ندیم نے تین کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں دو تو ترمذی اور کتاب العلل ہیں لیکن تیسری کا نام اس نے کتاب التاریخ لکھا ہے[1]

جامع ترمذی سے پہلے کی کتب حدیث امام ترمذی سے بہت پہلے مسلمانوں میں نہ صرف حفظ و طلب حدیث بلکہ اس کی تدوین کا بھی شوق پیدا ہو گیا ہے اور محدثین کی یادداشتوں کے علاوہ باقاعدہ مرتب و مبوب کتابیں مرتب ہو چکی تھیں خود ترمذی کے زمانہ میں بھی حدیث کی مختلف قسموں کے مجموعے مرتب ہوئے ان میں اولیت کا سہرا امام دار الہجرۃ امام مالک کے سر ہے۔

مؤطا کے علاوہ اس وقت تک حدیث کی جو کتابیں تالیف ہو چکی تھیں ان میں سے بعض قابل ذکر کتابوں کے نام یہ ہیں:

مسند ابو داؤد طیاسی المتوفی ۲۰۴ھ، مصنف عبد الرزاق بن ہمام المتوفی ۲۱۱ھ مسند عبد اللہ بن زبیر حمیدی المتوفی ۲۱۹ھ، سنن سعید بن منصور المتوفی ۲۲۷ھ مصنف عبد اللہ بن محمد المعروف بہ مصنف ابن ابی شیبہ المتوفی ۲۳۵ھ مسند عبد اللہ بن حمید اللثی المتوفی ۲۴۰ھ، مسند احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ مسند عبد اللہ بن عبد الرحمٰن تمیمی دارمی المتوفی ۲۵۵ھ صحیح محمد بن اسماعیل بخاری المتوفی ۲۵۶ھ صحیح مسلم بن حجاج المتوفی ۲۶۱ھ سنن ابن ماجہ المتوفی ۲۷۳ھ سنن ابی داؤد المتوفی ۲۷۵ھ مسند یحییٰ بن عبد الحمید حمانی المتوفی ۲۲۸ھ، مسند نعیم بن حماد خزاعی المتوفی ۲۲۸ھ، مسند مسدد بن مسدد المتوفی ۲۲۸ھ مسند اسحاق بن راہویہ المتوفی ۲۳۸ھ[2]

ان کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام ترمذی سے پہلے کتنے راہ رو اس دشوار گزار منزل سے گزر چکے تھے، گو ان میں سے زیادہ تر موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو حسن

---

[1] فہرست ابن ندیم [2] ان کتابوں کی تفصیل کے لئے دیکھو بستان المحدثین شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی

قبول کا درجہ حاصل ہوا لیکن اعتبار اور استناد سے بعض اور کتابیں بھی محروم رہیں۔ ان کی موجودگی میں حدیث کی کسی اور کتاب کی تالیف کا خیال اور اس کا حسن قبول پانا اور بھی دشوار تھا اس لیے امام ترمذی نے گزشتہ کتابوں سے الگ اپنی راہ نکالی اور اپنی کتاب میں ایسی خصوصیات سمو دیں جن سے گزشتہ کتابیں خالی تھیں، اس سے نہ صرف یہ کتاب اپنی ماسبق سے ممتاز ہوگئی بلکہ فائدہ کے لحاظ سے بڑھ گئی۔ اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

جامع ترمذی تمام فنون خصوصاً فن حدیث میں کمیت سے زیادہ اس کی کیفیت نقص وکمال کا معیار ہے یعنی روایت اور درایت کے اصول کے اعتبار سے صحیح حدیثوں کا مختصر مجموعہ معلل حدیثوں کے ضخیم مجموعوں سے کہیں بہتر ہے۔ اسی معیار سے ہم کو جامع ترمذی کا جائزہ لینا ہے ترمذی کا درجۂ صحت اس سے ظاہر ہے کہ امت نے اس کو صحاح کا درجہ دیا اور ترتیب میں اس کو صحیحین کے بعد ہی جگہ ملی۔

حدیث کی صحت وعدم صحت کا مدار دو چیزوں پر ہے، رواۃ کی حیثیت اور سلسلۂ سند کی کیفیت اصولِ حدیث کی رو سے رواۃ کے بارے میں سب اصحاب صحاح کے بنیادی شرائط تقریباً یکساں ہیں، یعنی راوی کا اسلام، فہم وفراست، صداقت، عدم تدلیس، عدالت مع جملہ شرائط حفظ، ضبط، تیقظ، عدم وہم، سلامت ذہن اور صحت عقیدہ سب کے نزدیک ضروری چیزیں ہیں[1]۔ پھر ان اوصاف میں کمی و زیادتی کے اعتبار سے رواۃ کے مدارج قائم ہو جاتے ہیں اور ان مدارج اور سند کی حیثیت اور اس کے اقسام کے اعتبار سے حدیث کی صحت و عدم صحت اور نقص وکمال سے اختلاف شروع ہو جاتا ہے مثلاً امام بخاری اور مسلم عموماً وہی حدیثیں قبول کرتے ہیں جن کے راویوں کی ثقاہت وعدالت متفق علیہ ہو جرح وتعدیل کی رو سے بالکل مامون ومصئون ہوں سند نقائص سے پاس ہو بلکہ حاکم نے صحیحین کے شرائط میں ایک روایت کے لیے ان اوصاف کے دو راویوں کے ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن یہ شرط کلیہ کی صورت میں صحیح نہیں ہے کیونکہ امام بخاری کی تمام روایتیں اس شرط کے مطابق نہیں ہیں البتہ اس کا بڑا حصہ اسی قسم کا ہے۔

امام ترمذی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ روایت کسی نہ کسی امام یا محدث کی معمول بہا ہونا چاہئے خواہ راوی

---

[1] اصحاب ستہ کے شرائط بہت سی کتابوں میں ہیں ہمارے پیش نظر ابوبکر حازمی کی شروط الائمۃ الخمسہ ہے۔

اور سند اصول حدیث کے رو سے یکسر نقائص سے پاک نہ ہو چنانچہ وہ چوتھے طبقہ تک کے راویوں کی روایتیں قبول کر لیتے ہیں اور صحیح، مسلسل اور مرفوع روایتوں کے ساتھ ضعیف، مرسل منقطع اور مضطرب روایتوں کو بھی رد نہیں کرتے لیکن عموماً اس قسم کی روایتوں کو وہ شواہد اور متابعات کی حیثیت سے لیتے ہیں یعنی ایک صحیح روایت کے ساتھ اس کی تائید میں دوسری معلل روایت قبول کرتے ہیں لیکن وہ ہر روایت کا عیب و ہنر اور نقص و کمال بھی ظاہر کر دیتے ہیں، اس لئے پڑھنے والے کو اس کی حیثیت اور درجہ کا علم ہو جاتا ہے، یہ خصوصیت ترمذی کے علاوہ صحاح کی اور کسی کتاب میں نہیں ہے۔

جامع ترمذی کی خصوصیات گو صحاح میں ترتیب کے لحاظ سے ترمذی کا درجہ صحیحین کے بعد ہے لیکن اس کی خصوصیات کی وجہ سے اس کا افادہ صحاح کی تمام کتابوں سے زیادہ عام ہے شیخ الاسلام اسماعیل ہروی لکھتے ہیں کہ ترمذی بخاری اور مسلم سے زیادہ فائدہ بخش ہے۔ ان دونوں کتابوں سے صرف صاحب کمال اور صاحب نظر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ترمذی نے احادیث کی ضروری شرح بھی کر دی ہے اس لئے اس سے محدثین اور فقہاء وغیرہ ہر طبقہ کے لوگ مستفید ہو سکتے ہیں[1]۔ ترمذی کی یہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تمام حدیثیں کسی نہ کسی امام، محدث یا فقیہ کی معمول بہا ہیں یعنی ہر روایت کسی نہ کسی صاحب علم کے نزدیک صحیح استقام سے پاک، لائق احتجاج اور قابل عمل ہے صرف دو حدیثیں اس سے مستثنیٰ ہیں، ایک یہ کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر خوف وخطرہ یا سفر اور بارش کی رخصت کے مدینہ میں ظہر اور عصر کی نمازیں ایک ساتھ پڑھیں" دوسری یہ کہ "جب کوئی شراب پیئے اس کو کوڑے لگاؤ تین مرتبہ سزا کے بعد بھی اگر باز نہ آئے تو قتل کر دو[2]"

۲۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف اس میں روایات کی تکرار بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے دوسری طرف ایک مسئلہ کے متعلق مختلف روایتوں کی جانب اشارہ بھی کر دیا ہے مثلاً ایک روایت نقل کرنے کے بعد لکھ دیتے ہیں کہ اس باب میں فلاں فلاں راویوں سے بھی حدیث مروی ہے اور اس روایت کے متعلق

---

[1] مقدمہ احوذی [2] کتاب العلل

Marfat.com

میں جو کمی یا زیادتی ہوتی ہے اس کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔

۳۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جرح و تعدیل کی رو سے جس روایت یا سند میں جو عیب وغیرہ ہوتا ہے اس کو ظاہر کر دیتے ہیں مثلاً یہ حدیث صحیح ہے حسن ہے ضعیف ہے مضطرب ہے، مرسل ہے، منقطع ہے غیر محفوظ ہے، سند قوی نہیں ہے، فلاں راوی متکلم فیہ ہے، اس کے حفظ میں کلام ہے یا نسیان ہے، وغیر ذالک جس سے پڑھنے والے کو اس کی حیثیت اور درجہ کا علم ہو جاتا ہے۔

۴۔ چوتھی یہ کہ فقہی حدیثوں میں فقہا کے مذاہب، ان کے استنباطات دلائل اور ان کے اختلافات اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتے ہیں مثلاً اس حدیث سے فلاں امام نے احتجاج و استدلال کیا ہے اس میں یہ اختلاف ہے یا اس کا استدلال صحیح نہیں ہے اس سے ائمہ کے مذاہب اور ان کے اختلافات کا بھی علم ہو جاتا ہے اس خصوصیت نے ترمذی سے فقہی استفادہ کو بہت آسان کر دیا ہے۔

۵۔ پانچویں یہ کہ رواۃ کے ناموں کنیتوں اور القاب کے اجمال کی تفصیل کر دی ہے۔

اس کی ان خصوصیات نے ترمذی کی افادی حیثیت کو بھی بڑھا دیا ہے ابن اثیر جزری لکھتے ہیں کہ "حسن ترتیب مکررات کی کمی اور فائدہ کی زیادتی کے لحاظ سے ترمذی حدیث کی بہترین کتابوں میں ہے اس کے علاوہ اور کسی کتاب میں مختلف مذاہب ان کے وجوہ استدلال اور حسن و غریب حدیث کی اقسام کی تفصیل نہیں ہے[1]"۔

شمائل ترمذی کے محشی شیخ ابراہیم بن محمد شافعی باجوری کہتے ہیں کہ امام ترمذی کی جامع تنہا اپنے لئے کافی ہے وہ تمام حدیثی اور فقہی فوائد اور سلف و خلف کے مذاہب کی جامع مجتہد کے لئے کافی اور مقلد کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے[2]۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک جامع ترمذی، بخاری، مسلم اور ابو داؤد تینوں کی بعض اچھی خصوصیات کی جامع ہے اور اس میں ان سے زیادہ مفید باتیں ہیں، چنانچہ وہ بخاری، مسلم اور ابو داؤد کی خصوصیات بتانے کے بعد لکھتے ہیں۔

---

[1] جامع الاصول ج ط [2] مواہب لدنیہ

چوتھے ابو عیسیٰ ترمذی میں انہوں نے بخاری، مسلم اور ابو داؤد کی بعض خصوصیات کو اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے، شیخین کے طریقہ پر متون اور اسناد کے ابہام کی تفصیل کر دی ہے اور ابو داؤد کے طریقہ پر ان احادیث کو جمع کر دیا ہے جن پر کسی کا عمل ہے اور ان تینوں پر یہ اضافہ ہے کہ صحابہ اور مختلف ملکوں کے فقہا کے مذاہب کا بھی ذکر کر کے اپنی کتاب کو جامع بنا دیا ہے، طرقِ حدیث کا نہایت لطیف اختصار کیا ہے۔ اس طرح کہ ایک حدیث نقل کر کے دوسرے طرق کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور ہر حدیث کے عیب و ہنر کو ظاہر کر دیا ہے کہ صحیح یا حسن یا ضعیف یا منکر ہے اور وجہ ضعف بھی بتا دی ہے تاکہ طالب کو قابلِ اعتبار اور ناقابلِ اعتبار حدیث سے واقفیت ہو جائے، جس کا نام بتانے کی ضرورت ہے، اس کا نام لے لیا ہے جس کی کنیت کی ضرورت تھی، اس کی کنیت بتا دی ہے، غرض انہوں نے صاحب علم کے لئے کوئی چیز مخفی نہیں چھوڑی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جامع ترمذی مجتہد کے لئے کافی اور مقلد کے لئے دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے[1] شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رقم طراز ہیں کہ یہ جامع ترمذی حدیث کی بہترین کتابوں میں ہے بلکہ بعض وجوہ اور حیثیات سے حدیث کی بہترین کتابوں سے بہتر ہے۔ ایک ترتیب و عدم تکرار کی حیثیت سے، دوسرے فقہاء کے مذاہب اور ان کے استدلال کے ذکر کی حیثیت سے، تیسرے حدیث کے اقسام صحیح، حسن ضعیف، غریب اور معلل بعلل کے ذکر کی حیثیت سے، چوتھے رواۃ کے نام، ان کے القاب اور کنیتوں اور علم رجال کے متعلق دوسرے فوائد کی حیثیت سے[2]۔

ابن حزم کی تنقید امام ترمذی کی علمی جلالت اور جامع ترمذی کی مذکورہ بالا خصوصیات کے باوجود اس پر بعض محدثین نے تنقید بھی کی ہے ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز امام ابن حزم کا امام ترمذی کو مجہول لکھنا ہے لیکن ان کے اس بیان کو بالاتفاق محدثین نے رد کیا ہے اور اس کو امام ترمذی سے ابن حزم کی ناواقفیت کا نتیجہ قرار دیا ہے چنانچہ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:

"حافظ العلم ابو عیسیٰ ترمذی کی ثقاہت متفق علیہ ہے اور ان کے بارے میں ابو محمد بن حزم کا یہ قول کہ وہ مجہول ہیں ناقابل توجہ ہے، درحقیقت ابن حزم ان سے اور ان کی کتاب جامع اور علل سے واقف ہی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ [2] بستان المحدثین

حافظ ابن حجر امام ترمذی کے کمالات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں،

"ابو محمد بن حزم نے ترمذی کو مجہول لکھ کر اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے وہ غالباً ترمذی سے واقف ہی نہ تھے اور نہ ان کو ان کے حفظ اور تصانیف کی خبر تھی ابن حزم نے اس قسم کے الفاظ بعض اور مشہور ثقات حفاظ مثلاً امام ابوالقاسم بغوی، اسماعیل بن محمد الصفار اور ابوالعباس الاصم وغیرہ کے متعلق بھی استعمال کئے ہیں یہ البتہ تعجب انگیز امر ہے کہ حافظ ابن الفرضی نے اپنی کتاب المؤتلف والمختلف میں ترمذی کے رتبہ کے مطابق ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اس پر ابن حزم کی نظر کیسے نہیں پڑی تھی؟"

موضوعات ابن جوزی اور جامع ترمذی | اس سلسلہ میں دوسری چیز یہ ہے کہ ابن جوزی نے موضوعات میں ترمذی کی تیئس روایتوں کو موضوع شمار کیا ہے لیکن محدثین نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس بارے میں ابن جوزی کا تشدد مشہور ہے جس طرح حاکم حدیث کی تحسین کرنے میں غیر محتاط ہیں، اسی طرح ابن جوزی موضوع کہہ دینے میں متشدد ہیں اور ان دونوں کا یہ تشدد و تساہل مشہور ہے۔ ابن جوزی نے ترمذی کے علاوہ صحاح کی بعض اور کتابوں بلکہ صحیح مسلم تک کی بعض روایات کو موضوع کہہ دیا ہے، محدثین نے ان کے اس تشدد پر بحث کی ہے چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ:

"ابن جوزی کی موضوعات میں زیادہ تر موضوع حدیثیں ہیں اور قابل تنقید حدیثوں کے مقابلہ میں قابل تنقید حدیثیں بہت کم ہیں، پھر بھی اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ ابن جوزی بعض ان حدیثوں کو بھی جو موضوع نہیں ہیں، موضوع گمان کر لیتے ہیں جس طرح حاکم میں یہ نقص ہے کہ وہ غیر صحیح حدیث کو بھی صحیح کہہ دیتے ہیں۔ ان دونوں کے اس تشدد و تساہل کی وجہ سے ان کی کتابوں سے ماہر فن کے علاوہ دوسرا فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لئے کہ ان کی ہر نقل کردہ حدیث میں اس تساہل اور بے احتیاطی کا امکان رہتا ہے" حافظ سیوطی نے القول الحسن فی الذب عن السنن میں ثابت کیا ہے کہ ترمذی کی روایتیں موضوع نہیں ہیں۔

ایک اعتراض و اشکال اور اس کا جواب | امام ترمذی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے

---

۱ میزان الاعتدال ج ۳ ۲ تہذیب التہذیب ج ۹ ۳ مقدمہ تحفۃ الاحوذی

جامع ترمذی کی روایات کی تحسین و تصحیح میں تساہل سے کام لیا ہے اور وہ ایک ہی حدیث کو حسن صحیح، حسن غریب اور حسن صحیح غریب تک کہہ دیتے ہیں حالانکہ کسی ایک حدیث میں ایک ساتھ ان تینوں اوصاف یا ان میں سے کسی دو کا اجتماع نہیں ہو سکتا محدثین نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں۔

درحقیقت یہ اعتراض اور اشکال اس لئے پیش آتا ہے کہ حدیث حسن، صحیح اور غریب کے ایک متعین معنی ایک خاص تعریف اور ایک قسم کو معیار قرار دے کر اس پر ترمذی کے حسن صحیح اور غریب کو منطبق کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے اگر ان حدیثوں کے جملہ مراتب و درجات ان کے اقسام ان کی مختلف نوعیتوں اور اس بارے میں محدثین کے اختلافات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ اشکال پیدا نہیں ہو سکتا، اولاً ترمذی خود مجتہد تھے انہوں نے ان اصطلاحوں کے مروجہ معنی کو بجنسہ قبول نہیں کیا تھا بلکہ ان کی بعض اصطلاحوں کا مفہوم عام اصطلاحوں سے مختلف تھا، مثلاً حسن کی مشہور تعریف یہ ہے کہ جس کا مخرج معلوم ہو اور اس کے رجال مشہور ہوں[۱] لیکن ترمذی کے نزدیک حسن وہ ہے جس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور روایت شاذ نہ ہو[۲] اور جیسا کہ شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے مقدمہ شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ یہ بھی حسن کی محض ایک قسم کی تعریف ہے،[۳] نیز امام ترمذی نے خود اس کی تصریح کر دی ہے کہ جس حدیث کو انہوں نے حسن کہا ہے اس سے عام محدثین کی اصطلاح نہیں بلکہ ان کا حسن مراد ہے[۴]۔

اسی طریقہ سے حدیث کی صحت کے بہت سے مدارج اور اس کی مختلف نوعیتیں ہیں اور اس کے لحاظ سے صحیح کی بہت سی قسمیں ہو جاتی ہیں، ابن صلاح لکھتے ہیں کہ حدیث صحیح وہ ہے جس کی سند شروع سے آخر تک مسلسل ہو اس کے تمام راوی عادل و ضابط ہوں اور روایت شاذ و معلل نہ ہو، ایسی حدیث بالاتفاق تمام محدثین کے نزدیک صحیح ہے یعنی یہ صحت کا اعلیٰ درجہ ہے۔ پھر کسی حدیث میں ان اوصاف کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کے اختلاف کی بناء پر یا صحت کے لئے کسی امام یا محدث کے نزدیک ان شرائط میں سے کسی شرط کے ضروری نہ ہونے کی بناء پر اس حدیث کی صحت و عدم صحت میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جیسے مرسل حدیث جن ائمہ کے نزدیک حجت ہے، ان کے نزدیک وہ حدیث صحیح میں شامل ہے اور حسن

---

[۱] مقدمہ ابن صلاح [۲] کتاب العلل مطبع العلوم دہلی [۳] مقدمہ تحفۃ الاحوذی [۴] کتاب العلل

کے نزدیک حجت نہیں ہے ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے پھر جب محدثین کسی حدیث کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک صحت کے شرائط اس میں موجود ہیں یہ ضروری نہیں کہ واقع میں بھی ایسا ہی ہو......اسی طریقہ سے جب کسی حدیث کے متعلق محدثین یہ کہتے ہیں کہ وہ صحیح نہیں ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ جھوٹی ہے کیونکہ ایسی بعض حدیثیں بھی درحقیقت سچی ہوتی ہیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی سند ان کے نزدیک صحت کے شرائط کے مطابق ہے......پھر صحیح حدیث کی دو قسمیں ہیں، متفق علیہ اور مختلف فیہ پھر اس کی قسمیں مشہور اور غریب ہیں پھر کسی حدیث میں صحت کے شرائط کے تمکن کے لحاظ سے صحت کے درجات میں فرق پیدا ہو جاتا ہے یعنی جس کمال کے ساتھ یہ شرائط پائے جائیں گے اسی قدر صحت کا درجہ بڑھ جائے گا اور اس میں جتنی کمی ہوگی اسی اعتبار سے صحت میں فرق پیدا ہو جائے گا اس لحاظ سے صحیح حدیث کی بے شمار قسمیں ہو جاتی ہیں[۱]

اسی طرح صحیح اور حسن کی دو قسمیں ہیں، صحیح لذاتہ اور حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ اور حسن لغیرہ، صحیح لذاتہ اور حسن لذاتہ کی تعریف تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی، صحیح لغیرہ وہ ہے جس میں صحیح لذاتہ کے تمام شرائط تو نہ پائے جاتے ہوں لیکن کثرت طرق نے اس کمی کو پورا کر دیا ہو حسن لغیرہ وہ حدیث ہے جس میں ضعف ہو لیکن تعدد طرق نے اس ضعف کو دور کر دیا ہو، اسی طرح سے غرابت کی دو قسمیں ہیں، متن کی غرابت اور سند کی غرابت، یعنی سند میں کوئی راوی منفرد ہو گیا ہو یا کسی حدیث کے اصل متن میں عام روایات کے خلاف کوئی جزدی کمی یا زیادتی یا تغیر ہو۔

ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے کے بعد حسن، صحیح اور غریب کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا، مثلاً ایک ہی حدیث میں ایک محدث کے نزدیک حسن یا صحیح کے جملہ شرائط پائے جاتے ہیں، اس لئے اس کے نزدیک وہ صحیح یا حسن ہوگی اور دوسرے کے نزدیک نہیں پائے جاتے اس لئے اس کے نزدیک نہ حسن ہوگی نہ صحیح یا ایک کے نزدیک حسن کے شرائط پائے جاتے ہیں، دوسرے کے نزدیک صحیح کے، اس لئے ایک کے نزدیک حسن ہوگی دوسرے کے نزدیک صحیح ہوگی۔

---

[۱] مقدمہ ابن صلاح

اسی طریقہ سے ایک ہی حدیث ایک کے نزدیک حسن ہو سکتی ہے اور دوسرے کے نزدیک صحیح، بس کو امام ترمذی نے حسن صحیح سے تعبیر کیا ہے بلکہ ایک شخص کے نزدیک ایک ہی حدیث حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ ہو سکتی ہے یا ایک حدیث دو سندوں سے مروی ہے، ایک سند کے اعتبار سے حسن ہے دوسری متن کے اعتبار سے صحیح، پھر صحیح کے بہت سے مدارج ہیں ان مدارج کے اعتبار سے صحیح کے ادنیٰ درجہ کا اجتماع حسن کے اعلیٰ درجہ کے ساتھ ہو سکتا ہے اور اس لحاظ سے صحیح کے اعلیٰ شرائط کے تحت حسن کے ادنیٰ شرائط خود بخود آجاتے ہیں، ہر صحیح حدیث حسن کہی جا سکتی ہے اور متقدمین کے یہاں صحیح حدیث پر حسن کا اطلاق ملتا ہے، اس کے علاوہ حسن اور صحیح کے اجتماع کی محدثین نے اور صورتیں بھی نقل کی ہیں۔

اسی طریقہ سے غرابت اور حسن میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے، ممکن ہے ایک حدیث سند کے اعتبار سے غریب ہو اور متن کے اعتبار سے حسن اور ترمذی کی مراد یہی ہے، اسی طریقہ سے صحت اور غرابت کا اجتماع بھی ہو سکتا ہے شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے مقدمۂ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ صحت اور غرابت کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں ہے[1]۔

غرض صحیح حسن اور غریب کے جملہ اقسام و مدارج اور اختلاف کو پیش نظر رکھنے کے بعد ان کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا، اسی سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ترمذی نے حدیثوں کی تحسین و تصحیح میں بھی تساہل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ وہ کسی نہ کسی پہلو سے حسن و صحیح ہوتی ہے۔

یوں تو کتاب اللہ کے علاوہ کسی کتاب کے متعلق قطعی صحت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، بخاری و مسلم تک خردہ گیری سے محفوظ نہیں ہیں، ایسی حالت میں ترمذی کیوں محفوظ رہتی، لیکن مجموعی حیثیت سے سلف سے لے کر خلف تک اس کی صحت مسلمہ چلی آتی ہے حسن کا ثبوت صحاح ستہ میں اس کا شمار ہوتا ہے پھر صحاح میں بھی صحیحین کے بعد ہی اس کو جگہ ملی، ملا کاتب چلپی لکھتے ہیں "ہو ثالث الکتب الستۃ فی الحدیث"[2] اور ائمہ حدیث اس کو احادیث حسن کی بنیاد قرار دیتے ہیں، ابن صلاح لکھتے ہیں "کتاب ابی عیسیٰ اصل فی معرفۃ الحدیث الحسن"[3] یعنی امام ترمذی کی کتاب حدیث حسن کی معرفت کے لئے اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

---

[1] تحفۃ الاحوذی بحوالہ مقدمہ مشکوٰۃ [2] کشف الظنون ج ۱ [3] مقدمہ ابن صلاح

ترمذی کے متعلق اوپر بہت سے اکابر علماء و محدثین کی رائیں گذر چکی ہیں یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں، خود ترمذی کے زمانہ میں عراق، خراسان اور حجاز کے علماء و محدثین سے اس کو حسن قبول کی سند مل چکی ہے۔ امام ترمذی کا بیان ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے بعد میں نے اس کو حجاز، عراق اور خراسان کے علماء کے سامنے اظہار رائے کے لئے پیش کیا۔ ان سب نے اس کو پسند کیا اور اہل نظر نے اس کو یہ سند عطا کی کہ من کان فی بیتہ ھذا الکتاب فکانما فی بیتہ نبی یتکلم، یعنی جس کے گھر میں یہ کتاب موجود ہو اس کے گھر میں گویا نبی بول رہا ہے[1]، اہل علم شعراء نے اس کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور نواب صدیق حسن خان مرحوم نے بستان المحدثین اور حطہ میں یہ قصائد نقل کئے ہیں[2]۔

شروحِ ترمذی ترمذی کی اہمیت اور اس کی فائدہ رسانی کی وجہ سے علماء و محدثین نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا اس کی شرحیں لکھیں، حواشی لکھے مختصرات مرتب کئے۔ اس کے مشکلات حل کئے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر معلومات کا بیش قیمت ذخیرہ فراہم کر دیا۔

صاحب کشف الظنون نے اس کی آٹھ شرحوں کا ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) سب سے پہلی اور قدیم شرح حافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ اشبیلی المعروف بہ ابن العربی المتوفی ۵۴۳ھ کی عارضۃ الاحوذی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے بستان المحدثین میں اس کا مستقل تذکرہ کیا ہے[3]۔ اس کا ایک حصہ مجموعہ شروح اربعہ کے ساتھ چھپ گیا ہے[4] اور کامل نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۲) دوسری حافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن سید الناس یعمری شافعی المتوفی ۷۳۴ھ کی شرح، یہ بڑی ضخیم ہے شارح نے اس میں حدیث کے علاوہ اور بھی بہت سے مباحث شامل کر دیئے ہیں دو ثلث کی یہ شرح دس

---

۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ۲ حطہ و بستان المحدثین ۳ بستان المحدثین ۴ نواب محمد علی خان مرحوم والی ٹونک کے فرزند نواب زادہ محمد عبدالوہاب خان صاحب نے ترمذی کی چار شرحوں عارضۃ الاحوذی، قوت المغتذی سیوطی اور ابوالطیب سندھی اور سراج احمد سرہندی کی شرحوں کو مجموعہ شروح اربعہ کے نام سے چھپوایا تھا۔ غالباً اس کی ایک ہی جلد چھپ سکی۔

جلدوں میں آئی ہے اور مصنف کے قلم سے تمام نہ ہو سکی، ان کے بعد حافظ زین الدین عبدالرحیم بن حسین العراقی المتوفی ۸۰۶ھ نے پوری کی، اس کا مکمل نسخہ بھی مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں ہے

(۳) تیسری صحیحین اور ابوداؤد پر ترمذی کے زوائد کی، سراج الدین عمر بن علی الملقن المتوفی ۸۰۴ھ کی شرح ہے۔

(۴) چوتھی سراج الدین عمر بن رسلان بلقینی شافعی المتوفی ۸۰۵ھ کی شرح العرف الشذی، یہ بھی تمام نہ ہو سکی، صرف ایک ٹکڑے کی شرح ہے۔

(۵) پانچویں حافظ زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن نقیب حنبلی المتوفی ســـھ کی شرح بیس جلدوں میں تھی کسی ہنگامے میں ضائع ہو گئی، اب اس کا نام صرف کتابوں میں ملتا ہے۔

(۶) چھٹی حافظ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی شرح القوت المغتذی، اس کا ایک حصہ شروح اربعہ کے ساتھ چھپا ہے۔

(۷) ساتویں حافظ زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب حنبلی المتوفی ۷۹۵ھ کی شرح، اس کا اور کچھ حال نہیں معلوم۔

(۸) آٹھویں شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھی مدنی المتوفی ۱۱۳۸ھ کی شرح، شیخ مذکور نے اس کو مدینہ طیبہ میں لکھا تھا، کشف الظنون نے اسے بڑی لطیف شرح لکھا ہے[1]۔

ملا کاتب چلپی نے صرف ان آٹھ شروح کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کے علاوہ اور شرحیں بھی ہیں مثلاً

(۹) نویں شیخ سراج احمد سرہندی کی فارسی شرح، اس کا بھی ایک حصہ شروح اربعہ میں چھپا ہے۔

(۱۰) دسویں حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کی اللباب فی مایقول الترمذی فی الباب، امام ترمذی نے فی الباب عن فلاں کہہ کر جن روایتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں اس کی تفصیل مع جرح و تعدیل ہے اس کا نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۱۱) گیارہویں ابوالطیب سندھی المتوفی ۱۱۰۹ھ کی شرح، یہ بھی شروح اربعہ میں ہے۔

---

[1] کشف الظنون ج ۲

Marfat.com

(۱۲) بارہویں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اپنی ایک شرح کا حوالہ دیا ہے۔

(۱۳) تیرھویں مولانا شمس الحق مرحوم عظیم آبادی کی ہدایۃ اللوذعی بنکات الترمذی۔

(۱۴) چودہویں الکوکب الدری مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، یہ جامع ترمذی پر مولانا کے افادات ہیں جیسے مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی مرحوم نے مرتب کیا تھا اور مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم نے شائع کیا ہے

(۱۵) پندرھویں العرف الشذی کے نام سے مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری کے افادات کو ان کے ایک شاگرد نے جمع کیا ہے۔

(۱۶) سولہویں مولانا عبد الرحمٰن مرحوم مبارکپوری کی التحفۃ الاحوذی۔ یہ چھپ گئی ہے۔ اس کا مقدمہ خاص طور سے اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔ کاتب سطور نے اس مضمون میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

(۱۷) مولانا اصغر حسین صاحب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے حنفی نقطۂ نظر سے طلبہ کے استفادہ کے لئے نزول التقوی کے نام سے ترمذی کی احادیث کے متعلق مختلف قسم کے سوالات اور ان کے جوابات لکھے ہیں۔ اس کا ایک حصہ چھپ گیا ہے۔

مختصرات ترمذی شرحوں کے علاوہ ترمذی کے مختصرات بھی کئے گئے کشف الظنون میں تین مختصروں کا حال لکھا ہے ایک نجم الدین محمد بن عقیل البالسی شافعی المتوفی ۷۲۹ھ کا، دوسرا نجم الدین سلیمان بن عبد القوی الطوفی حنبلی المتوفی ۷۱۰ھ کا۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے[1] اسی سے حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلدی علائی نے ترمذی کی سو حدیثوں کا انتخاب کیا ہے۔

تجرید ترمذی ابو الفضل محمد تاج الدین بن عبد المحسن المعروف بہ قلعی نے ترمذی کی تجرید بھی کی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ہے[2]۔

حواشی ان مستقل کتابوں کے علاوہ ترمذی پر بہت سے حواشی بھی لکھے گئے ہندوستان کی مطبوعہ ترمذی میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کا حاشیہ زیادہ شائع ہے

---

[1] فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج اول [2] فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج اول

شمائل ترمذی اس مضمون کا اصل مقصد جامع پر تبصرہ تھا، اور امام ترمذی کی باقی دونوں کتابیں یعنی شمائل اور کتاب العلل موضوع سے خارج ہیں لیکن شمائل کی اہمیت کی وجہ سے اس کا بھی مختصر تذکرہ مناسب معلوم ہوا۔

جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی مسلمانوں کے لئے واجب العمل ہیں اسی طرح آپ کے اخلاق مبارک، اعمال، طور طریقے، طبعی امور آپ کی زندگی کا ہر پہلو اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے اس کے حالات جستہ جستہ حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں لیکن امام ترمذی سے پہلے خاص اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہ تھی، یہ سعادت سب سے پہلے امام ترمذی کے حصہ میں آئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک، لباس، سامان، عادات وخصائل رفتار وگفتار، نشست وبرخاست، اخلاق اور معمولات کے متعلق جتنی روایتیں امام ترمذی کو پہنچیں انہوں نے ان کو شمائل میں جمع کر دیا گیا ہے گو یہ کتاب مختصر ہے لیکن ایسی جامع ہے کہ اس میں اخلاق نبوی کا پورا مرقع نظر آجاتا ہے شمائل ترمذی کے بعد اس موضوع پر اور کتابیں لکھی گئیں، لیکن اولیت کا سہرا امام ترمذی کے سر رہا، کشف الظنون میں شمائل ترمذی کے علاوہ دو اور کتابوں کا نام ملتا ہے ایک ابو العباس جعفر بن محمد المستغفری المتوفی ۴۳۲ھ کی شمائل النبی" دوسری ابو الحسن علی بن محمد بن ابراہیم فزاری المعروف بہ ابن المقری غرناطی المتوفی ۵۵۵ھ کی شمائل بالنور الساطع الکامل[1]" اس کے علاوہ ایک اور کتاب "شمائل محمدی" شیخ عبد الرسول بن عبد الصمد کی ہے[2] لیکن جو حسن قبول شمائل کو حاصل ہوا وہ کسی کے حصے میں نہ آیا۔

اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ جامع ترمذی کی طرح علماء و محدثین نے اس کی بھی بہت سی شرحیں اور حواشی لکھے بعض شرحوں اور ان کے شارحین کے نام یہ ہیں:

(۱) اشرف الوسائل فی شرح الشمائل حافظ ابن حجر مکی المتوفی ۹۷۳ھ یہ شرح حرم محترم میں رمضان کے مقدس مہینے میں لکھی گئی تھی[3]۔

---

[1] کشف الظنون ج ۱ [2] فہرست کتب خانہ رام پور [3] اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر اور کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔ فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۴ وفہرست کتب خانہ رام پور۔

(۲) شرح شمائل مصلح الدین محمد بن صلاح بن جلال اللاری المتوفی ۹۷۹ھ، یہ شرح عربی میں ہے اس کے علاوہ انہوں نے فارسی میں بھی ایک شرح لکھی ہے۔

(۳) زہر الخمائل علی الشمائل حافظ جلال الدین سیوطی۔

(۴) جمع الوسائل، نور الدین علی بن سلطان محمد القاری المعروف بہ ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۶ھ، شیخ محمد بن عمر بن حمزہ انطاکی نے تہذیب الشمائل کے نام سے اس کی تہذیب کرکے اس کو سلطان بایزید کی خدمت میں پیش کیا تھا[۱]، یہ شرح قسطنطنیہ میں ۱۲۹۰ھ میں چھپ چکی ہے۔

(۵) شرح شمائل مولانا عصام الدین ابراہیم بن محمد اسفرائینی المتوفی ۹۴۳ھ[۲]۔

(۶) شرح شمائل مولی محمد حنفی، یہ شرح ۹۲۶ھ میں لکھی گئی[۳]۔

(۷) شرح شمائل حافظ زین الدین محمد المعروف بہ عبد الرؤف بن تاج العارفین مناوی المتوفی ۱۰۳۱ھ یہ شرح مولانا عصام الدین اسفرائینی اور ابن حجر مکی کی شرحوں کا خلاصہ ہے اور کچھ مزید لطائف بھی ہیں خواجہ اسحاق آفندی المتوفی ۱۱۲۰ھ نے ترکی میں اس کا ترجمہ کیا اور مصطفیٰ بن حسین جلبی المعروف بہ مظلوم زادہ نے اسے ترکی میں نظم کیا[۴]۔ یہ شرح مصر اور قسطنطنیہ کے مطبعوں سے شائع ہو چکی ہے (معجم المطبوعات)

کشف الظنون میں صرف ان شرحوں کا تذکرہ ہے لیکن ان کے علاوہ اور بھی بعض شرحیں ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) الفوائد الجلیلۃ البہیہ شیخ محمد بن قاسم بن محمد احمد بن جسوس، شارح بارہویں صدی کے آخر کے ممتاز علماء میں تھے[۵] یہ مطبع بولاق میں ۱۲۹۶ھ میں چھپ گئی ہے۔

---

[۱] کشف الظنون ج ۲، اس کا قلمی نسخہ مصر کے شاہی کتب خانہ میں ہے، ملاحظہ ہو فہرست کتب عربی کتب خانہ خدیویہ ج ۱۔ [۲] اس کا قلمی نسخہ مصر اور پٹنہ لائبریری میں ہے فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۱ مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱۔ [۳] اس کا قلمی نسخہ پٹنہ اور رام پور کے کتب خانوں میں ہے مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ و فہرست رامپور ج ۱۔ [۴] کشف الظنون ج ۲ اس کے قلمی نسخے مصر اور پٹنہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں ملاحظہ ہو فہرست مصر ج اول و مفتاح الکنوز الخفیہ۔ [۵] فہرست کتب خانہ مصر ج ۱

(۹) مواہب محمدیہ شیخ سلیمان بن منصور عجیلی شافعی المتوفی سنہ ۱۲۰۴ھ اس کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ اور پٹنہ لائبریری میں ہیں۔[۱]

(۱۰) شرح شمائل شاہ میرک بخاری۔[۲]

(۱۱) اس فخر و منزلت سے ہندوستان بھی محروم نہ رہا اور یہ سعادت و شرف بھی اسی خاندان کے حصہ میں آیا جس کے فیض سے ہندوستان میں حدیث کا سرچشمہ جاری ہوا یعنی شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خلف الصدق مولانا نورالحق شارح بخاری و مسلم نے شمائل ترمذی کی بھی ایک شرح لکھی اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور میں ہے۔[۳]

(۱۲) شرح حسن آفندی سنہ ۱۲۵۵ھ میں بولاق میں چھپی ہے (معجم المطبوعات)

(۱۳) خصائل نبوی ترجمہ اردو شمائل ترمذی مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم، ترجمہ کے ساتھ احادیث کے متعلق مختلف قسم کی مفید معلومات اور مشکلات کا حل بھی ہے، یہ ترجمہ چھپ گیا ہے۔

شرحوں کے علاوہ شمائل کے متعدد حواشی بھی لکھے گئے، دو مشہور حواشی اور محشی کے نام یہ ہیں:

(۱) مواہب لدنیہ شیخ ابراہیم بن محمد باجوری المتوفی سنہ ۱۲۷۶ھ، یہ حاشیہ سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہوا اور عام طور سے متداول ہے۔

(۲) حاشیہ ابوالضیاء نورالدین علی بن علی شبراملسی شافعی المتوفی سنہ ۱۰۸۷ھ یہ حاشیہ شمائل اور ابن حجر مکی کی شرح شمائل دونوں پر ہے اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ہے۔[۴]

کتاب العلل امام ترمذی کی تیسری کتاب، کتاب العلل ہے یہ علل حدیث پر ایک مختصر لیکن مفید رسالہ ہے حدیث کی صحت اور اس کے استقام کی جانچ کے لئے جرح و تعدیل کے اصول و قواعد اور مستقل فنون ہیں لیکن بعض حدیثوں میں ایسے مخفی عیوب ہوتے ہیں جن کا علم ان اصولوں اور فنون سے نہیں ہوتا اور ایک روایت اصول و قواعد کے اعتبار سے بالکل صحیح ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی ایسی مخفی علت ہوتی ہے جس کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا، اس کے لئے حدیث پر بڑی وسیع اور دقیق نظر کی ضرورت ہے ان عیوب کے

---

[۱] فہرست کتب خانہ مصر ج ۱ مفتاح الکنوز ج ۲ [۲] مفتاح الکنوز ج ۲ [۳] فہرست رام پور [۴] فہرست عربی کتب خانہ خدیویہ۔

معلوم کرنے کے لئے علل الحدیث ہے، حاکم لکھتے ہیں۔

"علوم حدیث میں ایک علم، حدیث کی علتوں کے جاننے کا علم ہے، یہ صحیح، سقیم اور جرح وتعدیل کے علاوہ ایک مستقل علم ہے..... حدیث مختلف وجوہ سے معلل ہو جاتی ہے جس میں جرح وتعدیل کو کوئی دخل نہیں ہوتا اس لئے کہ مجروح حدیث تو سرے سے ساقط اور ناقابل اعتبار ہے۔ اکثر ثقات کی حدیثوں میں ایسی علت ہوتی ہے جو ان کی نظر سے مخفی رہتی ہے اور حدیث معلل ہو جاتی ہے اس کے علم کا ذریعہ صرف حفظ، فہم اور معرفتہ حدیث ہے۔"[1]

حاکم نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں یہ ایسا دقیق علم ہے کہ اس کے لئے بڑی وسعت و دقت نظر کی ضرورت ہے اس لئے بہت کم محدثین نے عللِ حدیث پر لکھا ہے جن لوگوں نے لکھنے کی ہمت کی ان میں ایک امام ترمذی ہیں ان کا یہ رسالہ جامع ترمذی کے آخر میں لگا ہوا ہے۔

---

[1] معرفتہ علوم الحدیث حاکم۔

امام حارث بن ابی اسامہؒ

(متوفی ۲۸۲ھ)

نام ونسب | ابو محمد کنیت، حارث نام اور سلسلۂ نسب یہ ہے: حارث بن محمد بن ابو اسامہ بن یزید بن عدی بن سائب بن شماس بن خنظلہ بن عامر بن حارث بن مرۃ بن مالک بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم۔[1]

اپنے دادا کی نسبت سے مشہور ہو کر حارث بن ابو اسامہ کہلاتے ہیں، ابو اسامہ کا اصل نام داہر تھا۔[2]

خاندان | حارث عرب نژاد اور مشہور قبیلہ بنی تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔[3] اسی لئے تمیمی کہے جاتے تھے۔

پیدائش اور وطن | ان کا وطن بغداد ہے،[4] اور وہ غالباً یہیں ماہ شوال ۱۸۶ھ میں پیدا ہوئے۔[5] وطن کی نسبت سے بغدادی بھی کہلاتے تھے۔

اساتذہ اور شیوخ | حارث بن ابی اسامہ کو جن اکابر محدثین اور علمائے اسلام سے استفادہ کا موقع ملا ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

اسحاق بن عیسیٰ بن طباع، اسود بن عامر شاذان، حسن بن موسیٰ اشیب، روح بن عبادہ

---

[1] تاریخ بغداد ج ۸ [2] بستان المحدثین [3] ایضاً [4] ایضاً [5] تاریخ بغداد ج ۸ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و المنتظم ابن جوزی ج ۵۔

عبداللہ بن بکر، عبدالوہاب بن عطاء، عبیداللہ بن موسیٰ عبسی، عفان بن مسلم، علی بن عاصم، محمد بن عمر واقدی، محمد بن کناسہ، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، ہوزہ بن خلیفہ، یزید بن ہارون، ابو بدر سکونی، ابوعاصم نبیل وغیرہ۔

تلامذہ بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں:

احمد بن سلمان نجاد، احمد بن عثمان بن آدمی، احمد بن معروف خشاب، اسماعیل بن علی خطبی، جعفر خلدی، عبدالصمد بن علی طستی، محمد بن احمد حکیمی، ابوجعفر محمد بن جریر طبری، محمد بن خلف بن مرزبان، محمد بن خلف وکیع، محمد بن مخلد عطار، ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوبکر بن خلاد، ابوبکر شافعی، ابوعمرو بن سماک[1]۔

طلب حدیث کے لئے سفر گو ان کے سفر و سیاحت کی تصریح نہیں ملتی لیکن ان کے اساتذہ اور شیوخ کا تعلق مختلف ملکوں سے تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے علم حدیث کی تلاش و جستجو میں مختلف بلاد اور شہروں کا سفر کیا تھا۔

حافظہ تذکرہ نگاروں نے ان کو الحافظ کہا ہے۔ علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے خصوصیت کے ساتھ ان کے حافظ کا تذکرہ کیا ہے۔

ثقاہت بیشتر محدثین اور علمائے جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ "ابوحاتم ابن حبان، ابراہیم حربی اور امام دارقطنی اور اسی پایہ کے دوسرے اکابر محدثین اور علمائے محققین نے ان کی توثیق کی ہے"[2]۔ امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق تھے۔ برقانی نے ان سے حارث کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ ان کے مرویات کو صحاح میں شامل کرو۔ ابراہیم حربی سے سوال کیا گیا کہ وہ معاوضہ لیتے ہیں، ایسی صورت میں کیا ان سے حدیثیں لی جا سکتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں سنو وہ ثقہ ہیں۔ ابن حبان نے ان کو ثقات میں شامل کیا ہے۔ ابوالعباس نباتی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ احمد بن کامل کا بیان ہے کہ حارث ثقہ اور معتبر

---

[1] تاریخ بغداد ج ۸ [2] بستان المحدثین

Marfat.com

ہیں۔ ابن جوزی بھی ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ علامہ ذہبی نے تذکرہ، میزان اور عبر میں ان کی ثقاہت کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی بعض سندیں نہایت عالی ہیں، اور ان کے متعلق خواہ مخواہ بلا دلیل وحجت شک و تردد کیا جاتا ہے[1]۔

کثرت روایت و معرفت حدیث حارث کے حافظہ میں احادیث کا وافر ذخیرہ محفوظ تھا۔ ان کو کثیر الروایت اور کثیر الحدیث شمار کیا جاتا تھا، ابوالعباس بناتی کا بیان ہے۔ راویۃ الاخبار کثیر الحدیث۔ نیز وہ حدیثوں کے معاملے میں بڑے واقف کار اور ان کی اچھی پرکھ رکھتے تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے، کان حافظا عارفا بالحدیث[2]۔

عسرت و تنگ دستی ان کی زندگی بڑی عسرت اور تنگ دستی کی تھی۔ کثیر العیالی کی بنا پر اکثر زیر بار رہتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ "میرے چھ لڑکیاں تھیں، ناداری کی وجہ سے ان کی شادی نہیں کر سکتا اور غیروں میں شادی کرنے کو غیرت گوارا نہیں کرتی، بعض لوگوں نے شادی کا پیغام بھیجا، لیکن وہ بھی میری ہی طرح فقیر اور محتاج تھے، ایسے لوگوں سے شادی کرکے مجھے اور بھی زیادہ زیر بار ہونا پڑتا۔ عسرت ہی کی بنا پر وہ تعلیم حدیث کا معاوضہ لینے پر مجبور تھے۔

خودداری اس عسرت و تنگ دستی کے باوجود اپنے فقر و فاقہ کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے[3]۔

وفات چھیانوے سال کی طویل عمر میں ۲۸۲ھ میں شب عرفہ میں انتقال کیا اور عرفہ کے دن چاشت کے وقت سپرد خاک کیے گئے[4]۔

مسند ان کی تصنیفات میں صرف ایک مسند کا ذکر ملتا ہے اس میں صحابہؓ کے بجائے شیوخ کی ترتیب پر حدیثیں لکھی گئی ہیں، اس قسم کی کتابوں کو اصطلاحاً معجم کہا جاتا ہے، لیکن جس طرح بعض اور کتابیں بھی محدثین کی اصطلاح کے برخلاف مسند کہلاتی ہیں، اسی طرح یہ کتاب بھی معجم کے بجائے مسند کے

---

[1] میزان الاعتدال ج ۲۔ دبستان المیزان و تذکرہ ج ۲ [2] لسان و میزان حوالۂ مذکور [3] بستان المحدثین۔

[4] تاریخ بغداد ج ۸۔

Marfat.com

نام سے مشہور ہے[1]

یہ مسند طبع نہیں ہوئی۔ اس کا نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ احمد بن ابوبکر بوصیری متوفی ۸۴۰ھ نے "اتحاف بزوائد المسانید العشرۃ" میں اس کی ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں[2]۔

حارث پر طعن و جرح حدیث کی تعلیم کا معاوضہ لینے کی بنا پر بعض محدثین نے ان پر نقد کیا ہے اور ان کو مجروح، ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے نزدیک تعلیم حدیث کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے اور ایسے شخص کی حدیثیں ناقابلِ قبول ہیں، لیکن یہ اصول علی الاطلاق صحیح نہیں ہے۔ اس کے بارہ میں جواز و عدم جواز دونوں قسم کی رائیں ملتی ہیں۔ علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ:

"امام احمد، اسحاق بن راہویہ اور ابو حاتم رازی کے نزدیک اس شخص کی حدیث قبول نہیں کی جائے گی جو حدیث بیان کرنے کا معاوضہ لیتا ہو، لیکن امام بخاری کے استاد ابو نعیم فضل بن دکین اور علی بن عبد العزیز بغوی اور بعض دوسرے علماء نے اس کی اجازت دی ہے۔ ابو اسحاق شیرازی کا فتویٰ ہے کہ جو لوگ حدیث کی تعلیم و تدریس کی وجہ سے اپنے متعلقین کی کفالت اور ان کی معیشت کا انتظام نہ کر سکیں، ان کے لئے اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یتیم کے مال میں سے ضرورت مند اولیاء اور سرپرستوں کو بقدرِ کفالت لینے کی اجازت دی گئی ہے[3]"

خطیب نے دونوں قسم کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

"جو لوگ معاوضہ نہ لینے کے قائل ہیں ان کا مقصد راوی کو طعن اور سوءِ ظن سے منزہ قرار دینا ہے کیونکہ معاوضہ لینے کے بعد آدمی میں نرمی اور مداہنت پیدا ہو جاتی ہے لیکن درحقیقت ان لوگوں کے نزدیک بھی محض مکروہ تنزیہی ہے حرام و ناجائز نہیں اور اکثر

---

[1] بستان المحدثین [2] مقدمہ تحفۃ الاحوذی [3] تدریب الراوی۔

سلف اس باب میں رخصت کے قائل ہیں[1]؛

اس لئے دونوں پہلو برابر ہیں خصوصاً جو لوگ تنگ دستی کی بنا پر معاوضہ لینے پر مجبور ہیں ان کے لئے پوری گنجائش موجود ہے اور اس سے ان کی ثقاہت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس لئے امام حارث پر محض اس بنا پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔

---

[1] کتاب الکفایۃ

Marfat.com

امام احمد بن ابی عاصم نبیلؒ

متوفی ۲۸۷ھ

نام ونسب احمد نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، احمد بن عمرو بن ابو عاصم ضحاک بن مخلد۔[1]

ولادت مورخین کے بیان کے مطابق وفات کے وقت ان کی عمر نوے سال تھی۔[2] اس اعتبار سے وہ ۱۹۷ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

خاندان و وطن عراق کے مشہور علمی مرکز بصرہ کو ان کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن انہوں نے اصبہان میں بود وباش اختیار کر لی تھی۔ قبیلہ شیبان سے اُن کا نسبی تعلق ہے، ان کے جدِ امجد ابو عاصم ضحاک کا جو النبیل کے لقب سے مشہور اور نامور محدث و فقیہ تھے، امام ابوحنیفہ کے ممتاز اصحاب میں شمار ہوتا ہے، بخاری جیسے امام حدیث ان کے دامن فیض سے وابستہ تھے، ابن ابی عاصم کے نانا ابو سلمہ موسیٰ بن اسماعیل بھی بلند پایہ محدث تھے اور ان سے ان کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہے۔

اساتذہ اپنے نانا کے علاوہ امام بخاری، ابو الولید طیالسی، ہدبہ بن خالد اور ہشام بن عمار جیسے نامور علما اور اکابر محدثین سے روایتِ حدیث کی ہے۔

تلامذہ مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

---

[1] العبر فی خبر من غبر جلد ۲۔ البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲

احمد بن بندار، احمد بن معبد سمار، ابو محمد بن حبان، ابو احمد غسال، عبدالرحمن بن محمد بن شان محمد بن احمد کسائی، وغیرہ۔

سفر علم کی تلاش وجستجو خصوصاً حدیث کی طلب کے لئے مختلف بلاد کا سفر کیا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں: وَلَهُ الرحلة الواسعة۔

حفظ وثقاہت حدیث میں آپ کا پایہ اتنا بلند تھا کہ امام وحافظ حدیث کے لقب سے موسوم کئے جاتے تھے۔ تمام علمائے فن کو ان کے ضبط وحفظ، عدالت وثقاہت کا اعتراف ہے۔ ابن ابی حاتم نے صدوق اور ابن اعرابی نے حدیث ومسائل فقہ کا بڑا حافظ بتایا ہے۔ یادداشت کی قوت کا یہ حال تھا کہ پچاس ہزار سے زیادہ حدیثیں وہ زبانی بیان کرتے تھے[1]۔

فقہ فقہ واجتہاد میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے، علمائے طبقات نے فقہ میں ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے، ابن اعرابی کا بیان ہے کہ شفیق بلخی کے ایک ہزار مسائل ان کو زبانی یاد تھے۔

منصب قضا ان کے فقیہ ومجتہد ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ امام احمد کے صاحبزادے صالح کے بعد اصبہان کے قاضی مقرر کئے گئے اور سولہ سال تک اس منصب پر فائز رہے[2]۔

مذہب ومسلک ابو نعیم اور بعض دوسرے علمائے طبقات نے ان کو ظاہری المذہب بتایا ہے[3]، لیکن صاحب شذرات نے اُن کی ایک کتاب الرد علی داؤد الظاہری کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں ممکن ہے وہ ظاہری رہے ہوں، لیکن بعد میں اس مسلک سے رجوع کرلیا ہوگا اور شوافع اور دوسرے اصحاب حدیث کی طرح ظواہر حدیث پر عمل اور ان سے احکام ومسائل کا استنباط کرتے ہوں گے۔

زہد وورع علم کے ساتھ عمل کی دولت سے بھی سرفراز تھے، اصحاب طبقات وتراجم نے ان کے زہد وورع اور تدین وتقویٰ کا بھی ذکر کیا ہے، ان کو تصوف اور صوفیا سے بھی تعلق تھا اور بندگان دین کی خدمت میں استفادہ واصلاح کے لئے جاتے تھے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [2] ایضاً [3] ایضاً۔

ابوتراب نخشبی سے خاص تعلق تھا، ان کی بعض کرامتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔

اتباعِ سنت و اجتناب بدعت بڑے متبعِ سنت تھے اور مبتدعین کو سخت ناپسند کرتے تھے، فرماتے تھے کہ "مجھے پسند نہیں کہ میری مجلس میں کوئی مبتدع، مفتری فحش گو، لعن طعن کرنے والا، امام شافعی اور محدثین کے مسلک سے منحرف و بیزار شخص شریک ہو"۔[1]

اعترافِ کمال محدثین ان کے کمالات کے معترف تھے، علامہ ذہبی نے ان کو صاحبِ مناقب اور کبیر القدر لکھا ہے، ابنِ عماد فرماتے ہیں:

جمع بين العلم والفهم والحفظ والزهد والعبادة والفقه۔	وہ علم و فہم، حفظ و اتقانِ حدیث زہد و عبادت اور فقہ و اجتہاد کے جامع تھے۔

وفات امام ابنِ عاصمؒ نے ربیع الآخر ۲۸۷ھ میں انتقال کیا۔[2]

تصانیف وہ کثیر التصانیف تھے، زنگیوں کی شورش کے زمانے میں ان کی اکثر کتابیں ضائع ہو گئیں، حسبِ ذیل تصانیف کے نام کتابوں میں ملتے ہیں:۔

۱۔ **الرد علی داؤد الظاہری**: نام سے معلوم ہوتا ہے کہ امام داؤد ظاہری کے رد میں ہے۔

۲۔ **کتاب السنۃ**: یہ مسئلہ صفات کے متعلق احادیث کا ایک اہم مجموعہ ہے اس کی تالیف کا اندازہ علمائے سلف کی کتابوں کے مطابق تھا۔[3]

۳۔ **مسند**: یہ ضخیم اور اہم مسند، پچاس ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے۔[4] تمام قابلِ ذکر علماء مصنفین نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ حافظ منذری کے قلم کا لکھا ہوا

---

[1] البدایہ ج ۱۱ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [3] البدایہ جلد ۱۱
[4] کشف الظنون ج ۲۔

اس کا ایک مکمل نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے[1]۔

۴۔ کتاب الدیات : دیت و قصاص کے متعلق روایات کا یہ مجموعہ ۱۳۲۳ھ میں مصر سے شائع ہوا ہے۔

---

[1] مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔

Marfat.com

امام ابوبکر بزارؒ

متوفی ۲۹۲ھ

نام ونسب ابوبکر کنیت، بزار لقب اور احمد نام ہے، سلسلۂ نسب صرف دادا تک معلوم ہے، یعنی احمد بن عمرو بن عبدالخالق۔

بعض اہل لغت کا بیان ہے کہ بزار تیلی کو کہتے ہیں لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں "کسے راگویند کہ تخم فروشی کند وآن کس را در لغت ہندی پنساری نامند"[1]

یعنی بزار تخم فروش کو کہا جاتا ہے جسے ہندوستانی زبان میں پنساری کہتے ہیں۔

خاندان ووطن قبیلہ ازد کی ایک شاخ عتیک سے آپ کا خاندانی اور بصرہ سے وطنی تعلق تھا، اسی نسبت سے عتکی اور بصری مشہور ہوئے[2]۔

اساتذہ بزار کے بعض اساتذہ کے نام یہ ہیں: ابراہیم بن سعید جوہری، اسماعیل بن سیف، بندار، حسن بن علی بن راشد واسطی، عبدالاعلیٰ بن حماد، عبداللہ بن معاویہ جمحی، عبدالرحمٰن بن فضل بن موفق، عمر بن موسیٰ، فلاس، محمد بن یحییٰ بن فیاض رمانی، ہدبہ بن خالد۔

تلامذہ ان کے بعض تلامذہ اور مستفیدین کے نام درج ذیل ہیں:

ابواحمد عسال، ابوبکر بن سلم، ابوبکر بن مہندس، ابوالشیخ، ابوالقاسم طبرانی، ابوالحسن علی بن محمد مصری، حسن بن رشیق، عبدالباقی بن قانع، عبداللہ بن حسن، محمد بن ایوب بن صموت، محمد بن عباس بن نجیح۔

---

[1] لباب ج ۱ و تاج العروس ج ۳، و بستان المحدثین [2] کتاب الانساب و تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔

رحلت وسفر | ابتدائی تعلیم کے زمانہ کے سفر کا حال معلوم نہیں ہوتا، البتہ اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ انہوں نے آخری زمانہ میں احادیث کی نشر واشاعت کے لئے بغداد، اصفہان اور شام وغیرہ کے سفر کئے اور ایک عرصہ تک ان مقامات پر قیام کر کے یہاں کے طلبہ اور شائقین کو حدیث کی تعلیم دیتے رہے[1]۔

حفظ وثقاہت | محدثین نے ان کے فضل وکمال اور حفظ وثقاہت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

ابوالشیخ فرماتے ہیں، کہ

"حفاظ دنیا میں ایک وہ بھی تھے، اور علی بن مدینی کے بعد کوئی شخص ان سے زیادہ حدیثوں کا جاننے والا نہیں گزرا، بغداد کے حفاظ ومحدثین ان کے گرد جمع ہو کر ان سے روایتیں قلم بند کرتے تھے[2]"

ابن قطان کا بیان ہے کہ "وہ لوگوں میں حدیثوں کے سب سے بڑے حافظ تھے"۔

ابن یونس اور خطیب بغدادی نے بھی ان کے حافظہ کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

ابو یوسف یعقوب بن مبارک فرماتے ہیں کہ مارأیت انبل من البزار ولا احفظ، خطیب ذہبی اور صاحب مغنی نے ان کو ثقہ وصدوق قرار دیا ہے۔ اور امام دارقطنی نے ان کی توصیف وستائش بھی کی ہے، اور ان کو ثقہ بھی بتایا ہے، ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں ان سے حدیث نقل کی ہے[3]۔

وفات | بزار نے ۲۹۲ھ میں شام کے مشہور شہر رملہ میں جہاں وہ حدیث کی تعلیم واشاعت کے لئے تشریف لے گئے تھے، انتقال کیا۔ ابن قانع نے ۲۹۱ھ سن وفات بتایا ہے[4]۔ مگر پہلا قول صحیح ہے۔

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۴ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ [2] وبستان المحدثین [3] لسان المیزان جلد ۱۔ میزان الاعتدال ج ۱ وتاریخ بغداد جلد ۴ ۔ [4] ایضاً۔

Marfat.com

اولاد | ان کے ایک فرزند ابوالعباس محمد کا ذکر ملتا ہے جو نامور محدث تھے اور امام دارقطنی اور احمد بن عوف جیسے مشاہیرِ فن نے ان سے کسب فیض کیا تھا۔[1]

مسند | ان حدیث میں بزار کے کمال کا ثبوت مسند کی جمع و تالیف ہے۔ مسند میں اُن کی دو کتابیں تھیں، المسند الکبیر المعلل اس کا نام البحر الزاخر بھی ہے، اور دوسری مسند صغیر، کبیر میں حدیثوں کے علل اور مخفی اسباب قادحہ کے متعلق بھی بحث و کلام کیا گیا ہے، اسی لئے اس کو کتب معلل میں شمار کیا جاتا ہے، محدثین کی اصطلاح میں معلل وہ کتابیں کہلاتی ہیں، جن میں مصنف ان مخفی اسباب و علل کو بیان کرتا ہے جو صحت حدیث کے لئے موجب قدح ہیں، عراقی کا بیان ہے کہ بزار نے صحیح و غلط روایتوں سے کم اور رواۃ حدیث کے تفرد و عدم متابعت سے زیادہ تعرض کیا ہے۔[2]

حافظ ابن حجر نے اس کے ان زوائد کی جو کتب ستہ اور مسند احمد میں نہیں پائے جا[illegible] اپنے استاد ابوالحسن ہیثمی کی کتاب سے تلخیص کی ہے، مسند کا ایک جامع و مکمل [illegible] حافظ ہیثمی کے قلم کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہی نسخہ [illegible] کے استعمال میں رہا ہے۔[3]

بزار پر غلطی کا الزام | محدثین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ بزار روایت [illegible] میں غلطی کر جاتے تھے۔ امام دارقطنی اور حاکم کا بیان ہے کہ وہ متن و اسناد دونوں میں غلطی [illegible] ہیں، امام نسائی نے بھی ان پر جرح کی ہے اور بعض لوگوں نے ان کے تفرد اور عدم متابعت [illegible] کا بھی ذکر کیا ہے۔[4] لیکن ان اعتراضات سے ان کے فضل و کمال میں کوئی فرق نہیں [illegible] ابن حجر نے بزار کے بعض تفردات ذکر کر کے ان کا جواب دیا ہے، اور یہ بھی [illegible] ہے کہ اکثر میں وہ منفرد نہیں ہیں، دوسرے ان کے ثقہ و ثابت ہونے [illegible] کلام نہیں

[1] تاج العروس ج ۳ [2] بستان المحدثین [3] مقدمہ تحفۃ الاحوذی [4] لسان المیزان ج ۱ [illegible]

خود ان ائمہ سے بھی جنہوں نے ان کی تضعیف کی ہے، توثیق منقول ہے۔ امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ "وہ ثقہ ہیں، اوران سے غلطی بھی سرزد ہوتی، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ عموماً اپنے حافظ اوریادداشت پراعتماد کرتے تھے، اورروایت بیان کرتے وقت صحیح نسخہ کو پیشِ نظر نہیں رکھتے تھے"

اور مجرد غلطی راوی کے متروک و ساقط الروایت ہونے کی دلیل نہیں۔ اس پر پہلے بحث کی گئی ہے۔

Marfat.com

امام ابو مسلم کشی رح

متوفی ۲۹۲ھ

نام ونسب ابراہیم نام، ابو مسلم کنیت۔ نسب نامہ یہ ہے۔ ابراہیم بن عبداللہ بن مسلم بن ماعز[1] خطیب نے ماعز کے بعد مہاجر اور سمعانی نے کش لکھا ہے[2]۔

ولادت خطیب نے لکھا ہے کہ "بیان کیا گیا ہے کہ وہ سنہ ۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے"[3] لیکن ذہبی نے ان کی عمر سو سال کے لگ بھگ بتائی ہے، اور ان کا سنہ وفات ۲۹۲ھ ہے۔ اس لحاظ سے ان کی پیدائش سنہ ۲۰۰ھ سے پہلے ہوئی ہوگی[4]۔

خاندان ووطن وہ بصری اور کشی کی نسبتوں سے زیادہ مشہور ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ بصرہ کے باشندہ تھے، لیکن مقدسی کا بیان ہے کہ وہ بصرہ میں معماری کا کام کرتے تھے، اس لئے ان کو بصری کہا جاتا ہے۔ دوسری نسبت کش کی جانب ہے جو جرجان کے ایک گاؤں کا نام ہے لیکن سمعانی نے ان کے جد اعلیٰ کا نام کش لکھا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کش فارسی لفظ کج (دیکھ) کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی چونے کے ہیں اور چونکہ وہ بصرہ میں معماری کا کام کرتے تھے اور اکثر ہات الکج (چونا لاؤ) کہا کرتے تھے، اس لئے کجی لقب پڑ گیا تھا۔ محمد بن طاہر مقدسی اور علامہ ابن ندیم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ ابن ندیم لکھتے ہیں کہ ان کے باپ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [2] تاریخ بغداد جلد ۶ وکتاب الانساب [3] تاریخ بغداد جلد ۶

[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۲

بصرہ میں منتقل ہو گئے تھے، اور یہ وہاں معماری کرتے تھے، اور اکثر مزدوروں سے کج کج کہا کرتے تھے، اس لئے ان کو کجی کہا جاتا ہے۔ حافظ ابو موسیٰ کے نزدیک کج خوزستان کے ایک گاؤں کا نام ہے جس کو زیر کج کہا جاتا ہے۔ ابو مسلم اسی کی جانب منسوب ہیں۔ علامہ سمعانی نے ان کی ایک نسبت لیثی بھی بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نسبی تعلق بنو لیث سے تھا۔[1]

اساتذہ و شیوخ امام ابو مسلم کشی نے جن نامور علما و محدثین سے کسبِ فیض کیا تھا، ان کے نام یہ ہیں:

ابو عاصم نبیل، ابو الولید طیالسی، بدل بن محبر، حجاج بن نصیر، فساطیطی، سلیمان بن حرب، عبداللہ بن رجاء غدانی، عبداللہ بن مسلم قعنبی، عبدالرحمٰن بن حماد شعبی، عبدالملک بن قریب اصمعی، عمرو بن مرزوق، محمد بن عبداللہ انصاری، محمد بن عرعرہ، مسلم بن ابراہیم، معاذ بن عبداللہ عوذی وغیرہ۔

تلامذہ ان سے جن لوگوں نے استفادہ کیا ہے، ان کی تعداد بے شمار ہے، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابو بکر شافعی، ابو بکر مالک بن قطیعی، ابو سہیل بن زیاد، ابو عمرو بن سماک، ابو القاسم بغوی، ابو محمد بن ماسی، احمد بن سلمان نجاد، اسماعیل خطبی، اسماعیل بن محمد صفار، جعفر خالدی، حبیب قزاز، عبدالباقی بن قانع، فاروق خطابی، محمد بن جعفر ادمی اور خود ان کے صاحبزادے ابو الحسن محمد بن ابراہیم کشی وغیرہ۔[2]

سفر اُن کے صرف بغداد جانے اور وہاں حدیثیں بیان کرنے کا ذکر ملتا ہے۔

حفظ و ثقاہت امام ابو مسلم کے علم و فضل، حفظ و ضبط اور ثقاہت و اتقان پر علماء

---

[1] کتاب الانساب۔ معجم البلدان۔ الفہرست۔ والرسالۃ المستطرفۃ۔ [2] تاریخ بغداد ج ۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔

Marfat.com

فن کا اتفاق ہے۔ علمائے طبقات و سیر نے ان کو الحافظ کان محدثاً حافظا، اور من حفاظ الحدیث لکھا ہے۔ موسیٰ بن ہارون اور امام دارقطنی نے ان کو ثقہ و صدوق قرار دیا ہے محمد بن علی صوری کا بیان ہے کہ میں نے حافظ عبدالغنی بن سعید سے ابو مسلم کجی کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ ثقہ اور نہایت ذکی تھے۔ علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ وہ عالم، ثقہ اور جلیل القدر محدث تھے۔ ابن ندیم لکھتے ہیں کہ وہ ان اجلہ محدثین میں تھے، جن کی سندیں نہایت عالی ہوتی ہیں۔ علامہ سمعانی رقمطراز ہیں کہ وہ ثقہ اور اکابر محدثین میں تھے اور انہوں نے بے شمار حدیثیں بیان کیں۔ خطیب کا بیان ہے کہ وہ صاحب علم و فضل اور امین تھے۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں وہ احادیث کے واقف کار اور بقیۃ الشیوخ میں تھے، ابن عماد لکھتے ہیں، وہ صاحب سنن اور مسند وقت تھے۔[1]

مرجعیت و مقبولیت ابو مسلم کے علم و فضل نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا۔ ان کے درس میں ہزاروں اشخاص شریک ہوتے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ جب وہ بغداد تشریف لائے، تو تشنگان علم کا جم غفیر اُن کے گرد اکٹھا ہو گیا تھا۔ غسان کے میدان میں جو بغداد کا سب سے وسیع اور کشادہ مقام تھا جب اُن کی مجلس درس آراستہ ہوئی، تو سامعین کا بڑا اژدھام تھا۔ حاضرین کا تخمینہ چالیس، پچاس ہزار لگایا گیا۔[2]

امارت و شکوہ اور جود و سخاوت اللہ تعالیٰ نے علم و فضل اور عزت و شہرت کے ساتھ مال و دولت اور جاہ و حشمت سے بھی نوازا تھا۔ طبعاً بڑے فیاض تھے، مورخین نے اُن کے اوصاف و کمالات کے ذکر میں انہیں صاحب حشمت، کبیر الشان، ذی جاہ اور سخی و فیاض بتایا ہے۔ جب انہوں نے اپنی سنن کی جمع و تالیف کا کام ختم کر کے لوگوں کے سامنے اس کو پہلی مرتبہ پیش کیا اور پڑھا، تو ایک ہزار درہم فقراء و مساکین میں تقسیم کئے اور محدثین و اہل فن

---

[1] ایضاً و الفہرست۔ و کتاب الانساب و شذرات الذہب جلد ۲۔

[2] تاریخ بغداد ج ۶ و البدایہ جلد ۱۱ و تذکرۃ جلد ۲۔

کے علاوہ دوسرے اعیان و عمائد کی ایک پُرتکلف دعوت کی اور اس میں تقریباً ایک ہزار دینار صرف کئے۔ خطیب کا بیان ہے کہ

"انہوں نے نذر مانی تھی کہ جب حدیث بیان کرنا شروع کریں گے تو دس ہزار دینار صدقہ کریں گے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب وہ دس ہزار حدیثیں بیان کر لیتے، تو کچھ نہ کچھ صدقہ ضرور کرتے، جب پہلی مرتبہ حدیث بیان کی تو خود بھی صدقہ و خیرات کیا اور اپنے شریک تجارت کو بغداد خط لکھا کہ تم ساری کھجوریں صدقہ کر دو اور اگر فروخت کر چکے ہو تو ان کی قیمت غریبوں میں تقسیم کر دو۔[۱]"

پیشہ | شروع میں وہ معماری کا کام کرتے تھے، پھر تجارت کرنے لگے تھے اور بصرہ سے بغداد کھجوریں بھیجتے تھے، وہاں ان کی طرف سے ایک وکیل تھا، جو ان کو فروخت کرتا تھا ابو مسلم بعض سرکاری مناصب پر بھی فائز رہے ہاسی لئے مشہور شاعر بحتری نے ان کی شان میں مدحیہ اشعار کہے ہیں[۲]۔

وفات | تقریباً ایک سو سال کی عمر میں ۲۲ محرم الحرام ۲۹۲ھ بروز یکشنبہ بغداد میں انتقال کیا اور وہاں سے ان کی لاش بصرہ لائی گئی اور یہیں تجہیز و تکفین ہوئی[۳]۔

تصنیفات | علامہ ابن ندیم نے ان کی دو کتابوں السنن والمسند کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سنن زیادہ مشہور ہے۔ اس کی اکثر حدیثیں ثلاثی ہیں اور قلمی نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں پایا جاتا ہے[۴]۔

۱؎ تاریخ بغداد ج ۶ والبدایہ جلد ۱۱ و تذکرہ جلد ۲ ۲؎ تاریخ بغداد جلد ۶ ۳؎ ایضاً و تذکرۃ الحفاظ ج ۲

۴؎ الفہرست و مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔

Marfat.com

امام محمد بن نصر مروزی

متوفی سنہ ۲۹۴ھ

نام ونسب نام محمد، ابو عبداللہ کنیت، شیخ الاسلام لقب، نسب نامہ کتابوں میں مذکور نہیں ہے۔

ولادت، خاندان ووطن ان کی زبانی منقول ہے کہ میں بغداد میں پیدا ہوا میرے والد مروزی تھے، میری نشوونما نیشاپور میں ہوئی، اور اب سمرقند میں رہتا ہوں؟

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا آبائی وطن خراسان کا مشہور شہر مرو ہے اسی لئے وہ مروزی کی نسبت سے مشہور ہیں لیکن انہوں نے سمرقند میں بود وباش اختیار کرلی تھی۔

اساتذہ محمد بن نصر کو جن اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن منذر خرامی، ابو قدامہ سرخسی، اسحاق بن راہویہ، ربیع بن سلیمان، سعید بن عمرو اشعثی، شیبان بن فروخ، صدقہ بن فضل، عبدان بن عثمان مروزی، عبید اللہ بن معاذ عنبری، علی بن بحر قطان، علی بن حجر، عمرو بن زرارہ، محمد بن بشار بندار، محمد بن عبداللہ بن نمیر، محمد بن عبدالملک بن ابی الشوارب، ہدبہ بن خالد، ہشام بن عمار، یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری، یزید بن صالح، یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ۔

تلامذہ ان کے چند تلامذہ اور منتسبین کے نام یہ ہیں،

لہ تاریخ بغداد ج ۳، تہذیب التہذیب ج ۹۔

ابوحامد بن شرقی، ابو العباس سراج ، ابو عبداللہ بن اخرم، ابو علی عبداللہ بن محمد بن علی بلخی عثمان بن جعفر لبان، محمد بن منذر سکر، محمد بن یعقوب بن اخرم اور عزیزوں میں ان کے صاحبزادہ اسمٰعیل بن محمد کو ان سے روایت کرنے کا موقع ملا۔[1]

رحلت وسفر | اُن کو علم وفن سے فطری ذوق تھا، اور ہمیشہ علمی مسائل پر بحث وگفتگو کرتے تھے، عبداللہ بن محمد ثقفی کا بیان ہے کہ "میرے دادا جو اُن کے ساتھ چار سال رہے۔ بیان کرتے ہیں کہ میں نے انہیں غیر علمی باتیں کرتے نہیں دیکھا، اس شوق کی تکمیل کے لئے انہوں نے طلب علم کے لئے مختلف شہروں کا سفر کیا۔ خطیب لکھتے ہیں، رحل الی سائرۃ الامصار فی طلب العلم۔ علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ انہوں نے طلب علم کے لئے مختلف شہروں کا سفر کیا اور خراسان، عراق، حجاز، شام ومصر کے علماء سے استفادہ کیا۔[2]

حدیث میں درجہ | حدیث میں ان کی جلالت قدر کا اندازہ ان بیانات سے ہوگا۔ علامہ ذہبی نے ان کو "برع فی ھذا الشان اور رأسا فی الحدیث" لکھا ہے، حاکم کا بیان ہے کہ "وہ حدیث کے بحر زخار تھے" اکابر علماء جرح وتعدیل نے ان کے ضبط وثقاہت اور حفظ واتقان کا اعتراف کیا ہے، حافظ ابن حجر نے ان کو الحافظ، الثقۃ اور ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ان جامعین ومصنفین حدیث میں تھے، جو مرتبۂ امامت پر فائز تھے، ابو محمد بن حزم کا بیان ہے کہ وہ سنن کے جامع وضابط صاحب علم اور احادیث کے مطالب کے حافظ اور مدافع تھے۔[3]

فقہ واخلاقیات | فقہ واخلاقیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، ان کے سوانح نگاروں نے ان کے نام کے ساتھ "الفقیہ" "احد ائمۃ الفقہاء" اور "راسا فی الفقہ" وغیرہ لکھا ہے۔

وہ نیشاپور کے مفتی سمجھے جاتے تھے، محمد بن یحییٰ سے جب کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ وطبقات الشافعیۃ ج ۲ [2] تاریخ بغداد جلد ۳ والمنتظم [3] تاریخ بغداد ج ۳ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ والمنتظم ج ۶۔

Marfat.com

اس کو ابو عبداللہ مروزی کے پاس بھیج دیتے، خطیب بغدادی تحریر فرماتے ہیں کہ ان کو صحابہ اور مابعد کے علماء کے اختلافات سے بڑی واقفیت تھی، ابو محمد بن حزم کا بیان ہے کہ وہ اجماع و اختلافیات کے بڑے عالم تھے[1]۔

مذہب و مسلک امام شافعیؒ سے ان کو بڑا تعلق تھا، ان کے نامور تلامذہ سے فقہ کی تحصیل کی تھی، اور اسی مسلک فقہ سے وابستہ تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ ان کے زمانہ کے شوافع میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہیں تھا[2]۔

مقبولیت ان کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، عوام و خواص اور امراء و حکام سب ان کا بڑا احترام کرتے تھے، امیر اسماعیل بن احمد کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ احتراماً کھڑا ہو جاتا تھا[3]۔

امامت علمائے طبقات و تراجم نے ابو عبداللہ مروزی کو ائمہ مسلمین میں شمار کیا ہے اور احد الاعلام، احد اعلام الامتہ، احد ائمۃ الاسلام اور الامام الجلیل وغیرہ القاب سے موسوم کیا ہے سلیمانی اور ابو بکر ضبغی نے ان کو امام بتایا ہے۔ محمد بن عبداللہ بن عبد الحکم کا جو ان کے استاذ فقہ تھے، بیان ہے کہ جب وہ مصر میں ہم لوگوں کے درمیان مرتبہ امامت پر فائز ہیں، تو خراسان میں کس کو اُن کی امامت میں کلام ہو سکتا ہے، ابو بکر احمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ میں نے دو ائمہ مسلمین دیکھے، ابو حاتم رازی اور ابو عبداللہ مروزی[4]۔

زہد و عبادت زہد و تقویٰ میں بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا، علمی اشغال سے جو وقت بچتا اس کو عبادت اور یادِ الٰہی میں صرف کرتے تھے، نمازیں بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتے تھے، ابو بکر ضبغی کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بہتر کسی کی نماز نہیں دیکھی۔ ابن حزم فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ان کی نماز کا حسن اور خشوع و خضوع دیکھ کر سخت متعجب ہوتے تھے استغراق و محویت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ نماز میں بھڑ نے ڈنک مار دیا، اور جسم سے خون جاری ہو گیا

---

[1] ایضاً و طبقات الشافعیہ ج ۲ [2] شذرات الذہب ج ۲ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [4] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ و طبقات الشافعیہ ج ۲، تاریخ بغداد جلد ۳، و تہذیب التہذیب ۹۵

مگر انہوں نے کوئی حرکت اور جنبش نہیں کی، وہ جب نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تو ایک بے حس وحرکت لکڑی کی طرح معلوم ہوتے تھے[1] اس انہماک کی وجہ سے اُن کا شمار اکابر صلحأ اور مشہور عباد وزہاد میں ہوتا تھا[2] ان کی بعض کرامتیں بھی بیان کی جاتی ہیں۔

ذریعہ معاش اور جود وسخا ان کی مستقل آمدنی بارہ ہزار سالانہ تھی۔ چار ہزار اسماعیل بن احمد امیر خراسان اور اسی قدر ان کے بھائی اسحاق اور اہل سمرقند کی جانب سے ان کو وظیفہ ملتا تھا لیکن ان کے مزاج میں بڑی سخاوت وفیاضی تھی، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

وقد کان من اکرم الناس واسخاھم نفسا[3] — وہ بڑے کریم اور سخی تھے۔

اس لئے یہ کل رقم محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ایک معمولی رقم میں گزربسر کرتے، جب ناگہانی ضرورت کے لیے کچھ پس انداز کرنے کے لئے کہا جاتا تو کوئی توجہ نہ کرتے، اپنے ایک شریک کو مضاربت پر اپنا مال تجارت کے لئے بھی دیتے تھے[4]۔

اولاد عرصہ تک لاولد رہے، آخر عمر میں اولاد کی آرزو بہت بڑھ گئی تھی، اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے جو قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ایک صالح فرزند عطا کیا۔ جب بچہ کے تولد کی ان کو اطلاع ہوئی تو بے ساختہ اُن کی زبان پہ دعائے ابراہیمی آگئی۔

الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسماعیل، اس بچّہ کا نام انہوں نے اسماعیل ہی رکھا[5]۔

حلیہ صورت نہایت حسین اور چہرہ گلاب کی طرح شاداب اور شگفتہ تھا، داڑھی نے چہرے کو اور زیادہ پُر نور بنا دیا تھا۔

---

[1] ایضاً [2] صفۃ الصفوۃ جلد ۴ وطبقات الشافعیہ جلد ۲ [3] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ [4] تاریخ بغداد جلد ۳ وتذکرہ ج ۲ [5] المنتظم ۶۵

وفات محرم ۲۹۴ھ میں سمرقند میں وفات پائی۔[1]

تصنیفات انہوں نے متعدد کتابیں تالیف کیں، خطیب کا بیان ہے کہ صاحب التصانیف الکثیرہ والکتب الجمۃ یعنی وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی کتابیں بڑی مفید اور بیش قیمت تھیں، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں، وصنف الکتب المفیدۃ الحافلۃ النافعۃ یعنی نہایت مفید کتابیں لکھیں۔

ان کی جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے ہیں وہ یہ ہیں:

مسند یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور کتاب ہے، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں عبدالقادر بن عبدالعزیز کے قلم کا لکھا ہوا دو سو اڑسٹھ اوراق میں موجود ہے۔ سنہ کتابت ۹۵۶ھ ہے اس کے شروع میں ایک باب نماز کا بھی ہے۔ اس کا عنوان ہے باب فی تعظیم قدر الصلوٰۃ وتفضیلھا علی سائر الاعمال،[2] جو بجائے خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، بعض علماء نے اس کا مستقل تصنیف کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وصنف کتاباً عظیماً فی الصلوٰۃ[3] (نماز پر ایک مہتم بالشان کتاب لکھی)

کتاب القسامہ: مروزی کی یہ دوسری اہم تصنیف ہے۔ ابوبکر صیرفی اس کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ:

"اگر انہوں نے صرف یہی کتاب لکھی ہوتی، تو بھی اُن کے بڑے فقیہ ہونے کے لئے کافی تھی۔"[4]

علامہ ابن سبکی نے اُن کی ایک اور کتاب کا ذکر کیا ہے، اس میں امام ابوحنیفہؒ نے حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے مسلک سے جن باتوں میں اختلاف کیا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و طبقات الشافعیہ ج ۲ [2] فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱۔

[3] البدایہ جلد ۱۱ [4] تاریخ بغداد ج ۳۔

ہے، اس کا ذکر ہے[1]۔

قیام اللیل اور کتاب رفع الیدین قیام اللیل اور کتاب رفع یدین کے نام سے بھی دو رسالے لکھے تھے جو طبع ہو چکے ہیں[2]۔

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۲۔

[2] خاتمہ سیرۃ الامام البخاری۔

Marfat.com

امام ابو محمد ابن جارودؒ

متوفی ۲۹۹ھ

نام ونسب عبداللہ نام، ابو محمد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، عبداللہ بن علی بن جارود۔

وطن سنہ ولادت اور خاندانی حالات معلوم نہیں ہو سکے، وطن نیشاپور ہے مکہ میں مجاورت اختیار کرلی تھی۔

اساتذہ چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:۔

ابو سعید بن الشج، احمد بن ازہر، احمد بن یوسف سلمی، اسحاق کوسج، بکر بن نصر، زیاد بن ایوب، عبداللہ بن ہاشم طوسی، عبدالرحمان بن بشر، علی بن خشرم، محمد بن ابی عبدالرحمن مقری، محمد بن آدم، محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم، محمد بن عثمان بن کرامہ، محمد بن یحیٰی، یعقوب بن ابراہیم دورقی وغیرہ۔

تلامذہ حافظ ذہبی نے ان کے چار تلامذہ ابو حامد بن شرقی، دعلج سجزی، محمد بن نافع مکی اور یحیٰی بن منصور کا نام تحریر کیا ہے۔

ضبط واتقان اور ان کے علم وفضل کے بارہ میں لکھتے ہیں۔

هو الحافظ الامام الناقد كان من العلماء المتقنين المجودين۔	وہ حدیث کے حافظ، امام، ناقد اور ثقہ وضابط اور جید علمائے اسلام میں تھے۔

Marfat.com

وفات ان کا سنہ وفات ۳۰۷ھ ہے۔[1]

تصنیفات ابن جارود کی کتاب "المنتقی" احکام وسنن سے متعلق روایات واحادیث کا ایک منتخب ومختار مجموعہ ہے، جو ایک جلد میں اور تقریباً آٹھ سو حدیثوں پر مشتمل ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں۔

"یہ کتاب گویا صحیح ابن خزیمہ پر مستخرج ہے، لیکن اس میں صرف اس کے اصولِ احادیث پر اکتفا کیا گیا ہے، اسی لئے اس کا منتقی ہے۔"[2]

صاحب الرسالۃ المستطرفہ کتانی فرماتے ہیں، کہ

"اس کے استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بہت کم حدیثوں میں صحیحین سے تفرد کیا گیا ہے۔"[3]

ابن حزم کا بیان ہے کہ

"صحیحین کے بعد ابن سکن، ابن جارود اور ابن اصبغ کی کتابوں کا درجہ ہے۔ اس کے بعد ابو داؤد ونسائی کی کتابوں کا نمبر آتا ہے۔"[4]

منتقی ابن جارود پہلی مرتبہ حیدرآباد دکن سے پانچ سو چار صفحات میں شائع ہوئی ہے۔ شروع میں جن جن طرق سے اس کی روایت کی گئی ہے، ان کا ذکر ہے۔ حواشی مختصر مگر مفید مطالب پر مشتمل ہیں، ہر حدیث کے سامنے حاشیہ میں اس کے ماخذ حروف تہجی کے ذریعہ ظاہر کئے گئے ہیں۔ مثلاً ط سے موطا، حم سے مسند احمد، خ سے بخاری اور م سے مسلم وغیرہ۔

ابو عمرو اندلسی نے المرتقی فی شرح المنتقی کے نام سے اس کی شرح لکھی تھی۔[5]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳۔ [2] بستان المحدثین

[3] الرسالۃ المستطرفہ [4] تدریب الراوی [5] الرسالۃ المستطرفہ

Marfat.com

امام ابو عبدالرحمٰن نسائیؒ

متوفی ۳۰۳ھ

نام و نسب احمد نام اور ابو عبدالرحمٰن کنیت تھی، سلسلۂ نسب یہ ہے، احمد بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار۔[1]

پیدائش عام مورخین کے بیان کے مطابق امام نسائیؒ ۲۱۴ھ یا ۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے لیکن بعض نے سنہ پیدائش ۲۲۵ھ لکھا ہے[2] جو صحیح نہیں ہے۔

وطن امام نسائی نے بعد میں مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، لیکن ان کی پیدائش اور نشو و نما خراسان کے مشہور شہر نساء میں ہوئی[3]۔ قدیم زمانہ میں نساء علم و فن اور ارباب کمال کا مرکز رہ چکا ہے اور اس کی خاک سے بہت سے نامور علماء و فضلاء پیدا ہوئے اسی کی نسبت سے وہ نسائی کہلاتے ہیں نسوی سے بھی اسی کی جانب نسبت ہے مگر وہ زیادہ مشہور نہیں، نساء خراسان میں ہے اس لئے امام صاحب کو خراسانی بھی کہا جاتا ہے[3]۔

اساتذہ اور شیوخ امام نسائی کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے بعض مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابو یزید جرمی، احمد بن عبدہ، اسحٰق بن راہویہ، حسین بن منصور، حمید بن مسعدہ، سوید بن منصور، ابوالحسن علی بن حجر بن ایاس، علی بن خشرم، عمران بن موسےٰ، عمرو بن زرارہ، عیسیٰ بن حماد، ابو رجا قتیبہ بن سعید بلخی، مجاہد بن موسیٰ، محمد بن بشار، محمد بن رافع، ابو کریب محمد بن علاء، محمد بن نصر مروزی، ہشام بن عمار اور یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ اکابر و افاضل اور اساطین حدیث سے احادیث نبویؐ کا سماع کیا اور احمد بن نصر نیشاپوری

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و تہذیب التہذیب ج ۱ و طبقات الشافعیہ سبکی ج ۲ [2] حسن المحاضرہ سیوطی ج ۱ و شذرات الذہب ج ۲ [3] کتاب الانساب ورق ۵۶۳ و وفیات الاعیان ج ۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲

Marfat.com

اور ابو شعیب سوسی سے فن قرأت کی تحصیل کی۔

ائمہ صحاح میں امام بخاری اور امام ابو داؤد سے بھی ان کو شرف تلمذ حاصل ہے[1]۔

تلامذہ ان کے تلامذہ کے ناموں کا استقصاء دشوار ہے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:۔

ابراہیم بن محمد بن صالح، ابو البشر دولابی، ابو علی حسین محمد نیشاپوری، ابو القاسم طبرانی، ابو القاسم حمزہ بن محمد کنانی، ابو علی حسن بن خضر سیوطی، ابو بکر احمد بن اسحاق السنی، محمد بن معاویہ، حسن بن رشیق، ابو الحسن محمد بن عبد اللہ حیویہ، محمد بن قاسم اندلسی، ابو بکر احمد بن محمد، ابو عوانہ، ابو جعفر طحاوی، ابو بکر احمد بن حداد، ابو جعفر عقیلی، ابو علی محمد بن ہارون اور آپ کے صاحبزادے عبد الکریم وغیرہ۔ ان میں سے اکثر حضرات نے آپ کی کتاب سنن کی روایت کی ہے[2]۔

تعلیم و تحصیل حدیث کے لئے سفر امام نسائی کی ابتدائی تعلیم کے حالات نہیں ملے مگر اتنا معلوم ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق انہوں نے مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا تھا علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ "دور دراز شہروں میں جاکر سماع حدیث میں مصروف رہے اور ان ائمہ فن اور مشائخ کبار سے ملے جن سے بالمشافہ انہوں نے روایت کی ہے"۔ علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ "رحال فی البلاد" یعنی مختلف ملکوں کا سفر کیا، تذکرہ و طبقات کی کتابوں میں ان کے حجاز، عراق، مصر، شام، جزائر اور خراسان جانے اور وہاں کے ائمہ کمال سے استفادہ کرنے کی تصریح ملتی ہے امام صاحب کا خود بیان ہے کہ وہ پندرہ سال کی عمر میں قتیبہ کی خدمت میں حدیث سیکھنے کی غرض سے بغداد گئے اور ایک سال دو ماہ تک وہاں قیام کیا[3]۔

علم حدیث میں امتیاز علم حدیث کی تاریخ میں تیسری صدی ہجری کا زمانہ بڑی اہمیت اور خاص امتیاز رکھتا ہے، اس زمانہ میں ہر گھر میں علم حدیث کا چرچا تھا اور اسلامی ملکوں کا ہر بڑا شہر اس کام کا مرکز تھا اس دور سے زیادہ بڑے محدثین اور کسی دور میں بھی نہیں پیدا ہوئے امام نسائی بھی اسی دور کمال میں

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۲ و تہذیب التہذیب ج ۱ [2] المحط[؟] تہذیب التہذیب ج ۱ و طبقات الشافعیہ ج ۲ [3] تہذیب ج ۱ و طبقات الشافعیہ ج ۲ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ و حسن المحاضرہ ج ۱

پیدا ہوئے تھے اس لئے قدرتی طور پر ان کی توجہ کا مرکز علم حدیث ہی پایا اور اس میں ان کو جو تبحر اور کمال حاصل ہوا وہ ان کے دوسرے معاصرین کے حصہ میں نہیں آیا، امام دارقطنی کا بیان ہے کہ امام نسائی اپنے دور کے تمام علمائے حدیث میں یکتا اور سب سے افضل و برتر تھے۔

حفظ و ثقاہت | قدرت نے امام صاحب کو حفظ کی غیر معمولی قوت عطا کی تھی۔ ابن یونس صاحب تاریخ مصر کا بیان ہے کہ وہ احادیث کے ایک نامور حافظ تھے علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ "میں نے اپنے استاد علامہ ذہبی سے دریافت کیا کہ حافظہ کے لحاظ سے امام مسلم اور امام نسائی میں کون بڑھا ہوا ہے۔ انہوں نے نسائی کا نام لیا میں نے اپنے والد سے اس کو بیان کیا تو انہوں نے بھی اس کی تائید کی سیوطی نے الحافظ، احد الحفاظ المتقنین کے القاب سے ان کا ذکر کیا ہے ان کی ثقاہت واتقان پر بھی اتفاق ہے ابن یونس کہتے ہیں "وہ نہایت ثقہ و ثابت تھے"[1]

جرح و تعدیل | وہ فن جرح و تعدیل کے بھی ماہر تھے ان کا شمار مشہور نقادان حدیث میں ہے اس لحاظ سے بعض محدثین نے ان کو امام بخاری و امام مسلم سے بھی فائق قرار دیا ہے حافظ حدیث ابو علی کا بیان ہے "رجال کے باب میں امام نسائی کے شرائط امام مسلم سے بھی زیادہ سخت تھے" ابن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ "میں نے سعد بن علی زنجانی سے ایک شخص کے متعلق استفسار کیا، تو انہوں نے اس کی توثیق کی، میں نے کہا امام نسائی تو تضعیف کرتے ہیں، یہ سن کر انہوں نے کہا صاحبزادے ابو عبدالرحمن کی رجال کے بارے میں امام بخاری اور امام مسلم سے بھی زیادہ سخت شرطیں ہیں، احادیث کے سقم و صحت میں ان کی بصیرت اور معرفت کے بارے میں دارقطنی اور حاکم کی رائے یہ ہے کہ "وہ اپنے معاصرین میں صحیح و سقیم روایات و آثار اور رجال کی معرفت و تمیز میں سب سے زیادہ واقف کار تھے" ابو بکر حداد کثیر الحدیث ہونے کے باوجود امام نسائی کے علاوہ اور کسی سے روایت نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ میرے اور خدا کے درمیان حجت ہیں [illegible] ابن عدی کا بیان ہے کہ جب ہم طرسوس آئے اور حفاظ حدیث کی خدمت میں حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان سب نے امام نسائی کے انتخاب کے مطابق حدیثیں

---

[1] تہذیب ج ۱، طبقات الشافعیہ ج ۲، البدایہ والنہایہ ج ۱۱، حسن المحاضرہ ج ۱

لکھی ہیں۔

فقہ وتفسیر | امام نسائی کا اصلی فن علم حدیث ہے لیکن دوسرے علوم دینیہ میں بھی ان کو درک تھا قرات اور تفسیر میں ان کو پوری دستگاہ حاصل تھی اور فقہ و فقہی احکام کے استنباط میں بھی ان کا پایا نہایت بلند تھا۔ امام دارقطنی اور حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے کہ "وہ اپنے زمانہ میں مصر کے سب سے بڑے فقیہہ تھے ابن یونس اور دوسرے علماء نے بھی ان کے فقیہہ و مجتہد ہونے کا اعتراف کیا ہے ان کی سنن سے بھی ان کے اس کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

عہدۂ قضاء | فقہ واجتہاد میں ان کے کمال کی بناء پر حمص کے قضاء وولایت کا منصب ان کو تفویض کیا گیا تھا۔

زہد وتقوی اور عبادت | امام نسائی کی عملی زندگی بھی نہایت پاکیزہ تھی ان کا دل خشیت الٰہی سے دہ بریز قلب ذکر الٰہی سے معمور اور دماغ فکر عقبیٰ میں مصروف رہتا تھا وہ بڑے عبادت گذار، متبع سنت اور صاحب ورع وتقویٰ تھے رد بدعات واحیاء سنت ان کا خاص مشن اور نصب العین تھا رات و دن کا بڑا حصہ خدا کی عبادت اور ذکر و فکر میں گذرتا تھا تہجد کے پابند تھے صوم داؤدی کے مطابق ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ حج بھی اکثر کرتے تھے جہاد کا ولولہ بھی تھا ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں نکلے تو اتنی شجاعت وبہادری دکھائی کہ لوگوں کو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوگئی۔[۱]

اخلاقی کمالات | صبر ورضا، ضبط و تحمل، شجاعت وبہادری اور عزم واستقلال وغیرہ اخلاقی فضائل سے بھی آراستہ تھے طبیعت میں بڑا استغنا اور بے نیازی تھی کبھی عزت نفس کا سودا نہیں کیا، امیر مصر کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے لیکن اس کی مجلس اور ہمنشینی سے ہمیشہ دور رہے۔ ایک مرتبہ اہل شام نے ان سے امیر معاویہؓ کے فضائل بیان کرنے کا مطالبہ کیا انہوں نے انکار کردیا۔ ان کے انکار پر ان کو بے دردی

---

[۱] تذکرۃ ج ۲ البدایہ ج ۱۱ و طبقات الشافعیہ ج ۲ بستان المحدثین والمحطہ [۲] تہذیب ج ۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ والبدایہ ج ۱۱

کے ساتھ پیٹا گیا انہوں نے اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا مگر ان کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا احمد بن نصر کا بیان ہے کہ "امام نسائی کی طرح کون صبر کر سکتا ہے؟ حالانکہ ان کے پاس امیر معاویہ کی فضیلت میں ابن لہیعہ کی حدیث موجود تھی لیکن انہوں نے اس کو نہیں بیان کیا کیونکہ وہ ابن لہیعہ کو ضعیف سمجھتے تھے[1]"

امامت و تقدم | ان کمالات کی بنا پر دوسرے اصحاب علم و کمال آپ کو مسلمانوں کا امام و مقتدا مانتے تھے ابن عدی کا بیان ہے کہ میں نے منصور فقیہ اور احمد بن محمد طحاوی کی زبانی سنا کہ "وہ مسلمانوں کے اماموں میں سے ایک ہیں" حافظ ابوالحسین محمد بن مظفر فرماتے ہیں کہ "میرے کانوں نے اپنے مصری اساتذہ کی زبان سے امام نسائی کے فضل و مرتبت اور امامت و تقدم کا اعتراف کرتے ہوئے سنا" محمد بن سعد باوردی فرماتے ہیں کہ "وہ مسلمانوں کے اماموں میں تھے میں نے چار ائمہ حدیث دیکھے ان میں سے ایک مصر کے امام نسائی بھی تھے[2]"

فقہی مذہب | علامہ ابن سبکی نے طبقات شافعیہ میں ان کا ذکر کیا ہے شاہ عبدالعزیز صاحب اور نواب صدیق حسن خان نے بھی ان کو شافعی بتایا ہے لیکن بعض حنابلہ نے ان کو حنبلی قرار دیا ہے ہمارے خیال میں وہ کسی خاص فقہی مسلک کے پابند نہ تھے بلکہ وہ خود فقیہ و مجتہد تھے اور جزئیات مسائل میں محدثین کی طرح ظواہر احادیث کے مطابق عمل کرتے تھے اور جن ائمہ کے مسلک کو کتاب و سنت سے زیادہ قریب پاتے تھے اسی کی تائید فرماتے تھے۔

عقیدہ | امام نسائی اعتقاد میں اہل سنت والجماعت کے ہمنوا تھے لیکن ان پر شیعیت کا الزام لگایا جاتا ہے، عام مورخین اور اصحاب سیر نے اس الزام کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے اس کی شہرت غالباً ابن خلکان کے ایک بیان سے ہوئی ہے، بعض دوسرے مورخین نے ابن خلکان ہی کی روایت کو ماخذ بنایا ہے اس لیے ان کے بیان کا جائزہ لیا جاتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

قال محمد بن اسحاق الاصبہانی — محمد بن اسحاق اصبہانی فرماتے ہیں

[1] تہذیب ج ۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ والبدایہ ج ۱۱ [2] تہذیب ج ۱ تذکرہ ج ۲ والبدایہ ج ۱۱

سمعت مشائخنا بمصر یذکرون ان
ابا عبد الرحمن فارق مصر فی آخر عمره
وخرج الی دمشق فسئل عن معاویة
وما روی فی فضائله فقال اما یرضی
معاویة ان یخرج رأسا برأس حتی
یفضل وفی روایة اخری ما اعرف
له فضیلة الا لا اشبع الله بطنه وکان
یتشیع فما زالوا یدفعون فی حضنه حتی
اخرجوه من المسجد وفی روایة
اخری یدفعون فی خصیه[1].

کہ میں نے مصر میں اپنے استادوں سے
سنا کہ ابو عبدالرحمن نسائی آخر عمر میں مصر
چھوڑ کر دمشق چلے گئے وہاں ان سے حضرت
معاویہؓ اور ان کے فضائل کے متعلق روایات
کے بارہ میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب
دیا کہ کیا معاویہؓ کے لیے یہ کافی نہیں ہے
کہ وہ سر بسر نجات پا جائیں ان کے
فضائل ہی کہاں ہیں جو بیان کیے
جائیں، ایک دوسری روایت میں ہے
کہ انہوں نے جواب دیا کہ میں ان کی کوئی
فضیلت اس کے علاوہ نہیں جانتا کہ
"اللہ ان کو شکم سیر نہ کرے" ان میں شیعیت
تھی لوگوں نے یہ جواب سن کر ان کی کمر
اور کوکھ میں مارنا شروع کیا اور مسجد سے
نکال دیا دوسری روایت میں ہے کہ ان
کے خصیتین میں مارنا شروع کیا تھا۔

اس روایت کی صحت محل نظر ہے متقدمین علماء میں سے کسی نے اس کو قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے اور نہ اس کی سند مسلسل ہے ابن خلکان اور امام نسائی کے درمیان کئی صدیوں کا فرق ہے امام نسائی کا انتقال ۳۰۳ھ میں ہوا ہے اور ابن خلکان کا ۶۸۱ھ یعنی دونوں کے درمیان تقریباً چار صدیوں کا فرق ہے ایسی حالت میں امام نسائی کے بارے میں ابن خلکان کی روایت بغیر کسی سند کے کیسے قبول کی جا سکتی ہے؟ اگر اس کو صحیح بھی

---

[1] وفیات الاعیان ج ۱

مان لیا جائے تو اس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ امام نسائی حضرت امیر معاویہ کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے یا ان کو ان کے فضائل کی روایات کا علم نہ تھا اور حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل کا انکار شیعیت نہیں ہے بہت سے اکابر کا یہ مسلک رہا ہے پھر ابن خلکان نے "کان شیعیا نہیں بلکہ "کان تشیع" لکھا ہے یعنی ان میں شیعیت کا اثر ہے۔

اس روایت کی صحت کی صورت میں واقعہ کی شکل یہ معلوم ہوتی ہے کہ شام بنی امیہ کا مرکز حکومت رہ چکا تھا اور وہ حضرت امیر معاویہؓ کا سب سے سنگین قلعہ تھا یہاں کے تمام قبائل حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کے حامی و مداح تھے۔ اس لئے بنی امیہ کی حکومت مٹنے کے بعد بھی مدتوں یہ اثر قائم رہا اور حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات کی صدائے بازگشت یہاں صدیوں گونجتی رہی امام نسائی کے زمانہ میں بھی یہی صورت حال رہی ہو گی جیسا کہ خود اہل شام کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے اس لئے امام موصوف نے اس کی اصلاح اور حضرت علیؓ سے شامیوں کا سوء ظن دور کرنے کے لئے یہ جواب دیا ہو گا، مگر اہل شام کے دل و دماغ پر حضرت امیر معاویہؓ کا اتنا اثر تھا کہ وہ آمادۂ پیکار ہو گئے اور امام صاحب کی توہین میں بھی باک نہیں کیا اور ان پر شیعیت کا الزام لگا دیا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں۔

"امام نسائی کی موت کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ حضرت علیؓ کے مناقب لکھ کر فارغ ہوئے تو چاہا کہ جامع مسجد دمشق میں لوگوں کے سامنے اس کتاب کو بیان کریں تا کہ وہاں کے لوگ جو بنی امیہ کی مدت مدید تک شام میں سلطنت کے باعث نواصب کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے ہیں ہدایت یافتہ ہو جائیں۔ اس کتاب کا تھوڑا ہی حصہ بیان کیا تھا کہ ایک شخص نے پوچھا کہ امیر المومنین معاویہؓ کے فضائل بھی آپ نے تحریر کیے ہیں امام نسائی نے کہا معاویہؓ کے لئے تو اتنا بس ہے کہ انہیں سر بسر نجات مل جائے ان کے فضائل ہی کہاں ہیں، بعض کہتے ہیں کہ آپ نے یہ بات بھی فرمائی تھی کہ میرے نزدیک ان کے مناقب میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں سوائے الا اشبع اللہ بطنہ کے دیہیں سے عوام الناس نے ان پر تشیع کا الزام جڑ دیا...... اور چند ضربیں ان کے خصیتین پر لگیں جن کی وجہ سے

وہ نیم جان ہو گئے۔[1]

ابن کثیر کا طرز بیان اس سے کسی قدر مختلف ہے اگر ان کا دار و مدار بھی ابن خلکان ہی کی روایت پر ہے لکھتے ہیں۔

وقد قیل عنہ انہ کان ینسب الیہ شیٔ من التشیع[2] — ان کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ ان کی جانب کچھ شیعیت بھی منسوب ہے۔

اس کے بعد انہوں نے وہی ابن خلکان والی روایت نقل کی ہے مگر "قیل" کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ انتساب والزام ابن کثیر کے نزدیک مشکوک اور مشتبہ ہے پھر "کان ینسب الیہ" میں صیغہ مجہول کا استعمال بھی یہی بتاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ راوی کے نزدیک بھی یہ الزام مشتبہ ہے اور "شیٔ من التشیع" سے جس تقلیل کا اظہار ہوتا ہے وہ بھی قابل غور ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر امام نسائی کے شیعہ نہ ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ سے فرط عقیدت کے باوجود دوسرے صحابہؓ کے فضائل و کمالات کے بھی قائل تھے اور مسائل میں ان کے عمل سے استفادہ کرتے تھے، شیعہ سب سے زیادہ شیخین (حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کو مطعون کرتے ہیں مگر امام نسائی ان کے آراء و اقوال سے حجت و استدلال کرتے ہیں، کتاب البیوع میں ابن ابی اوفیٰ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ "ہم رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے زمانے میں گیہوں، جو اور کھجور کی بیع سلم ان لوگوں سے کرتے ہیں جن کے متعلق ہم کو معلوم نہیں کہ یہ چیزیں ان کے پاس ہوتی تھیں یا نہیں"[3] ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں "ابوبکرؓ و عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا ہے[4]"، ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ "اس چیز کا ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمان رضی اللہ عنہم نے فیصلہ کیا ہے[5]" خلفائے راشدین میں اسی ترتیب کے وہ بھی قائل تھے جو اہلسنت والجماعت کا مسلک ہے چنانچہ باب امامۃ اہل العلم والفضل میں یہ روایت نقل کی ہے کہ "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو انصار نے کہا ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم لوگوں (مہاجرین) میں سے حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کیا تم لوگوں کو نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلعم نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ نماز پڑھائیں

---

[1] بستان المحدثین [2] البدایہ ج ۱۱ [3] سنن نسائی ج ۲ [4] ایضاً [5] ایضاً

Marfat.com

ایسی صورت میں کون شخص یہ پسند کرے گا کہ وہ امامت اور خلافت میں ان سے سبقت لے جائے انہوں نے جواب دیا کہ ہم ابوبکرؓ پر اپنے کو ترجیح دینے سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں[1]۔

یہ مثالیں ان کی شیعیت کی تردید کے لئے کافی ہیں البتہ دو باتیں قابل بحث ہیں ایک حضرت علیؓ کی محبت وعقیدت میں غلو دوسرے حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق سخت الفاظ کا استعمال۔ پہلے کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی محبت میں کوئی ایسا غلو ناپسندیدہ نہیں ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہو۔ بلکہ اہل بیت کی محبت تو جزو ایمان ہے امام شافعی اور امام احمد کا بھی یہی مسلک تھا امام احمد کی حضرت علیؓ سے عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے شیخ ابوزہرہ مصری تحریر فرماتے ہیں،

"اس معاملہ میں ان کا وہی مسلک تھا جو ان کے استاد امام شافعی کا تھا امام شافعیؒ حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب میں روایت کرتے تھے اور ان سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ کے مقابلہ میں جب تفضیل کا سوال آتا ہے تو وہ حضرت ابوبکرؓ کو سب پر ترجیح دیتے تھے ان کا قول ہے کہ "معاملہ ہمارے جذبات کا تابع نہیں ہے[2]"۔

امام شافعیؒ کی ہی جانب یہ شعر بھی منسوب ہے،

ان کان رفضا حب آل محمد   فلیشھد الثقلان انی رافض

(ترجمہ) اگر اہل بیت سے محبت کرنا شیعیت ہے تو جن وانس دونوں گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔

حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں امام نسائی کے الفاظ بہت سخت ہیں وہ بہرحال صحابی ہیں اور ان کے فضائل میں بھی روایتیں ہیں اور اگر نہ بھی ہوتیں تو صحابیت کے عموم میں جو روایتیں ہیں ان کے رو سے بھی ان کی فضیلت مسلم ہے لیکن امام نسائی کے قول کی یہ توجیہہ ہو سکتی ہے۔

(۱) حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی فضیلت مسلم ہے ان کو کسی حیثیت سے بھی حضرت علیؓ کے ہم پایہ قرار نہیں دیا جا سکتا یہ جمہور امت کا متفقہ فیصلہ ہے امام نسائی نے شام کے لوگوں کو اس کے برخلاف دیکھا اس لئے جناب امیرؓ کے فضائل ومناقب بیان کرنے میں غلو سے کام لیا ایسے حالات میں قدرتی طور پر

---

[1] سنن نسائی ج ۱ [2] احمد بن حنبل مترجمہ رئیس احمد جعفری

تشدد اور غلو پیدا ہو ہی جاتا ہے اس سلسلہ میں حضرت معاویہؓ کی شان میں ان سے بعض نا ب الفاظ بھی نکل گئے۔

(۲) امام نسائی کو حضرت علیؓ سے غیر معمولی محبت وعقیدت تھی مگر جب وہ شام گئے تو وہاں ان کے خلاف سوانظن کی عام فضا دیکھ کر ان کے فضائل ومناقب بیان کرنا شروع کر دیئے جو بنی امیہ کے حامیوں کو ناگوار معلوم ہوئے اور انہوں نے امام نسائی سے امیر معاویہؓ کے فضائل بیان کرنے کی فرمائش کی، امام صاحب نے یہ سمجھا کہ جناب امیرؓ سے بدگمانی کا اصل سبب حضرت امیر معاویہؓ سے فرط عقیدت اور غیر معمولی شیفتگی ہے اس کو دور کرنے کے لئے انہوں نے ان کی شان میں مذکورہ بالا باتیں کہہ دیں جن سے ان کا منشا امیر معاویہؓ کی مذمت نہ تھا بلکہ حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب کا پوری طرح اظہار اور امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں ان کی اہمیت وعظمت کے اثبات میں تھا"

(۳) حافظ ابن حجر وغیرہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نسائی کے نزدیک حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں اس لئے انہوں نے لوگوں کے مطالبہ پر بھی کوئی حدیث نہیں بیان کی مگر جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو ان کو غصہ آگیا اور ان کی زبان سے بعض سخت الفاظ نکل گئے لیکن غیظ وغضب کی حالت میں جو باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

غذا اور لباس امام نسائی بڑے خوش خوراک وخوش لباس تھے رنگین اور قیمتی کپڑے پہنتے تھے اور کھانا نہایت پرتکلف کھاتے تھے مرغ خرید کر پالتے تھے خوب فربہ ہو جاتے تو ذبح کراتے روزانہ مرغ کھانے کے بعد نبیذ حلال پیتے تھے[1] ان کا رہن سہن نہایت اعلیٰ اور معاشرتی زندگی بڑی پرشکوہ تھی۔

خاندانی وجاہت امام صاحب کی معاشرت اور رکھ رکھاؤ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک معزز اور صاحب حیثیت گھرانے کے چشم وچراغ تھے ابن عماد کا بیان کیا کہ" وہ نہایت نجیب وشریف، رئیس، خوش وضع اور عظیم المرتبت تھے[2]"

وفات امام نسائی کو شامیوں کی مار پیٹ سے اتنا صدمہ پہنچا کہ اسی کے اثر سے ۳۰۳ھ میں اٹھاسی سال

---

[1] تذکرہ ج ۲ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ [2] شذرات الذہب ج ۲

Marfat.com

کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا جب ان کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو انہوں نے اپنے اصحاب و رفقاء سے خواہش ظاہر کی کہ انہیں مکہ لے چلیں بعض مورخین کا بیان ہے کہ راستہ میں مرد کے مقام پر ان کی وفات ہو گئی اور وہیں دفن کئے گئے لیکن بعض نے لکھا ہے کہ وفات مکہ میں ہوئی اور صفا و مروہ کے درمیان دفن کئے گئے۔ علامہ ابن کثیر نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ بیت المقدس میں دفن کئے گئے مہینہ کی تعیین میں اختلاف ہے بعض نے شعبان اور بعض نے صفر کا مہینہ لکھا ہے[۱]

ازواج واولاد ان کی چار بیویاں اور دو لونڈیاں تھیں[۲] حافظ ابن حجر نے ان کے تلامذہ کے تذکرہ میں ایک صاحبزادے عبدالکریم کا نام بھی تحریر کیا ہے

حلیہ بڑے وجیہ و شکیل تھے چہرہ نہایت شاداب اور شمع کی طرح پر نور تھا بڑھاپے میں بھی جسم اور چہرے کی تروتازگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا[۳]

تصنیفات امام نسائی کی جن تصنیفات کا علم ہو سکا وہ حسب ذیل ہیں:

خصائص سیدنا علیؓ۔ اس رسالہ میں حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب بیان کئے گئے ہیں اس کی تالیف کا مقصد امام صاحب نے خود یہ بیان کیا ہے کہ میں جب دمشق آیا تو حضرت علیؓ سے لوگوں کو بیزار پایا اس لئے یہ رسالہ تالیف کیا تاکہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ لوگوں کو ہدایت سے سرفراز کرے[۴] لیکن لوگوں نے بدبختی سے اس کو سخت ناپسند کیا اور امام صاحب کو زدوکوب کر کے مسجد سے نکال دیا۔

نمبر ۲ مسند علی، مسند مالک، الضعفاء والمتروکین، اس میں ضعیف و متروک الحدیث رواۃ کا حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق ذکر کیا گیا ہے۔

یہ رسالہ امام بخاری کی التاریخ الصغیر اور کتاب الضعفاء الصغیر کے ساتھ مطبع انوار احمدی الہ آباد سے ۱۳۲۵ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

کتاب الجمعہ، کتاب التمییز، کتاب المدلسین، فضائل الصحابہ

السنن۔ امام صاحب نے سنن میں دو کتابیں لکھی تھیں سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ، آخر الذکر کتاب

---

[۱] تاریخ ابن خلکان ج ۱ و تذکرۃ ج ۲ البدایہ ج ۱۱ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] بستان المحدثین۔

زیادہ مشہور اور صحاح ستہ میں شامل ہے اور یہ امام ممدوح کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف اور ان کا سب سے بڑا اور اہم علمی و دینی کارنامہ ہے اس لئے اس کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے۔

سنن صغریٰ کے دوسرے نام المجتبیٰ اور المجتنیٰ بھی ہیں کیونکہ امام صاحب جب سنن کبریٰ کی تالیف کا کام انجام دے چکے تو امیر رملہ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کی یہ پوری کتاب صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے آپ نے جواب دیا نہیں، امیر نے درخواست کی کہ آپ میرے لئے اس میں سے اعلیٰ درجہ کی حدیثیں الگ کر دیجئے اس درخواست پر امام صاحب نے یہ دوسری کتاب لکھی جس کا نام مجتبیٰ رکھا اور اب یہی سنن نسائی کے نام سے مشہور ہے[1]۔

سنن کبریٰ کے راوی ابن الاحمر ابو بکر محمد بن معاویہ متوفی ۳۵۸ھ اور سنن صغریٰ کے راوی ابن السنی ابو بکر احمد بن محمد م ۳۶۴ھ ہیں علامہ ذہبی نے مجتبیٰ کو امام صاحب کے شاگرد ابن السنی ہی کا اختصار بتایا ہے لیکن خود امام صاحب نے اس کی تردید کی ہے۔

سنن نسائی کی اہمیت کتب صحاح میں جو مقبولیت صحیحین کو حاصل ہوئی وہ دوسری کتابوں کو نصیب نہیں ہو سکی اور عام طور پر سنن نسائی کو ابو داؤد اور ترمذی کے بعد جگہ دی گئی ہے۔ تاہم اس کا نام بھی ان دونوں کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے اس لئے قریب قریب یہ بھی ان کے ہم پایہ ہے اور اس کا صحاح ستہ میں شامل ہونا ہی اس کی اہمیت و عظمت کا ثبوت ہے اور جس طرح صحاح کی ہر کتاب بعض خصوصیات کے لحاظ سے دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے اسی طرح نسائی کی بھی بعض خصوصیات سے دوسری کتابیں خالی ہیں۔

بعض علمائے فن نے صحیحین کے بعد اسی کا درجہ بتایا ہے کیونکہ اس میں سب سے کم ضعیف روایتیں ہیں اور اس کے رجال زیادہ قوی ہیں قبول روایت کے معاملہ میں امام نسائی کے شرائط کی سختی اس قدر مشہور ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ ان کے شرائط امام بخاری و امام مسلم سے بھی زیادہ شدید ہیں[2] شیخ ابو الحسن معافری کا بیان ہے کہ "اگر عام محدثین اور امام نسائی کی احادیث کا موازنہ کیا جائے تو امام نسائی کی حدیثیں

---

[1] بستان المحدثین [2] تذکرہ ج ۲ و شروط الائمۃ الستہ

دوسروں کی مرویات کے مقابلہ میں صحت سے زیادہ قریب نظر آئیں گی"۔ علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ بعض مغاربہ کے نزدیک اس کو صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے ابن احمر کا بیان ہے کہ "اس فن کی جملہ تصنیفات میں سنن نسائی سب سے زیادہ افضل واشرف ہے اور اسلام میں ایسی بے نظیر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی"۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ "فنِ رجال کے ماہرین کی ایک جماعت نے ان کو امام مسلم سے برتر قرار دیا ہے اور امام دارقطنی وغیرہ نے ان کو فنِ حدیث اور فن رجال میں امام الائمہ ابوبکر بن خزیمہ پر ترجیح دی ہے"۔ ان اقوال کو اگر مبالغہ پر بھی محمول کیا جائے تو ان سے کم از کم اتنا ثابت ہوتا ہے کہ امام نسائی نے ضعیف و متروک اشخاص سے کوئی روایت نہیں لی ہے بلکہ امام بخاری اور امام مسلم کی طرح صرف صحیح الاسناد حدیثیں درج کی ہیں اور اس اعتبار سے ان کی تصنیف ان دونوں بزرگوں کے طریقوں کی جامع ہے ابو عبداللہ بن رشید فرماتے ہیں کہ:

وھو جامع بین طریقتی البخاری	سنن نسائی بخاری و مسلم دونوں کے طریقوں کی
ومسلم مع حظ کثیر من بیان	کی جامع ہے اور علل حدیث کا بیان اس پر
العلل[۱]	مستزاد ہے۔

خود امام نسائی سے منقول ہے کہ "کتاب السنن کلہ صحیح" یعنی میری کتاب السنن تمام تر صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے امام صاحب نے اس کی تالیف میں جو اہتمام و احتیاط کی ہے اس کا اندازہ ابوالحسن احمد بن محبوب رملی کے اس بیان سے ظاہر ہے وہ فرماتے ہیں کہ "میں نے خود امام صاحب سے سنا کہ وہ فرماتے ہیں جب میں نے سنن کی جمع و تالیف کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے سے بعض ایسے رواۃ کے متعلق استخارہ کیا جن کے بارہ میں مجھ کو تھوڑا تردد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ ان لوگوں سے میں روایت نہ کروں۔ اس طرح میں نے اعلیٰ سندوں کی حدیثیں ذکر کی ہیں[۲]"۔

خصوصیات سنن نسائی کی سب سے اہم خصوصیت اس کی شرائط ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ "ان لابی عبدالرحمٰن شرطاً اشد من شرط البخاری ومسلم" یعنی امام نسائی کے شرائط امام بخاری و

---

[۱] مقدمہ زہر الربی فتح المغیث [۲] مقدمہ زہر الربی [۳] مقدمہ فتح الباری وشروط الائمۃ الستۃ

مسلم سے بھی سخت ہیں۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے نہ صرف بعض ان رواۃ کو نظرانداز کر دیا ہے جن سے امام ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے بلکہ امام بخاری و مسلم تک کے راویوں کی ایک جماعت سے حدیث کی تخریج میں اجتناب کیا ہے۔

(۲) علل حدیث کا بیان امام نسائی کا خاص وصف سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جرح و تعدیل اور نقد و نظر کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا اور روایت کا سقم فوراً ان کی نگاہ کے سامنے آجاتا تھا۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں "امام نسائی حدیث، علل حدیث اور علم الرجال میں امام مسلم، ترمذی اور ابو داؤد سے زیادہ ماہر ہیں اور امام بخاری اور ابو زرعہ کے ہمسر ہیں ابن رشید کا یہ بیان گذر چکا ہے کہ سنن نسائی بخاری و مسلم دونوں کے طریقوں کی جامع ہے، علاوہ ازیں اس میں علل حدیث کے بھی ایک خاص حصے کا ذکر ہے۔[۱] رواۃ کے اسماء و القاب و کنیتوں کی تشریح، راوی کے شذوذ و تفرد، حذف و اضافہ، عدم مطابقت، شک سہو اور غلطی وغیرہ کا ذکر، دو راویوں کے اختلاف و تضاد، عدم سماع و عدم لقاء راویوں کی توثیق و تضعیف، موقوف و مرسل، مسند و مرفوع، صحیح و ضعیف روایات کی نشاندہی، اسناد کی قوت و ضعف، اختلاف و تعدد طرق کا بیان، غریب الفاظ اور مشکل و مبہم چیزوں کی توضیح جس قدر اس کتاب میں پائی جاتی ہے اس سے دوسری کتابیں خالی ہیں۔ امام صاحب نے راویوں اور روایات کا موازنہ کر کے صحیح روایات کی بھی نشاندہی کی ہے۔

(۳) متعدد فوائد کے پیش نظر ایک ہی روایت کو کئی جگہوں میں ذکر کیا ہے۔

(۴) وہ بلند پایہ مجتہد و فقیہ بھی تھے اور ان کی سنن فقہ و اجتہاد اور نظر و استدلال کی حیثیت سے بھی نہایت جامع ہے اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے خمس کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْئٍ	جان لو کہ جو غنیمت کا مال تم کو ملا ہے اس کا پانچواں
فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَ لِلرَّسُوْلِ	حصہ اللہ، رسولؐ، قرابتداروں یتیموں مسکینوں

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و مقدمہ زہر الربی

وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ[1] اور مسافروں کے لئے ہے۔ (توبہ)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ابتدائے کلام کے لئے آیا ہے کیونکہ ساری چیزیں تو اللہ ہی کی ہیں یا خدا نے فئ اور خمس میں اپنی ذات کو اس لئے شریک کیا ہے کہ درحقیقت یہ دونوں بہترین قسم کی کمائی ہیں اور صدقہ کو اپنی طرف اس لئے منسوب نہیں کیا کہ وہ اموال کی ناپاکی اور گندگی کا نام ہے ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ غنیمت کا کچھ حصہ خانہ کعبہ پر خرچ کیا جائے گا اور اسی حصہ کو اللہ نے اپنا بتایا ہے نبیؐ کا حصہ امام وقت کی جانب منتقل کیا جائے گا اور وہ اس سے اسلحہ اور جنگی سامان خریدے گا۔ اس میں سے وہ ان لوگوں کو بھی دے سکتا ہے جن کو مناسب سمجھے مثلاً مسلمانوں کی فائدہ رسانی کے کاموں یا علم دین، فقہ و حدیث اور قرآن وغیرہ کی تحصیل میں صرف کرے گا اور ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں یعنی بنو ہاشم اور بنو مطلب میں تقسیم کیا جائے گا خواہ وہ امیر ہوں یا فقیر۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپؐ کے قرابت داروں میں صرف فقرا یعنی یتیموں اور مسافروں وغیرہ ہی کو دیا جائے گا اور یہی قول میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے واللہ اعلم۔ بڑے چھوٹے اور مرد و عورت کے درمیان برابر تقسیم کیا جائے گا کیونکہ حدیث میں اس کی کوئی تشریح نہیں ملتی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو کسی سے زیادہ دیا ہو اور اس بارے میں مجھ کو علماء کے کسی اختلاف کا بھی علم نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی شخص کسی کی اولاد کے حق میں اپنے تہائی مال کی وصیت کردے تو ان میں مرد و عورت سب کو برابر حصہ ملے گا، اسی اصول پر ان تمام چیزوں کو قیاس کرنا چاہئے جو کسی کے قرابت داروں اور خاندان والوں کے لئے متعین کر دی گئی ہو۔ الا یہ کہ شارعؑ نے اس سلسلہ میں کوئی واضح اور صریح حکم دے دیا ہو یا تفصیل کر دی ہو۔ اسی طرح مسلمانوں کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو ایک ایک حصہ دیا جائے گا اور یتیم و مسافر کا حصہ کسی دوسرے کو نہیں دیا جا سکتا باقی خمس کے چار اور حصوں کو امام المسلمین ان بالغ مسلمانوں میں تقسیم کرے گا جو جنگ میں شریک رہے ہوں۔

امام نسائی نے بعض ابواب کے عنوانات اس طرح قائم کئے ہیں جن سے ان کا تفقہ و استدلال ظاہر ہوتا ہے اور بعض عنوانات سے وہ اپنے مخالف مسلک کی تردید بھی کرتے ہیں ان کے فقہ و اجتہاد

---

[1] سنن نسائی کتاب قسم الفئ

کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی حدیث کو متعدد ابواب میں نقل کر کے اس سے مختلف مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔

(۵) ترتیب و تالیف میں حسن و موزونیت کے لحاظ سے بھی سنن کا پایہ بلند ہے۔ ابن رشید کا بیان ہے کہ "یہ تمام کتب سنن میں تصنیف و ترتیب کے لحاظ سے زیادہ بہتر اور عمدہ ہے"[1]

شروح و تعلیقات سنن نسائی کے ساتھ اس قدر اعتنا نہیں کیا گیا جس کی وہ مستحق تھی اس لئے دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کے شروح حواشی اور تعلیقات کی تعداد کم ہے[2]۔ ذیل میں ان کے نام درج کئے جاتے ہیں:

شرح ابن ملقن۔ مشہور مصنف و شارح حدیث علامہ ابن ملقن (م ۸۰۴ھ) نے زوائد النسائی علی الاربعہ کے نام سے سنن نسائی کی شرح لکھی اور اس میں ان حدیثوں سے تعرض کیا جو بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد میں نہیں ہیں۔

زہر الربی۔ یہ علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی تعلیق اور شرح ہے جو نہایت مشہور و معروف ہے اس میں متن کے مشکل مسائل اور دشوار مقامات کو نہایت خوبی سے حل کیا گیا ہے ۱۳۱۲ھ میں مصر کے مطبع میمنہ سے سنن اور حاشیہ سندھی کے ساتھ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور غالباً الگ سے بھی چھپی ہے۔

حاشیہ سندی۔ محمد بن عبد الہادی سندھی (م ۱۱۳۸ھ) نے جملہ کتب صحاح کی طرح امام نسائی کی سنن کا بھی حاشیہ اور تعلیق تحریر کی جو بہت مقبول و متداول ہے، یہ حاشیہ سیوطی کی شرح سے زیادہ جامع اور مفصل ہے اس میں متن کے ضروری اور اہم مقامات کو حل، اعراب کی تحقیق اور غریب الفاظ و مشکل لغات کی تشریح کی گئی ہے یہ حاشیہ سنن اور اس کی شرح زہر الربی کے ساتھ ۱۳۱۲ھ میں مطبع میمنہ مصر میں شائع ہوا ہے۔

حافظ ابن کثیر کی تنقید حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ "نسائی کے بعض رجال مجہول اور مجروح ہیں ان کے یہاں ضعیف، معلل اور منکر حدیثیں بھی ہیں"[3] لیکن امام نسائی کی حزم و احتیاط کے بارے میں جو قول پہلے

---

[1] مقدمہ زہر الربی [2] کشف الظنون ج ۲ [3] اختصار علوم الحدیث والمط بحوالہ شرح الفیہ بقاعی

Marfat.com

نقل کئے گئے ہیں، وہ ابن کثیر کی تردید کے لئے کافی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ رجال واحادیث کی تمیز میں امام نسائی کو خاص کمال حاصل تھا ان کی سختی اور شدت کا یہ حال تھا کہ امام بخاری، امام مسلم، امام مالک اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے اکابر محدثین وائمۂ فن کے بعض رواۃ سے نقل درروایت میں بھی انہوں نے احتیاط ملحوظ رکھی ہے ان کا خود بیان ہے کہ سنن کی جمع وتالیف کے سلسلہ میں جن مشائخ کے بارہ میں میرے دل میں کچھ شک وتردد ہوا میں نے ان کو ترک کر دیا، عام محدثین کے نزدیک وہ اپنے عدم تساہل اور فرط احتیاط کے لئے نہایت مشہور مانے جاتے ہیں اس کے باوجود ان کے یہاں ضعیف ومنکر روایات کا سرے سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا جبکہ کہ اہم ترین کتابوں کے بارے میں بھی مطلق اور مجرد صحت کو بعض علماء نے تسلیم نہیں کیا ہے ایسی صورت میں ابن کثیر کا الزام اور بھی بے حقیقت ہو جاتا ہے صحاح کے دوسرے مصنفین کے مقابلہ میں امام نسائی نے التزام صحت اور رجال کے متعلق زیادہ شدت اور احتیاط برتی ہے اور مجموعی حیثیت سے صحیحین کے بعد یہی زیادہ معتبر اور مستند کتاب مانی جاتی ہے علامہ سیوطی اور شارح سندھی دونوں کا بیان ہے کہ فی الجملہ نسائی کی کتاب السنن میں صحیحین کے بعد سب سے کم ضعیف روایتیں ہیں اور اس کے رجال بھی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ مجروح نہیں ہیں۔

نواب صدیق حسن خان صاحب اس اعتراض کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"میرے خیال میں ان کا مقصود سنن کبریٰ سے ہے کیونکہ سنن صغریٰ میں تو امام نسائی نے صحیح ترین حدیثیں منتخب اور جمع کی ہیں اور ان روایتوں کو ترک کیا ہے جن کی سندوں میں کلام کیا گیا ہے چونکہ ابن کثیر سے امام نسائی اور ان کی سنن کی توثیق کے متعلق بھی اقوال منقول ہیں اس لئے اس توجیہ کے بعد ان کی دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں رہ جاتا، حقیقت یہ ہے کہ صحاح ستہ میں صحیحین کے بعد صحت میں سب سے اہم اور مقدم امام نسائی کی سنن ہے[1]۔"

---

[1] اتحاف النبلاء۔

امام ابو یعلیٰ موصلیؒ

متوفی ۳۰۷ھ

نام و نسب احمد نام ابو یعلیٰ کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن علی بن مثنیٰ بن یحییٰ بن عیسیٰ، بن ہلال۔

ولادت، خاندان و وطن مشہور روایت کے مطابق وہ ۲۰۷ھ میں اپنے وطن موصل میں پیدا ہوئے۔ حافظ ذہبی نے شوال ۲۱۰ھ کی روایت کی ہے، ان کا خاندانی تعلق قبیلہ بنی تمیم سے تھا۔ اس لئے تمیمی کہلاتے ہیں۔ ان کا وطن موصل، دجلہ و فرات کا درمیانی علاقہ جزیرہ تھا[1]۔

اساتذہ امام ابو یعلیٰ کے چند اساتذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن حاتم طویل، احمد بن حنبل، شیبان بن فروخ، علی بن جعد، غسان بن لیث، محمد بن منہال مزیر، یحییٰ حمانی اور یحییٰ بن معین وغیرہ۔

تلامذہ ان کے بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابن حبان، ابو بکر اسماعیلی، ابو بکر بن مقری، ابو حاتم، ابو علی نیشاپوری، ابو عمرو بن حمدان حمزہ بن محمد کتانی، محمد بن نصر نحاس اور نصر بن احمد مرجی۔

طلب علم کے لئے سفر پندرہ سال کی عمر میں انہوں نے طلب حدیث کے لئے سفر

[1] کتاب الانساب و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و معجم البلدان ج ۸

Marfat.com

کیا اور قیاس ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق مختلف مراکز حدیث کے ارباب کمال سے استفادہ کیا ہوگا۔

حفظ وثقاہت | حافظ ابویعلیٰ مشہور حفاظ حدیث اور نامور محدثین اسلام میں شمار کئے جاتے ہیں، اپنے غیر معمولی حافظہ کی بنا پر الحافظ اور الحافظ المشہور کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے، ان کی عدالت وثقاہت میں بھی کوئی کلام نہیں کیا گیا ہے۔ حافظ ذہبی اور ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں "وہ ثقہ و متقن تھے"۔ ابن حبان نے ان کو ائمہ ثقات میں ذکر کیا ہے۔ حاکم کا بیان ہے کہ "وہ ثقہ و مامون تھے"۔ ابوعلی ان کے اتقان اور حفظ حدیث کے بڑے مداح و معترف تھے اور فرماتے تھے کہ "ان سے بہت کم حدیثیں مخفی تھیں"۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں "وہ اپنے مرویات میں ثقہ و عادل اور احادیث میں حافظ وضابط تھے"۔[1]

زہد واتقاء | امام ابویعلیٰ تدین وتقویٰ میں عالی مرتبہ اور فضائل اخلاق سے آراستہ تھے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ صدق، دیانت، امانت، حلم، تقویٰ اور دوسرے تمام عمدہ اوصاف وکمالات کے جامع تھے۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ تدین واتقان سے متصف تھے۔ حافظ ابن کثیر نے ان کو صاحب خیر اور صاحب شذرات نے صاحب صلاح بتایا ہے۔[2]

اخلاص | وہ ریا ونمود کو برا سمجھتے تھے، ہر کام خالصۃً لوجہ اللہ کرتے تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ وہ تصنیف وتالیف، تعلیم حدیث اور تحصیل علوم میں محض حسبۃً للہ اور اخلاص کی بنا پر مشغول ہوئے تھے، ایک مرتبہ ابوعمیر حیری نے ان کو حسن بن سفیان پر ترجیح دی۔ ایک شخص نے کہا یہ غلط ہے حسن کی مسند ضخیم اور ان کے شیوخ اعلیٰ ہیں حیری نے جواب دیا کہ ابویعلیٰ حسبۃً للہ حدیث بیان کرتے تھے اور حسن کا یہ پیشہ تھا۔[3]

شہرت ومقبولیت | امام ابویعلیٰ کو اپنے حسن نیت اور اخلاص کی برکت کی وجہ

---

[1] العبر ج ۲، شذرات الذہب ج ۲ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔ والبدایہ والنہایہ جلد ۱۱ [2] ایضاً
[3] بستان المحدثین، تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔

سے بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، ان کی ذات عوام و خواص کی عقیدت کا مرکز بن گئی۔ ان کے انتقال کے دن موصل کے بازار بند ہو گئے تھے اور لوگوں کا جمِ غفیران کے جنازہ میں شریک تھا۔

وفات تقریباً سو سال کی عمر میں ۳۰۷ھ میں اپنے وطن موصل میں انتقال کیا۔[۱]

تصنیفات امام ابویعلیٰ صاحبِ تصنیف تھے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ عمدہ اور بہتر تصنیفات کے مالک تھے، لیکن ان کی تین ہی کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں:

معجم، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں انہوں نے ترتیب شیوخ پر ایک کتاب لکھی تھی۔[۲]

مسندِ کبیر و صغیر} حافظ ابو یعلیٰ نے دو مسندیں لکھی تھیں، ایک کبیر، دوسری صغیر، مشہور مسند صغیر ہے جو چھتیس اجزاء پر مشتمل ہے۔ اس کو ترتیب ابواب کے لحاظ سے جامع بھی کہا جا سکتا ہے۔[۳] یہ حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں سمجھی جاتی ہے اس میں ثلاثی حدیثیں بھی ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں شامل کیا ہے۔ حافظ اسماعیل تمیمی فرماتے ہیں کہ میں نے کئی مسانید، مسند عدنی اور مسند ابن منیع وغیرہ پڑھیں، ان کی حیثیت نہروں کی ہے اور مسند ابی یعلیٰ بحرِ زخار کی طرح تمام نہروں کا سنگم ہے۔[۴]

اس کی اہمیت کی وجہ سے علمائے فن نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے جامع المسانید والسنن میں اور محمد بن سلیمان (م ۱۰۹۴ھ) نے جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد میں اس کی حدیثیں درج کی ہیں۔ نورالدین ہیثمی نے اس کے زوائد مرتب کئے اور حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرہ میں شہاب الدین بوصیری نے اطراف المسانید العشرہ میں اس کے مرویات نقل کئے ہیں۔[۵]

---

[۱] بستان المحدثین [۲] ایضاً [۳] ایضاً والرسالۃ المستطرفہ [۴] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔
[۵] مقدمہ تحفۃ الاحوذی والرسالۃ المستطرفہ۔

Marfat.com

مسند ابی یعلی کے قلمی نسخے حیدر آباد کے دائرۃ المعارف العثمانیہ اور کتب خانہ آصفیہ کے علاوہ مکتبہ سندیہ اور جرمنی کے کتب خانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔[۱]

---

[۱] تذکرۃ النوادر و فہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱۔

امام ابن خزیمہؒ

متوفی ۳۱۱ھ

نام و نسب محمد نام، ابوبکر کنیت، شیخ الاسلام لقب اور نسب نامہ یہ ہے محمد بن اسحاق
بن خزیمہ بن مغیرہ بن صالح بن بکر۔

ولادت، خاندان و وطن ماہ صفر ۲۲۳ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ مجشر بن مز
سے ولار کا تعلق تھا۔[1]

اساتذہ شیوخ و اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابو قدامہ سرخسی، ابوکریب، احمد بن منیع، اسحاق بن موسیٰ خطمی، بشر بن معاذ عقدی، عبد
بن علار، عتبہ بن عبداللہ محمدی، علی بن حجر، علی بن خشرم، محمد بن ابان مستملی، محمد بن اسلم زاہد، محمد بن
محمد بن مہران، محمود بن غیلان، نصر بن علی جہضمی، یونس بن عبدالاعلی۔

اسحاق بن راہویہ اور محمد بن حمید رازی سے بھی ان کو ملاقات اور سماع کا شرف حاصل
مگر اس وقت کم سن تھے، اس لئے احتیاط کی بنا پر ان بزرگوں سے حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے۔

تلامذہ جن لوگوں سے ان کی روایات کا زیادہ حصہ منقول ہے ان کے نام یہ ہیں:

ابوبکر احمد بن مہران مقری، ابوحامد احمد بن محمد بن بالویہ، ابوعلی نیشاپوری، ابوعمرو بن
اسحاق بن سعید نسوی، محمد بن بصیر اور پوتے محمد بن فضل۔

---

[1] المنتظم ابن جوزی ج ۶ ص تذکرۃ الحفاظ ج ۲ و طبقات الشافعیہ ج ۲۔

ان کے تلامذہ میں ابراہیم بن ابی طالب اور ابوعمرو احمد بن مبارک مستملی بھی تھے جو عمر میں ان سے بڑے تھے[1]

رحلت وسفر علم وفن کی تحصیل اور حدیث وفقہ کی تکمیل کے لئے انہوں نے مختلف مقامات کے سفر کئے: بچپن میں اپنے وطن کے علماء ومشائخ سے استفادہ کیا۔اس کے بعد رے، بغداد، بصرہ، کوفہ، شام، حجاز، عراق، مصر اور واسط وغیرہ تشریف لے گئے[2]

حفظ وثقاہت علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ حدیثوں کے اسنادومتون کا ان سے بہتر کوئی حافظ میں نے نہیں دیکھا، ابواحمد دارمی نے خود ابن خزیمہ سے ان کے حافظہ کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "میں جس چیز کو تحریر کرتا ہوں وہ مجھے زبانی یاد ہوجاتی ہے" ابوعلی نیشاپوری فرماتے ہیں کہ جس طرح قرار کو قرآن کی سورتیں زبانی یاد ہوتی ہیں، اسی طرح ابن خزیمہ کو فقہیات حدیث زبانی یاد ہیں۔ امام دارقطنی وغیرہ نے ان کو ثقہ وثابت بھی قرار دیا ہے ابن حبان فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر احادیث وسنن کے صحیح الفاظ اور زیادات کی یادداشت رکھنے والا ان کے مانند کوئی اور شخص نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنن واحادیث کا تمام ذخیرہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے[3]

حدیث میں درجہ ومرتبہ ابن خزیمہ کا شمار اکابر محدثین اور نامور ائمہ فن میں ہوتا ہے۔ احادیث پر ان کی نظر نہایت وسیع اور گہری تھی، وہ کم سنی ہی میں امام اور حافظ حدیث کی حیثیت سے مشہور ہوگئے تھے۔ ایک دفعہ امام شافعیؒ کے نامور شاگرد اور فقہ شافعی کے جامع ومدون امام مزنی سے ایک عراقی شخص نے دریافت کیا کہ جب قرآن مجید نے قتل کی صرف دو ہی صورتیں بیان کی ہیں۔ عمد وخطا، تو آپ لوگ تیسری قسم شبہ عمد کو کس طرح مانتے ہیں۔ انہوں نے جواب میں ایک حدیث پیش کی۔ اس نے کہا کہ آپ علی بن زید بن جدعان

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ وطبقات الشافعیہ ج ۲ [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ وطبقات الشافعیہ ج ۲۔

[3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ وطبقات الشافعیہ ج ۲۔

کی روایت سے استدلال کرتے ہیں یہ سُن کر مزنی خاموش ہو گئے اور ابن خزیمہ نے جواب دیا کہ شبہ عمد کی روایتیں دوسرے طرق سے بھی مروی ہیں۔ عراقی نے کہا اور کس کے واسطے مروی ہیں؟ امام ابن خزیمہ نے فرمایا ایوب سختیانی اور خالد حذاء سے، اس نے ایک راوی عقبہ بن اوس کے متعلق شک و تردد کا اظہار کیا، تو آپ نے فرمایا کہ وہ ایک بصری شیخ ہیں اور ابن سیرین جیسے جلیل القدر بزرگ نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ معترض نے امام مزنی سے عرض کی کہ آپ مناظرہ کر رہے ہیں یا یہ؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ احادیث کے بارہ میں مجھ سے زیادہ واقف کار ہیں، اس لئے جب حدیثوں پر گفتگو ہوتی ہے تو میں خاموش رہتا ہوں اور یہ بحث و مناظرہ میں حصہ لیتے ہیں[1]۔

امام ابن خزیمہ مسائل و فتاویٰ کا جواب بھی احادیث کی روشنی میں دیتے تھے، امیر اسماعیل بن احمد نے ایک مرتبہ فئ و غنیمت کا فرق دریافت کیا تو انہوں نے سورۂ انفال کی آیت وَاعلموا انما غنمتم من شيءٍ فان لله خمسه الخ پڑھنے کے بعد چند حدیثیں بیان کیں پھر سورۂ حشر کی آیت ما افاء الله على رسوله الخ پڑھ کر احادیث سے مسئلہ کی وضاحت کی، ابوزکریا یحییٰ بن محمد کا بیان ہے کہ اس موقع پر انہوں نے تقریباً ایک سو ستر حدیثیں بیان کی ہوں گی[2]۔

احادیث سے استنباط مسائل میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا، ابن سریج کا بیان ہے کہ وہ بڑی چھان بین اور محنت سے احادیث کے نکات و مطالب کا استخراج کرتے تھے[3]۔

حدیث کی نقل و روایت میں ان کے فضل و امتیاز کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ ابن جوزی نے لکھا ہے وکان مبرزا فی علم الحدیث، یعنی وہ علم حدیث میں بہت ممتاز اور نہایت فاضل تھے[4]۔

انہوں نے سنن کی اشاعت و احیا کا مقدس فرض بھی انجام دیا۔ ایک مرتبہ ان کے ایک

---

[1] طبقات الفقہا لابی اسحاق شیرازی [2] طبقات الشافعیہ سبکی ج ۲ [3] ایضاً و طبقات الفقہا شیرازی [4] المنتظم ج ۶

پڑوسی نے خواب دیکھا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شبیہہ مبارک کو صیقل کر رہے ہیں۔ معبرین نے بتایا کہ ابن خزیمہ احیاء سنت اور اشاعت حدیث کا کام انجام دیں گے[1]۔

فقہ و اجتہاد فقہ و اجتہاد میں بھی ان کا درجہ نہایت بلند تھا۔ بوبطی اور مزنی جیسے اساتذۂ وقت سے اس کی تحصیل کی تھی لیکن فقہ کے عام مذاہب میں سے وہ کسی خاص مذہب سے وابستہ نہیں تھے بلکہ ان کا شمار مجتہدین مطلق میں ہوتا ہے۔ علامہ ابن سبکی نے ان کو المجتہد المطلق اور علامہ ابن کثیر نے دھومن المجتھدین فی دین الاسلام لکھا ہے۔ ان کا خود بیان ہے کہ سولہ سال کی عمر کے بعد سے میں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔

ابوزکریا یحییٰ بن محمد عنبری فرماتے ہیں کہ میں نے ابن خزیمہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح فرمان کی موجودگی میں کسی شخص کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا[2]۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ خود صاحب مذہب اور مستقل امام فقہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے فتاوے بھی ایک زمانہ میں بعض اسلامی ملکوں میں رائج تھے، ان کے بعض فقہی مسائل کتابوں میں ملتے ہیں مثلاً

وہ رفع یدین کو نماز کا اہم اور ضروری رکن سمجھتے تھے، صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے اعادہ لازمی سمجھتے تھے۔

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں کہ محمد بن اسحاق امام الائمہ کے لقب سے موسوم کئے جاتے تھے، ان کے متبعین ان کے مذہب کی پیروی کرتے تھے، وہ مقلد کے بجائے خود امام مستقل اور صاحب مذہب تھے۔ بیہقی نے یحییٰ بن محمد عنبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اصحاب حدیث کے پانچ طبقے ہیں (۱) مالکیہ (۲) شافعیہ (۳) حنبلیہ (۴) راہویہ اور (۵) خزیمیہ[2]۔

کلام و عقائد کے بعض مسائل بدعات کو سخت ناپسند کرتے تھے اور عام محدثین کی طرح کلام و عقائد کے غیر ضروری مسائل میں بحث و تدقیق احتیاط و تقویٰ کے منافی خیال کرتے تھے۔ اپنے تلامذہ اور متبعین کو سخت تاکید کر دی تھی کہ اس قسم کے مسائل میں پڑنے سے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲، و طبقات الشافعیہ ج ۲ [2] ایضاً والبدایہ ج ۱۱ و طبقات الفقہاء شیرازی [3] اعلام الموقعین۔

پرہیز کریں۔ بعض تلامذہ کے متعلق جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ ایسے مباحث ان کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں تو سخت برہمی ظاہر کی اور اعلان کر دیا کہ یہ لوگ میرے حوالے سے جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ غلط ہے۔

عقائد و کلام کے متعلق انہوں نے جو کتابیں لکھی تھیں ان میں اہلِ سنت والجماعت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے، بعض مسائل میں عام اہل سنت سے بھی زیادہ متشدد تھے۔ چند مسائل کے متعلق ان کے آرا، وخیالات طبقات وتراجم کی کتابوں سے نقل کئے جاتے ہیں۔

قرآن مجید خدا کا کلام ہے اس کی وحی وتنزیل اور خود غیر مخلوق ہے وہ خدا کی صفات میں ایک ذاتی صفت اور مستقل بالذات ہے اس کو مخلوق، محدث اور فعلی صفت سمجھنے والے جہمی، بدعتی اور گمراہ ہیں۔ بعض جاہل کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مکرر کلام نہیں کرتا، یہ لوگ کلام الٰہی سے ناآشنا اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اللہ نے کئی مقامات پر تخلیق آدم کا ذکر کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا قصہ مکرر بیان کیا ہے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ بار بار کہا گیا ہے۔ یہ کسی مسلمان کا عقیدہ نہیں ہو سکتا اور جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ ازل میں کلام کرنے کے بعد اللہ پھر کلام نہیں کرتا وہ جہمی ہے۔ اللہ عرش پر بلا کیف مستوی ومتمکن ہے۔

ان مسائل میں وہ اتنے متشدد تھے کہ جہمیہ وغیرہ کو کافر بھی کہہ دیتے تھے، فرماتے ہیں: اللہ ازل سے متکلم ہے جو شخص یہ گمان کرے کہ اللہ ایک ہی بار کلام کرتا ہے وہ کافر ہے۔ اسی طرح جو اس کا اقرار نہ کرے کہ اللہ عرش پر ساتویں آسمان کے اوپر متمکن ہے وہ کافر ہے، اس کا خون مباح اور مال حلال ہے۔ قرآن کو کلام الٰہی کے بجائے مخلوق سمجھنے والا کافر ہے، اس سے توبہ کرائی جائے گی اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے گا اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔ جہمیہ اور کلامیہ ملعون اور اپنے عقائد وخیالات میں جھوٹے ہیں[1]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔

Marfat.com

فضل وکمال کا اعتراف ان کے معاصرین علماء اور ارباب کمال ان کے علم وکمال کے معترف تھے۔ امام دار قطنی نے ان کو عدیم النظیر اور علامہ ذہبی نے فرید العصر اور حافظ ابن کثیر نے بحر من بحور العلم لکھا ہے۔ ابوعلی نیشاپوری فرماتے ہیں کہ "میں نے ان سے زیادہ صاحبِ کمالات آدمی نہیں دیکھا" ان کے استاذ ربیع بن سلیمان کا بیان ہے کہ "ابن خزیمہ نے ہم سے جتنا استفادہ کیا، ہم نے اس سے زیادہ ان سے استفادہ کیا" علامہ ابن سبکی ان کی جامعیت وفضیلت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وہ مختلف علوم کے جامع اور مرتبہ کمال پر فائز تھے۔ نیشاپور میں جو علم وفن کا گہوارہ اور فضلاء وارباب کمال کا مرکز تھا، یکتائے روزگار تھے، ان کی علمی شان سب سے بالا وبرتر تھی۔ ان کے گرد طلبہ ومستفیدین کا ہجوم رہتا تھا، ان کے فتاوے تمام روئے زمین میں نقل ہوتے تھے، عقل وفطانت میں بے مثال تھے، بحث ومناظرہ میں انہیں زیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ درحقیقت علم وفضل کا ایسا بحر زخار تھے جس سے تشنگان علوم سیراب ہوتے تھے۔ ان کی اس علمی ضیاباری سے ایک عالم کو بصیرت حاصل ہوتی تھی۔ علماء واساطینِ فن بھی ان کی جانب رجوع کرتے تھے۔ ان کے فیض کا یہ حال تھا۔

کالبحر یقذف للقریب جواھرا کرما ویبعث للغریب سحائبا[1]

"یعنی ابن خزیمہ سمندر کی طرح اپنے قریب کے لوگوں کو موتی اور جواہرات سے مالا مال کرتے ہیں اور دور والوں کے لئے بارانِ رحمت کی طرح سامانِ فیض کرتے ہیں"۔

اتباع سنت اتباع سنت میں بڑا اہتمام تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی وہ سنت کا لحاظ رکھتے تھے، ایک مرتبہ ان سے حمام میں بال منڈانے کے لئے کہا گیا تو فرمایا کہ میرے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حمام میں داخل ہو کر بال منڈانا ثابت نہیں ہے۔ ابوبکر بن اسماعیل کا بیان ہے کہ میں ابن خزیمہ کے درس میں شریک ہوتا تھا اور وہ اکثر معمول کاموں

---

[1] طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۲۔

میں مدد لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میرا داہنا ہاتھ روشنائی سے سیاہ ہو گیا تھا اس لیے میں نے ان کو بائیں ہاتھ سے قلم دینا چاہا تو انہوں نے نہیں لیا۔ میرے رفقا نے داہنے ہاتھ سے قلم دینے کے لئے کہا جب میں نے داہنے ہاتھ سے دیا تو انہوں نے لے لیا۔[1]

بزرگی و کرامت | وہ صاحبِ کرامت بھی تھے، لوگ ان کی ذات کو نہایت بابرکت خیال کرتے تھے۔ ابو عثمان زاہد کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل نیشاپور کے مصائب و آلام ابن خزیمہ کی برکت سے دفع کر دے گا۔

محمد بن ہارون طبری روایت کرتے ہیں کہ "وہ اور محمد بن نصر مروزی، محمد بن علویہ وزان اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ چاروں آدمی تحصیل علم و سماع حدیث کے لئے ربیع بن سلمان کے پاس گئے وہاں ہم لوگوں کا ساز و سامان ختم ہو گیا۔ جب تین دن اور تین رات تک فاقہ کرنا پڑا تو ہم نے آپس میں کہا ایسی حالت میں تو ہمارے لئے سوال کرنا جائز ہے۔ لیکن ہر شخص سوال کرنے میں عار محسوس کرتا تھا۔ اس لئے قرعہ اندازی کی گئی۔ اتفاق سے قرعہ ابن خزیمہ کے نام نکلا انہوں نے کہا پہلے مجھے دو رکعت استخارہ کی نماز پڑھ لینے دو۔ ابھی وہ نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھولا گیا تو امیر مصر احمد بن طولون کا خادم اجازت لے کر اندر داخل ہوا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ پھر ایک پرزہ نکال کر پوچھا کہ محمد بن نصر کون صاحب ہیں؟ ہم لوگوں نے ان کی طرف اشارہ کر دیا، اس نے پچاس ہزار کی ایک تھیلی دی اور کہا امیر نے سلام عرض کیا ہے اور آپ کے اخراجات کے لئے یہ رقم پیش کی ہے۔ ختم ہونے کے بعد مزید رقم پیش کی جائے گی۔ اسی طرح ہم چاروں کو تھیلیاں دے کر یہی پیغام پہنچایا۔ ہم لوگوں نے اس سے کہا پہلے اس واقعہ کا سبب بتاؤ ورنہ ہم یہ تھیلیاں قبول نہیں کریں گے۔ اس نے کہا آج دوپہر میں امیر قیلولہ کر رہے تھے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ کل خدا کے یہاں حاضر ہو کر کیا جواب دو گے۔ جب وہ تم سے ان چاروں

---

[1] طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۲۔

علماء کے متعلق سوال کرے گا جو تین روز سے بھوکے ہیں، اس خواب سے امیر گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور آپ لوگوں کا نام لکھوا کر یہ تھیلیاں بھیجی ہیں۔ میں اسی وقت سے آپ لوگوں کی تلاش میں تھا، اب جا کر آپ لوگ ملے ہیں۔[1]

قناعت زندگی بڑی سادہ، درویشانہ اور تکلف و آرائش سے بالکل پاک تھی۔ ایک معمولی رقم میں گزر بسر کر لیتے تھے۔ پہننے کے لئے ہمیشہ ایک ہی قمیص ہوتی تھی، جب دوسری قمیص بنواتے تو پرانی کسی ضرورت مند کو دے دیتے تھے، لوگ درخواست کرتے کہ کچھ زیادہ کپڑے بنوا لیجئے، فرماتے کہ مجھے اپنے نفس کے آرام و راحت کا کوئی خیال نہیں۔[2]

سخاوت بڑے فیاض اور مہمان نواز تھے، ان کے پوتے محمد بن فضل کا بیان ہے کہ میرے دادا بخل سے ناآشنا اور مال پس انداز نہیں کرتے تھے، ان کا کل مال و دولت اہل علم اور ضرورت مندوں کے لئے وقف تھا۔ ایک مرتبہ بڑی پر تکلف دعوت کی، مختلف قسم کے لذیذ کھانوں اور حلوے، میوے اور فواکہ سے دسترخوان آراستہ تھا، امراء و اعیان کے ساتھ اہل علم اور فقہاء و محدثین بھی مدعو تھے، ہر شخص نے شکم سیر ہو کر کھایا، لوگوں کا بیان ہے کہ ایسی شاندار دعوت اور اس کا اہتمام صرف سلطان ہی کر سکتا تھا۔[3]

صاف گوئی ان کے اخلاقی اوصاف میں سب سے نمایاں وصف صاف گوئی ہے امراء و اعیانِ دولت کے سامنے بھی وہ اس میں باک نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ امیر اسماعیل بن احمد نے اپنے والد کے واسطہ سے ایک حدیث بیان کی جس کی سند میں ان کو وہم ہو گیا تھا ابن خزیمہ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے فوراً اس کی تصحیح کی جب واپس ہوئے تو قاضی ابوذر نے بتایا کہ ہم بیس سال سے یہ غلط روایت سنتے تھے مگر تصحیح کی جرأت نہ ہوتی تھی، ابن خزیمہ نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں خطا و تحریف جان کر خاموش رہنا گوارا نہیں کر سکتا۔[4]

---

[1] المنتظم ابن جوزی ج ۶ [2] طبقات الشافعیہ ج ۲ ص [3] طبقات الشافعیہ ج ۲ [4] ایضاً

امامت و شہرت اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی مرجعیت اور شہرت عطا فرمائی تھی امام الائمہ ان کے نام کا جزبن گیا تھا، اسنوی کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں خراسان کے امام تھے۔ امام دارقطنی نے ان کو امام اور ابن ابی حاتم نے امام و مقتدار کہا ہے[۱]۔ مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ان سے استفادہ کرنے کے لئے علما اور طلبہ کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ بڑے بڑے ارباب کمال دور دراز سے مشقتیں برداشت کرکے استفادہ کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مستفیدین کے قافلے ہر وقت خیمہ زن رہتے تھے۔ امراء و ارباب حشمت بھی ان کے اعزاز و اکرام کو ملحوظ رکھتے تھے۔ پہلی مرتبہ جب امیر اسماعیل بن احمد سے آپ کی ملاقات ہوئی، تو اس نے ناواقفیت کی وجہ سے شایان شان التفات نہیں کیا۔ بعد میں جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ ابن خزیمہ ہیں تو اس نے بڑی معذرت اور شرمندگی کا اظہار کیا اور نہایت گرمجوشی کے ساتھ ملا[۲]۔

وفات ۲؍ ذوقعدہ ۳۱۱ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا[۳]، اور اپنے گھر کے ایک کمرہ میں دفن کئے گئے، بعد میں پورا گھر مقبرہ میں تبدیل ہوگیا تھا۔ علامہ ابن جوزی نے ۸ ذوقعدہ اور ابواسحٰق شیرازی نے ۳۱۲ھ سنہ وفات بتایا ہے[۴]۔ ایک شاعر کے مرثیہ کے دو شعر یہ ہیں:

یابن اسحاق قد مضیت حمیدا	فسقی قبرك السحاب الهتون
ماتولیت لاهل العلم ولی	مادفناك بل هو المدفون[۵]

ترجمہ:۔ اے ابن اسحاق آپ کی زندگی نہایت قابل ستائش تھی، آپ کی قبر کو ہمیشہ برسنے والے بادل سیراب کرتے رہیں، آپ اہل علم کے سرپرست اور ان کی مشکلات میں کفیل تھے، آپ کے اٹھ جانے سے یہ سب ختم ہوگیا۔ ہم نے آپ کے بجائے علم کو دفن کیا ہے۔

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ [۲] طبقات الشافعیہ ج ۲ [۳] ایضاً و تذکرۃ ج ۲ [۴] المنتظم ج ۶ و طبقات الفقہاء۔ [۵] طبقات الشافعیہ ج ۲۔

تصنیفات ابن خزیمہ نامور مصنف بھی تھے، ان کی تصنیفات کی تعداد حاکم نے چودہ سے زیادہ بتائی ہے۔ ان کے علاوہ ان کے مسائل کا مجموعہ بھی سو جزوں کے بقدر تھا، ابن کثیر کا بیان ہے۔ فکتب الکثیر وصنف وجمع، یعنی بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ ابن خزیمہ تصنیف شروع کرنے سے قبل استخارہ کی نماز پڑھتے تھے، اگر استخارہ نکل آتا تھا تب تصنیف کی ابتدا کرتے تھے[1]۔ جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

فقہ حدیث بریرہ: یہ تین جزوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک حدیث کی فقاہت کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب التوحید والصفات۔ یہ بڑی اہم اور مشہور کتاب ہے اور کئی اجزاء پر مشتمل ہے اس کا موضوع کلام وعقائد ہے۔ امام رازی اس کو کتاب الاشراک کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ یورپ کے بعض کتب خانوں میں اس کے نسخے پائے جاتے ہیں۔ ابونعیم نے المستخرج علی التوحید لکھی تھی[2]۔

صحیح ابن خزیمہ: یہ علامہ ابن خزیمہ کی سب سے اہم کتاب ہے اس کا شمار حدیث کی اہم اور معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔ مستند مصنفین اور ثقہ علماء اس کی حدیثوں سے اخذ و استناد کرتے ہیں۔ کتب صحاح کے علاوہ جن محدثین نے اپنی کتابوں میں صحت کا زیادہ التزام کیا ہے ان کے مجموعے صحیح کہلاتے ہیں۔ شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں "جن دیگر علماء نے صحاح کے مجموعے لکھے ہیں ان میں ابن خزیمہ کی صحیح بعض حیثیتوں سے زیادہ مشہور ہے" اس کی اہمیت کا اندازہ ابن کثیر کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے:

من انفع الکتب واجلّها[3]۔ یعنی صحیح ابن خزیمہ نہایت مفید اور اہم کتابوں میں ہے۔ علامہ سیوطی نے بخاری و مسلم کے بعد جن کتابوں کو زیادہ معتبر بتایا ہے ان میں

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۲ [2] ایضاً و تذکرۃ ج ۲ والبدایہ ج ۱۱ [3] فوائد الجامعہ و کشف الظنون ج ۲ و تذکرۃ النوادر و تدریب الراوی

کتب صحاح کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ صحیح ابن خزیمہ کا پایہ صحیح ابن حبان سے زیادہ ہے کیونکہ ابن خزیمہ نے صحت کی جانب زیادہ توجہ کی ہے۔ وہ ادنیٰ اشبہ پر بھی توقف سے کام لیتے ہیں چنانچہ اکثر ان صح الخبر وان ثبت وغیرہ قسم کے الفاظ لکھے ہیں۔ یہ صحت میں صحیح مسلم کے قریب قریب ہے۔ اس کے نسخے یورپ کے بعض کتب خانوں اور جرمنی میں موجود ہیں۔ حافظ ابن حجر نے صحیح ابن خزیمہ پر مفید حواشی بھی لکھے تھے۔[1]

---

[1] مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔

Marfat.com

امام ابو عوانہ اسفرائینیؒ

متوفی ۳۱۶ھ

نام و نسب یعقوب نام، ابو عوانہ کنیت اور سلسلۂ نسب یہ ہے: یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم بن یزید، بعض اہل سیر نے یزید کے بجائے زید لکھا ہے۔[1]

وطن وہ اسفرائن کے باشندہ تھے لیکن آخر عمر میں نیشاپور میں سکونت اختیار کر لی تھی اس لئے اسفرائنی اور نیشاپوری دونوں نسبتوں سے مشہور ہیں۔ اسفرائن نواحی نیشاپور میں زرخیز اور شاداب شہر تھا۔ قدیم زمانہ میں اس کا نام مہرجان تھا۔ اس شہر کی جانب علماء و اعیان کی ایک کثیر جماعت منسوب ہے۔ سمعانی کا بیان ہے کہ قدیم اور جدید ہر دور میں جملہ فنون کے ماہرین علماء اور فضلاء کی ایک جماعت یہاں پیدا ہوئی۔ ان میں ابو عوانہ بھی ہیں۔[2]

اساتذہ ابو عوانہ کے شیوخ و اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے۔ ان میں سے اکثر بڑے نامور کامل الفن ہیں۔ بعض شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابو حاتم، ابو زرعہ، احمد بن ازہر، احمد بن سعید دارمی، اسماعیل بن محمد بن قراط، حسن زعفرانی، سعد بن عبد الحکیم، سعدان بن نصر، علی بن اسکاب، علی بن حرب، عمر بن شبہ، محمد بن رجاسندی، محمد بن عبد الحکم، محمد بن یحییٰ ذہلی، مسلم بن حجاج قشیری، یزید بن محمد بن عبد الصمد، یعقوب بن سفیان اور یونس بن عبد الاعلیٰ وغیرہ سے علم حدیث کی اور امام شافعیؒ کے ارشد تلامذہ ابو ابراہیم

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ [2] بستان المحدثین و کتاب الانساب۔

مزنی اور ربیع بن سلیمان سے فقہ میں تکمیل بہم پہنچائی۔

تلامذہ ان کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابو احمد علی، ابو بکر اسماعیلی، ابو علی نیشاپوری، ابو الولید فقیہ، احمد بن علی رازی، حسین بن علی، سلیمان طبرانی، عبد اللہ بن عدی، عبد الملک بن حسن اسفرائینی[1]، محمد بن ابو عوانہ[2]، محمد بن یعقوب بن اسماعیل، یحییٰ بن منصور قاضی وغیرہ

طلب حدیث کے لئے سفر ابو عوانہ نے علم حدیث کی طلب و جستجو میں متعدد مقامات کے سفر کئے۔ اس حیثیت سے بھی وہ دوسرے محدثین میں ممتاز ہیں۔ ان سے زیادہ کسی اور کے سفر کی تفصیل نہیں ملتی۔ علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ "ابو عوانہ نے طلب حدیث کے لئے سفر کئے اور اس کے جمع کرنے اور اس کی تحریر و کتابت میں بڑی مشقت اٹھائی"۔[3] حاکم کا بیان کہ "وہ کثیر الاسفار تھے اور انہوں نے احادیث کی تحصیل کے لئے روئے زمین کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا"۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ

احد الحفاظ الجوالین والمحدثین المکثرین	وہ ان حفاظ اور محدثین میں تھے جنہوں نے بڑے سفر کئے اور بکثرت حدیثیں جمع کیں۔

مورخین اور اصحاب سیر کا بیان ہے کہ انہوں نے خراسان، عراق، یمن، حجاز، شام، جزیرہ، فارس، اصفہان، ثغور، رے، واسط، بصرہ اور کوفہ وغیرہ مختلف ملکوں اور شہروں کا تحصیل علم اور طلب حدیث کے لئے سفر کیا۔

حفظ و ثقاہت ان کا حافظہ بے مثال تھا۔ علمائے فن نے ان کو الحافظ الکبیر الجلیل، احد الحفاظ، احد حفاظ الدنیا اور من اکابر حفاظ الحدیث لکھا ہے اور ثقہ جلیل اور الثقۃ الکبیر

---

[1] یہ ابو عوانہ کے بھتیجے تھے [2] یہ ابو عوانہ کے فرزند تھے [3] کتاب الانساب وفیات الاعیان ج ۲ و مراۃ الجنان ج

وغیرہ کے الفاظ میں اُن کی توثیق کی ہے۔

اعتراف کمال دوسرے علماء و محدثین ان کے کمالات کے معترف تھے۔ حاکم لکھتے ہیں کہ "ابو عوانہ بلند پایہ محدثین اور اصحاب کمال میں تھے"۔ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ "وہ نامور محدثین اور بلند ترین علمائے اسلام میں تھے"۔[1]

فقہ واجتہاد فقہ میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، ذہبی کا بیان ہے کہ "وہ حافظ ومحدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہہ اور امام بھی تھے۔ ابن خلکان نے ان کے مزار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس مقام میں امام شافعی کے مذہب ومسلک سے تعلق رکھنے والے چالیس ایسے ائمہ مجتہدین اور فقہا مدفون ہیں جو اگر اپنی رائے واجتہاد سے فتویٰ دیتے تو بلاشبہ وہ اس کے مستحق تھے"۔

مذہب ومسلک انہوں نے فقہ کی تعلیم شافعی مذہب کے ائمہ سے حاصل کی تھی اس لئے ان کو اس مذہب سے بڑا تعلق تھا، مصر سے واپس آنے کے بعد انہوں نے شوافع کی کتابوں سے پہلی مرتبہ اسفرائن کے لوگوں کو روشناس کرایا اور انہی کے بدولت اسفرائن میں امام شافعیؒ کے مذہب کی ترویج واشاعت ہوئی۔

زہد واتقاء زہد وتقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔ علامہ سمعانی بیان کرتے ہیں کہ "وہ زاہد، عبادت گزار، عفیف، پاکدامن اور کم خور تھے اور پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔

وفات اپنے وطن اسفرائن میں ۳۱۶ھ میں انتقال کیا۔ ایک روایت ۳۱۳ھ کی بھی ہے لیکن وہ ضعیف ہے۔

تصنیفات امام ابو عوانہ کی تصنیفات میں ایک مسند صحیح ان کی یادگار ہے جو دراصل صحیح مسلم پر مستخرج ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں مستخرج اس کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں کسی

---

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۲ و تذکرہ ج ۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ [2] ایضاً

دوسری کتاب کی حدیثوں کو اس کی ترتیب، متون اور طرق اسناد کے مطابق نقل کیا جاتا ہے۔ مسند ابو عوانہ میں امام مسلم کے طرق و اسانید کے علاوہ دوسرے طرق و اسناد اور بعض متون کا اضافہ بھی کیا گیا ہے اس لئے اس کو صحیح بھی کہا جاتا ہے اور اس حیثیت سے دراصل یہ خود ایک مستقل تصنیف بن گئی ہے۔[1]

خصوصیات (۱) اس کی پہلی خصوصیت تو یہی ہے کہ صحیح مسلم کی متخرج ہونے کے باوجود اس میں بعض اضافے بھی ہیں۔ علامہ ذہبی کا بیان ہے:۔

صاحب الصحیح المسند المخرج علی صحیح مسلم و له فیه زیادات عدة[2]	ابو عوانہ صاحب صحیح مسند ہیں ان کی کتاب امام مسلم کی صحیح پر تخریج کی گئی ہے لیکن اس میں متعدد اضافے بھی ہیں۔

مثلاً باب الدلیل علی ایجاب الوضوء میں تین حدیثیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال ابو عوانة من هنا لم یخرجه اصحابنا۔	یعنی یہاں سے جو روایتیں نقل کی جا رہی ہیں ان کی ہمارے اصحاب نے تخریج نہیں کی ہے۔

اسی طرح آٹھ حدیثیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

قال ابو عوانة الی هنا زدت من عندی[3]	یعنی یہاں تک میں نے خود اضافہ کیا ہے۔

(۲) مختلف اسانید اور متعدد احادیث تحویل نظائر و شواہد کے ساتھ درج کئے ہیں اور اختلافِ متن کی بحث کرتے ہوئے ایسے اقوال اور صحیح مرویات جمع کئے ہیں جو دوسری متداول کتابوں میں نہیں ملتے۔

(۳) امام ابو عوانہ نے احادیث کے معنی کی صحیح تعبیر اور بلیغ تشریح بھی کی ہے۔

---

[1] بستان المحدثین [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ [3] مسند ابو عوانہ ج ۱۔

(۴) فقہی ابواب پر مسند کو مرتب کرنے کے باوجود انہوں نے اس میں مختلف فصول قائم کئے ہیں جو ان کی طباعی کا ثبوت ہے۔

اس مسند کو پہلی مرتبہ مولانا محمد ہاشم ندوی نے ایڈٹ کر کے دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے ۱۳۶۲ھ و ۱۳۶۳ھ میں دو جلدوں میں شائع کیا ہے اور مفید تعلیقات اور مختصر حواشی بھی لکھے ہیں۔ دونوں جلدوں کے آخر میں ابواب و فصول کی مفصل فہرست، اسماء واعلام کا انڈکس اور پہلی جلد میں مصنف اور تصنیف کے متعلق مفید معلومات بھی درج ہیں مسند کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں[۱]۔ اور علمائے فن نے اس کے ساتھ اعتنا کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے المنتقی کے نام سے اس کی ۲۳۰ حدیثوں کو منتخب کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرۃ باطراف العشرہ میں مستخرج ابی عوانہ کی حدیثیں درج کی ہیں[۲]۔

---

[۱] مقدمہ تحفۃ الاحوذی و تذکرۃ النوادر و بستان المحدثین و ذیل طبقات الحفاظ۔

امام ابو جعفر طحاویؒ

متوفی ۳۲۱ھ

نام و نسب احمد نام، ابو جعفر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے؛ احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ
سلیم بن سلیمان بن حباب[1]۔

ولادت مشہور روایت کے مطابق وہ یکشنبہ کے دن ۱۰ ربیع الاول ۲۲۹ھ
پیدا ہوئے۔ ۲۲۷ھ و ۲۳۸ھ بھی سنہ ولادت بیان کیا جاتا ہے[1]۔

خاندان و وطن امام طحاوی کا خاندانی تعلق یمن کے مشہور قبیلہ ازد کی شاخ حجر سے تھا
اسلامی فتوحات کے بعد ان کے خاندان والوں نے مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی اور
ایک گاؤں طحا میں امام صاحب کی ولادت ہوئی[1] اس لئے وہ ازدی، حجری اور مصری و طحاوی
کہلاتے ہیں۔ یاقوت کا بیان ہے کہ طحا کے قریب ہی طحطوط نام کے ایک گاؤں کو ان کے
وطن ہونے کا فخر حاصل ہے لیکن انہوں نے اس کے بجائے طحا کی جانب ہی اپنی نسبت پسند
کیا۔ علامہ سیوطی نے بھی اسی روایت پر اعتماد کیا ہے[2]۔

اساتذہ ان کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے۔ عبدالعزیز بن طاہر تمیمی نے ایک مستقل رسالہ میں
ان کا تذکرہ کیا ہے[3]۔ طحاوی کے اکثر شیوخ کو مشہور محدث ابن وہب اور سفیان بن عیینہ

---

[1] الجواہر المضیۃ ج ۱ ۔ تاریخ ابن عساکر ج ۲ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ۔ ایضاً و کتاب الانساب و الجواہر المضیۃ ج ۱

[2] معجم البلدان ج ۶ و الرسالۃ المستطرفۃ ۔ الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی

شرف تلمذ حاصل ہے۔ بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

بحیر بن نصر، سلیمان بن شعیب کیسانی، عبدالغنی بن رفاعہ، عیسیٰ بن مثرود، محمد بن عبدالحکم ہارون بن سعید ایلی، یونس بن عبدالاعلیٰ صدفی وغیرہ۔

فقہ و اجتہاد کی تحصیل کے لئے پہلے امام شافعیؒ کے ممتاز ترین شاگرد اور فقہ شافعی کے جامع و مرتب امام مزنی کی جانب جو ان کے ماموں تھے متوجہ ہوئے لیکن بعد میں قاضی ابوحازم اور احمد بن عمران وغیرہ سے اس کی تکمیل کی۔[1]

تلامذہ ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے بعض علماء نے ان پر مستقل رسالہ لکھا ہے چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن عبدالوارث زجاج، احمد بن قاسم خشاب، ابومحمد حسن بن قاسم مصری، ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی، ابوالقاسم عبداللہ بن علی داؤدی، ابوسعید عبدالرحمٰن بن احمد، ابوبکر محمد بن ابراہیم مقری، ابوالحسن محمد بن احمد اخیمی، محمد بن بکر، محمد بن منظفر، یوسف بن قاسم میانجی۔

طلب علم کے لئے سفر مورخین نے صرف ۲۶۸ھ میں امام صاحب کے شام تشریف لے جانے کا ذکر کیا ہے مگر ان کے اساتذہ میں مصر، یمن، کوفہ، بصرہ، حجاز، شام، خراسان اور مغرب وغیرہ مختلف اسلامی ملکوں کے ارباب کمال شامل ہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ انہوں نے ان میں سے اکثر مقامات کا سفر بھی کیا ہوگا، ان کے شوق و جستجو کا یہ حال تھا کہ جب کوئی محدث یا صاحب کمال مصر آتا، تو اس کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کی کوشش کرتے۔[2]

حفظ وثقاہت ابن یونس صاحب تاریخ مصر کا بیان ہے کہ "امام طحاوی ثقہ و ثابت اور صاحب عقل و فراست تھے" مسلمہ بن قاسم قرطبی فرماتے ہیں وہ ثقہ اور نہایت جلیل القدر تھے"۔ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "ثقہ و ثابت اور ماہر حفاظ حدیث میں امام طحاویؒ بھی ہیں"۔ بدرالدین عینی

[1] العبر ج ۲ [2] الجواہر ج ۱، ابن عساکر ج ۲ و حسن المحاضرہ ج ۱ [3] الجواہر المضیئہ ج ۱۔ و الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی [4] تاریخ ابن عساکر ج ۲ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ و الحاوی۔

فرماتے ہیں کہ "ان کی ثقاہت، دیانت، امانت، اور فضیلت پر سب کا اتفاق ہے" صاحب مرأۃ الزماں تحریر فرماتے ہیں کہ "لوگ ان کے علم و فن کی طرح ان کے صدق و ثقاہت کے بھی معترف ہیں"[1]

اعتراف کمال تمام اکابر علماء و محدثین ان کے علمی کمالات کے معترف تھے، مورخین کا بیان ہے کہ "ان کے بعد ان کا کوئی ہمسر اور جانشین نہیں پیدا ہو سکا" ابن ندیم فرماتے ہیں کہ "وہ علم و فضل میں بے مثال اور یکتائے روزگار تھے" علامہ عینی کہتے ہیں کہ "جن محدثین اور مورخین نے ان کا تذکرہ کیا ہے، وہ سب ان کی مدح و توصیف میں متفق ہیں۔ متقدمین میں طبرانی، خطیب، حمیدی اور متاخرین میں حافظ مزی، ابن کثیر اور ذہبی وغیرہ نے ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی واقف کار اور منصف مزاج شخص ان کے علم و فضل اور اوصاف و کمالات کا منکر نہیں ہو سکتا" حضرت شاہ عبد العزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "ان کی تصنیفات ان کی وسعتِ نظر اور علمی تبحر پر شاہد ہیں"[2]

جامعیت امام طحاوی کو جملہ اسلامی علوم اور ان کے متعلقات میں مہارت حاصل تھی۔ مورخین اور علمائے سیر نے تفسیر، کلام، عربیت، ادب، لغت، نحو اور انساب وغیرہ میں ان کی ژرف نگاہی کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض علوم میں انہوں نے مستقل کتابیں لکھیں اور ان کی فقہی و حدیثی کتابوں میں بھی ان علوم پر بحثیں ہیں۔ حدیث و فقہ اور اصول و شروط کے خاص طور پر بڑے ماہر تھے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "انہوں نے شروط میں کتاب لکھی اور وہ اس فن میں متمہر و ماہر تھے" علامہ زاہد الکوثری فرماتے ہیں: "امام طحاوی فضائل و کمالات کے جامع تھے۔ حدیث اور اس کے متعلقہ علوم اور فقہ اور اس کے اصول و ضوابط میں علمائے امت میں بہت کم لوگ ان دونوں فنون میں ایسے جامع پیدا ہوئے۔ اس کا ان تمام لوگوں کو اعتراف ہے جو اس چشمۂ فیض سے

---

[1] الجواہر المضیئۃ ج ۱ و کتاب الانساب والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ [2] الفہرست والحاوی و بستان المحدثین۔

سیراب ہوئے ہیں۔[1]

زہد و اتقاء زہد و اتقاء میں بھی ان کا درجہ نہایت بلند تھا۔ ابن ندیم فرماتے ہیں کہ وہ زہد و ورع میں یکتائے زمانہ تھے[2]۔ صاحب مراۃ الزمان کا بیان ہے کہ "ان کے زہد و تقویٰ پر لوگوں کا اتفاق ہے"۔ علامہ عینی نے ان کی دیانت، ثقاہت، امانت اور راست بازی وغیرہ کی جانب اشارہ کیا ہے[3]۔

فقہی مسلک شروع میں وہ شافعی مذہب سے وابستہ تھے۔ پھر حنفی مذہب اختیار کر لیا اور اس سے ایسا مستحکم تعلق ہوا کہ اس مذہب کے اکابر فقہا اور ائمہ مجتہدین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے تمام سوانح نگاروں نے ابن یونس کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ "مصر میں حنفی مذہب کی ریاست و سیادت ان پر تمام ہو گئی"۔ حافظ ذہبی وغیرہ نے ان کو شیخ الحنفیہ لکھا ہے[4]۔ گو اس مذہب میں بڑے بڑے جلیل القدر علما اور بکثرت ارباب کمال پیدا ہوئے لیکن ان سب میں امام طحاوی کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیفات سے اس مذہب کی بڑی اہم خدمات انجام دیں اور اس کی ترویج و اشاعت اور تائید و حمایت میں اپنی عمر صرف کر دی، جس کا اعتراف خود علمائے احناف کو بھی ہے۔ ابن قطلوبغا کا بیان ہے وکان امام امامن الصنعیین[5]۔ حنفی مذہب سے شدید تعلق کے باوجود انہوں نے بعض مسائل میں اس سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس لئے ان کو مجتہد منتسب وغیرہ کہا گیا ہے۔

شافعی مذہب ترک کرنے کا سبب امام طحاویؒ کے شافعی مسلک چھوڑنے کے متعلق مورخین نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ "ابتدا میں وہ اپنے ماموں اسماعیل بن یحییٰ مزنی (م ۲۶۴ھ) کے درس میں جو امام شافعیؒ کے ممتاز ترین شاگرد اور فقہ شافعی کے بانیوں میں تھے شریک ہوتے تھے۔ ایک دن انہوں نے کوئی مسئلہ بیان کیا جس کو طحاوی بار بار سمجھانے کے باوجود بھی نہیں سمجھ

---

[1] العبر ج ۲ و ابن خلکان و البدایہ ج ۱۱ و الحاوی [2] الفہرست والحاوی [3] تاریخ ابن عساکر ج ۲ و [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ و العبر ج ۲ [5] الجواہر المضیئۃ ج ۱ و حسن المحاضرہ ج ۱۔

سکے، اس پر انہوں نے بلادت و غباوت کا طعنہ دیا اور کہا کہ "بخدا تم کو کچھ نہیں آسکتا؛ امام طحاوی اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوئے کہ مزنی کے درس میں جانا ہی ترک کر دیا، اور ابو جعفر احمد بن ابی عمران کے حلقۂ درس میں جو مصر میں حنفی مذہب کے قاضی تھے شریک ہونے لگے اور پوری محنت سے فقہ میں مشق و مہارت بہم پہنچائی اور مختصر تصنیف کر کے اپنے تمام معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے، ایک روز وہ امام مزنی کی قبر سے گزرے تو فرمایا کہ "خدا تعالیٰ ان پر رحم کرے اگر یہ زندہ ہوتے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرتے"[۱] علامہ ابن خلکان نے ایک دوسری وجہ یہ بھی تحریر کی ہے کہ محمد بن احمد شروطی نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اپنے ماموں کا مسلک کیوں ترک کیا تو فرمایا کہ میں نے خود ان کو دیکھا کہ وہ اکثر امام ابو حنیفہ کے مسلک کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی جانب مراجعت کرتے ہیں، اس لئے میں نے حنفیہ کا مذہب اختیار کر لیا اور اپنے ماموں اور استاد کا مسلک ترک کر دیا۔[۲]

وفات پنج شنبہ کے دن غرہ ذوقعدہ ۳۲۱ھ کو مصر میں انتقال کیا اور قرافہ میں امام شافعیؒ کے مزار کے متصل ہی دفن کئے گئے۔[۳]

اولاد ایک صاحبزادہ ابو الحسن علی اور پوتے ابو علی حسن بن علی کا نام ضمناً ملتا ہے۔

تصنیفات امام طحاوی جلیل القدر عالم اور بلند پایہ مصنف تھے، ان کو ان کی تصنیفات اور اہم علمی خدمات کی بنا پر بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں "وہ نہایت مفید اور بیش بہا تصنیفات کے مالک تھے"[۴] حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ "ان کی تصنیفات بڑی انوکھی ہیں"؛ علامہ ابن خلکان کہتے ہیں۔ "انہوں نے متعدد مفید کتابیں لکھیں"[۵] جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ حسب ذیل ہیں:

کتاب[۶] الاشربہ، کتاب التاریخ الکبیر، کتاب[۷] التسویۃ بین حدثنا و اخبرنا، رسالۂ[۸] حکم

---

۱ تاریخ ابن عساکر ج ۲ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ و لسان المیزان ج ۱ ۲ تاریخ ابن خلکان ج ۱ ۳ ایضاً

۴ البدایہ والنہایہ ج ۱۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ و تاریخ ابن خلکان ج ۱۔

Marfat.com

آراضی مکہ، رسالۃ فی المرزیۃ، کتاب الشروط الاوسط، کتاب العزل، کتاب الفرائض، قسم الفئ و الغنائم۔ کتاب المحاضرہ والسجلات، کتاب الوصایا، مناقب ابی حنیفہ (یا) اخبار ابی حنیفہ واصحابہ۔ اختلاف الروایات علی مذہب الکوفیین (دو جزوں میں) الرد علی عیسیٰ بن ابان (دو جزوں میں) النوادر الفقہیۃ (دس جزوں میں) النوادر والحکایات (بیس جزوں میں) کتاب فی النحل واحکامہا (چالیس جزوں میں)

کتاب نقض کتاب المدلسین، ابو علی حسین بن علی کرابیسی کی کتاب المدلسین کے رد و جواب میں ہے۔

کتاب الرد علی ابی عبید۔ ایک جزء پر مشتمل ہے۔ اس میں ابو عبید کی ان غلطیوں کی تردید کی گئی ہے جو انساب کے متعلق انہوں نے کی ہیں۔

سنن شافعی۔ یہ ان حدیثوں پر مشتمل ہے جو امام مزنی کے واسطے سے امام شافعی سے مروی ہیں۔

شرح الجامع الصغیر۔ امام محمد بن حسنؒ کی مشہور و معرکۃ الآرا کتاب الجامع الصغیر فی الفروع کی جو پندرہ سو بتیس مسائل پر مشتمل ہے، شرح ہے۔

شرح الجامع الکبیر۔ یہ بھی امام محمد صاحب کی مشہور کتاب الجامع الکبیر فی الفروع کی شرح ہے۔

کتاب الشروط الصغیر۔ اس کا نام مختصر الشروط بھی ہے۔ یہ پانچ جزوں میں ہے، مکتبہ شیخ الاسلام فیض اللہ میں موجود ہے۔

کتاب الشروط الکبیر۔ چالیس اجزاء پر مشتمل ہے یورپ سے اس کا ایک جزء چھپ چکا ہے اور بعض اجزا مکتبہ علی پاشا شہید اور استنبول کے مکتبہ ملا مراد میں ہیں۔[۱]

---

[۱] دیکھئے الفہرست ابن ندیم والجواہر المضیۃ اور کشف الظنون باختلاف صفحات و فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ والحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی۔

احکام القرآن[25] بیں جزدں پر مشتمل ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ تفسیر قرآن کے موضوع پر امام طحاویؒ نے ایک ہزار اوراق لکھے تھے، علامہ زاہد الکوثری کے خیال میں احکام القرآن ان ہی اوراق کا مجموعہ ہے، لیکن بعض لوگوں کے نزدیک یہ دوسری اور مستقل کتاب ہے[1]۔

بیان السنۃ[26] والجماعۃ۔ اس کے مختلف نام ہیں اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ یہ رسالہ کئی بار چھپ چکا ہے۔ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں قازان سے عمر بن اسحاق ہندی کی شرح کے ساتھ چوہتر صفحات میں شائع ہوا تھا[2]۔ مولانا محمد شفیع صاحب نے اسی نسخہ کی مدد سے اس کا ایک ایڈیشن دیوبند سے عقیدۃ الطحاوی کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں اہل سنت والجماعت کے عقائد، امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے مذاہب، اصول اور معتقدات کی روشنی میں تحریر کئے گئے ہیں۔

اختلاف العلماء[27]۔ تیس سے زیادہ اجزاء پر مشتمل ہے۔ ابن ندیم نے اس کا نام کتاب الاختلاف بین الفقہاء لکھا ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ یہ نہایت ضخیم کتاب ہے۔ امام طحاویؒ اس کو مکمل نہیں کر سکے تھے، ابوبکر جصاص رازی متوفی ۳۷۰ھ نے اس کا مختصر لکھا تھا جو استنبول کے مکتبہ جاراللہ ولی الدین میں موجود ہے۔ علامہ کوثری کی نظر سے یہ مختصر گزرا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "اس میں ائمہ اربعہ کی طرح دوسرے قدیم مجتہدین اور فقہاء امصار مثلاً ابراہیم نخعی، عثمان بتی، امام اوزاعی، سفیان ثوری، لیث بن سعد، ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ اور حسن بن حی وغیرہ کے اقوال و مذاہب بھی نقل کئے گئے ہیں[3]۔" اگر آج امام طحاوی کی اصل کتاب موجود ہوتی تو اکابر علمائے متقدمین اور فقہائے امصار کے مسالک معلوم کرنے میں بڑی آسانی بھی ہوتی اور یہ کتاب ان کے اقوال کا اچھا اور عمدہ ماخذ بھی ہوتی۔

کتاب المختصر[28] فی الفقہ یا مختصر الطحاوی۔ اس کو امام مزنی کی مختصر کے انداز پر مرتب کیا گیا ہے۔ یہ حنفی فقہ کے فروع وجزئیات پر ایک مختصر اور جامع متن ہے اور اس میں اس مذہب کے اکابر یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسف، امام محمد، امام زفر اور حسن بن زیاد کے اقوال و آراء نقل کئے گئے ہیں۔ امام طحاوی نے اقوال مختلفہ کے درمیان ترجیح بھی دی ہے۔ ائمہ کے اختلاف کی صورت میں غیر جانبدارانہ

---

[1] الجواہر المضیۃ ج۱ و الحاوی [2] اکتفاء القنوع و معجم المطبوعات [3] کشف الظنون ج۱ و الفہرست و الحاوی [4] کشف الظنون ج۲

Marfat.com

طور پر کبھی امام ابو حنیفہؒ اور کبھی صاحبین اور کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک کے مسلک کو راجح قرار دیا ہے۔ بعض مواقع پر ان تینوں بزرگوں کے بجائے امام زفر یا حسن بن زیاد کے قول کی تائید کی ہے، اور چند مقامات پر ان سب بزرگوں کے قول کو مرجوح سمجھ کر اپنی رائے و اجتہاد کا ذکر بھی کیا ہے، جن مسائل میں ائمہ کے اقوال معلوم و منقول نہیں ہوتے تو اشارات، نصوص اور دوسری دلالتوں سے ان کے اقوال مستنبط کرتے ہیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کو علمائے مجتہدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں۔

"اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حنفی مذہب کے مقلد ہی نہ تھے بلکہ مجتہد منتسب بھی تھے چنانچہ انہوں نے حنفی مذہب کے خلاف بھی کچھ باتیں لکھی ہیں"[1] صاحب دراسات اللبیب کا بیان ہے "امام طحاوی حنفی مذہب سے شغف رکھنے اور اس کے ماخذ مرفوع وموقوف کی تخریج کرنے کے باوجود جب اس کو حدیث کے خلاف پاتے تو رد کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے تھے"۔

یہ مختصر متن حنفیہ کی صحیح و قوی روایات اور مفتی بہ ومرجح اقوال کا بڑا مستند ماخذ اور ایسے گوناگوں مسائل کا مجموعہ ہے جو دوسرے متون اور مطول کتابوں میں نہیں ملتے۔ علاوہ ازیں اس میں ترجیح کے وجوہ اور کتاب وسنت اور قیاس وغیرہ سے دلائل بھی فراہم کئے گئے ہیں اس لئے اس کو ہمیشہ مقبول اور معتبر سمجھا گیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس لئے اور زیادہ ہے کہ علمائے احناف میں سب سے پہلے امام طحاوی کو مختصر لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جن کی تعداد گیارہ سے متجاوز ہے۔ یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدرآباد سے چھپ چکی ہے۔

مشکل الآثار | یہ امام طحاوی کی بڑی مشہور اور اہم کتاب ہے۔ اس کا مقصد تصنیف بیان کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:۔

"ثقہ و ثابت رواۃ سے مروی مسند و مقبول حدیثوں کی معرفت وغیرہ کے متعلق لوگوں کی ناواقفیت دیکھ کر میں نے ان پر غور کیا، اس کے نتیجہ میں جو مشکلات اور حدیثوں سے جو مسائل و

---

[1] بستان المحدثین واتحاف النبلاء المتقین۔

احکام اور اہم نکات و حقائق مستنبط ہوئے، ان کو بیان کر کے ان پر عائد ہونے والے اعتراضات و اشکالات کو اس میں رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی ترتیب و تصنیف میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے ایک حدیث ذکر کر کے اس کے متابعات اور موید روایتیں نقل کی گئی ہیں، پھر اس کا صحیح مدلول و منشا متعین کر کے اس پر عائد ہونے والے شکوک کا جواب یا دوسری حدیثوں سے اس کے اختلاف کی نوعیت وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، ثبوت و استدلال اور بحث و تحقیق میں قرآنی آیات، احادیث نبوی، آثار صحابہ و تابعین، ائمہ مجتہدین کے اقوال و آرا بیان کئے گئے ہیں اور نحوی و لغوی مسائل کی تحقیق بھی کی گئی ہے اور کلام عرب سے بھی کہیں کہیں شواہد پیش کئے گئے ہیں اسانید و متون اور رجال وغیرہ کے متعلق بھی مفید اور ضروری معلومات نقل کئے گئے ہیں۔ مشکل الآثار کے بعض اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) اس کی سب سے اہم اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اصلاً مشکلات حدیث کا تعین کر کے ان کا محققانہ جواب دیا گیا ہے، جس سے مشکلات اور دقت طلب امور بھی حل ہو گئے ہیں اور شکوک و شبہات بھی رفع ہو گئے ہیں۔

(۲) اس کتاب میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ احادیث کے اندر تضاد و تناقض نہیں ہوتا۔

(۳) استدلال و تحقیق کی حیثیت سے بھی اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ امام طحاوی تحقیق و تنقیح اور بحث و استدلال کا پورا حق ادا کر دیتے ہیں، اس کتاب میں جو اہم اور گوناگوں مسائل و مباحث بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے متعلق ماہرین فن اور ائمہ کے خیالات اور اہم کتابوں کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔

(۴) فقہی و اجتہادی حیثیت سے بھی مشکل الآثار کا پایہ بہت بلند ہے، امام طحاویؒ نے فقہائے صحابہؓ و تابعین، ائمہ کبار اور مجتہدین اسلام کے اختلافات بھی بیان کئے ہیں اور ان کے درمیان توجیہ، تطبیق اور ترجیح بھی دی ہے۔ نیز وجوہ ترجیح بھی بیان کئے ہیں۔ ان کے تفقہ و اجتہاد کا اس سے بھی

۱؎ مشکل الآثار ج ۱۔

اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بعض مسائل میں ائمہ احناف کے اقوال سے بھی اختلاف کیا ہے۔

(۵) تفسیری مباحث اور قرآنی علوم مثلاً آیتوں کی تشریح ان کے مفہوم و منشا کی توضیح قرآن کے مشکل الفاظ و کلمات کی تحقیق اور بعض استعمالات کی توضیح، سببِ نزول و شانِ نزول کی وضاحت اور تجوید و قرأت کے مسائل پر اس میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۶) حدیث کی فنی بحثوں، اصول حدیث کے مباحث اور رجال و اسناد وغیرہ پر بھی عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔ امام صاحب جب کوئی حدیث نقل کرتے ہیں تو پہلے یہ واضح کرتے ہیں کہ حدیث صحیح ہے یا غلط، اگر صحیح ہے تو اس کے اسباب اور غلط ہے تو اس کے وجوہ و علل بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح حدیث منقطع ہے یا متصل، موقوف ہے یا مرفوع، مرسل ہے یا مسند، غریب و منکر ہے یا مقبول و مشہور، ضعیف اور فاسد الاسناد ہے یا قوی، حسن اور صحیح الاسناد، راوی ثقہ و ضابط ہے یا غیر ثقہ اور مجہول الحال، مدلس ہے یا غیر مدلس، شذوذ و تفرد سے اس نے کام لیا ہے یا دوسرے راویوں نے اس کی متابعت و موافقت کی ہے اس کو وہم و شک ہوا ہے یا نہیں، نفس روایت کے اندر اس سے کیا سہو و خطا ہوئی ہے۔ راوی نے کوئی اضافہ یا کمی کی ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔ راوی کے ابہام، دوسرے راوی سے سماع و عدم سماع اور اسماء و اعلام کے متعلق وضاحتیں کرتے ہیں، ایک قسم کی متعدد حدیثیں اس لئے بیان کرتے ہیں کہ ان کا باہمی فرق و اختلاف اور کمی بیشی نمایاں ہو جائے۔

(۷) حدیث کے مشکل و غریب الفاظ اور بعض اصطلاحی الفاظ پر ایک ماہر فن کی حیثیت سے داد تحقیق دی گئی ہے، نحو، بلاغت، معانی اور زبان کے استعمالات و اسالیب پر بھی بعض اچھی بحثیں کی گئی ہیں۔

مشکل الآثار کی سات جلدیں استنبول کے مکتبہ فیض اللہ میں موجود ہیں۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد نے صرف چار جلدیں شائع کی ہیں جو تقریباً سولہ سو نتیس صفحات پر مشتمل ہیں، ہر جلد کے آخر میں فہرست مضامین ہے، جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۶ ہے۔ مرتبین نے مختصر حواشی بھی لکھے ہیں جو الفاظ و

لغات کی تشریح اور اسناد و رواۃ کے متعلق معلومات پر مشتمل ہیں۔ اصل متن میں جو مختصر حدیثیں ہیں ان کو حاشیہ میں مکمل درج کیا گیا ہے۔

محدث ابوالولید بن رشد مالکی نے اس کا مختصر تحریر کیا ہے جو دائرۃ المعارف سے شائع ہوا ہے، اس میں امام طحاوی پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، اس کا قاضی القضاۃ جمال الدین یوسف بن موسیٰ الملطی نے المعتصر من المختصر کے نام سے مختصر کیا ہے، یہ کتاب بھی دائرۃ المعارف سے ۱۳۱۷ھ میں لمبی تقطیع کے چار سو اڑسٹھ صفحات میں شائع ہوئی ہے، چونکہ مشکل الآثار میں ترتیب و تبویب نہیں تھی اس لئے ابن رشد نے اس کو ابواب پر مرتب کیا تھا۔ قاضی ملطی کے مختصر میں پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں اور اوصاف و خصوصیات کی حدیثیں ہیں، پھر معجزات اور سنہ وفات کی روایتیں ہیں، اس کے بعد احکام و شرائع کے ابواب جدا جدا عنوانات کے تحت ہیں۔ پھر تفسیر قرآن اور اسباب نزول کے ابواب ہیں، باجی کے اعتراضات کا اس میں جواب بھی دیا گیا ہے پورے مجموعہ میں نوسو تینتیس حدیثیں ہیں، صاحب معتصر نے طویل سندیں حذف کر دی ہیں، متعدد طرق و اسناد کی وہی حدیثیں نقل کی ہیں جن میں نمایاں فرق و اختلاف تھا، دو مختلف روایتوں کے صرف اسی حصہ کو نقل کیا ہے جس سے ان کے اصل مدلول اور روایت کا خاص فرق و تضاد ظاہر ہوتا ہے۔

معانی الآثار اس کا نام شرح معانی الآثار بھی ہے۔ یہ امام صاحب کی سب سے اہم اور بلند پایہ کتاب سمجھی جاتی ہے، اس میں فقہ و حدیث دونوں قسم کے مباحث ہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ علمائے فن کے ان اقوال سے ہوتا ہے۔

علامہ ابن حزم ظاہری نے اس کو سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے ہم پایہ قرار دیا ہے[1] شارح ہدایہ امیر اتقانی کا بیان ہے کہ "اگر کسی شخص کو طحاوی کی عظمت شان اور بلند پائیگی میں کلام ہو تو اسے معانی الآثار کا مطالعہ کرنا چاہیئے، حنفی مذہب کا کیا ذکر جملہ مذاہب میں بھی ایسی بے مثال اور بے نظیر کتاب نہیں مل سکتی"[2] علامہ عینی فرماتے ہیں "امام طحاوی کی جملہ تصنیفات نہایت عمدہ اور پراز منفعت

---

[1] تمنی الرسالہ الماجد [2] کشف الظنون ج ۲۔

ہیں خصوصاً معانی الآثار کو اگر کوئی منصف مزاج شخص بغور دیکھے تو وہ اس کو حدیث کی اکثر مشہور و مقبول کتابوں سے برتر و راجح پائے گا۔ سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ اور اس قسم کی دوسری کتابوں پر اس کی فوقیت اور برتری بالکل عیاں ہے کیونکہ اس کے اندر وجوہ استنباط اور معارضات کی شکلیں بیان کی گئی ہیں اور ناسخ و منسوخ میں امتیاز کیا گیا ہے اور اس قسم کے بہت سے مباحث ہیں اور یہی چیزیں معرفت حدیث کی اصل بنیاد ہیں، بعض لوگ طحاوی کی مرجوحیت کا یہ سبب بتاتے ہیں کہ اس کے کچھ رجال ضعیف اور مرتبۂ ثقاہت سے فروتر ہیں۔ حالانکہ سنن مذکورہ کا بھی یہی حال ہے بلکہ ان کی بعض روایات کو باطل اور موضوع بھی کہا جاتا ہے اور ضعیف حدیثوں کی تو کثرت ہے۔ سنن دارقطنی، بیہقی اور دارمی وغیرہ کا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہیں، اس کتاب کی اہمیت و عظمت کے مخفی رہ جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ عام لوگوں میں مروج نہ تھی اس لئے اس کے عجائب کا نہ تو استخراج کیا جاسکا اور نہ غرائب سے واقفیت حاصل کی گئی۔ یہ کتاب ایک طویل عرصہ تک گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی اور عام لوگ اس سے بے خبر تھے[1]۔ مولانا انور شاہ کشمیری کا بیان ہے کہ ہمارے نزدیک طحاوی کی مشہور کتاب معانی الآثار کا پایہ ابوداؤد کے قریب قریب ہے کیونکہ اس کے تمام رواۃ معروف و مشہور ہیں، گو بعض کے متعلق کلام بھی کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ترمذی اور ابن ماجہ کا درجہ ہے[2]۔"

اس کا مقصد تالیف خود امام طحاویؒ نے یہ بیان کیا ہے۔

" مجھ سے میرے بعض احباب نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احکامی روایات و آثار کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کی فرمائش کی تاکہ ناسخ و منسوخ اور واجب العمل روایات سے قلت واقفیت کی بنا پر ملحدین اور ضعیف الاسلام لوگوں کا یہ وہم دور ہوجائے کہ ان میں تضاد و اختلاف ہے۔ اس لئے اس کتاب میں ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید اور واجب العمل روایات نیز علماء کی تاویل و توجیہہ، ان کے دلائل و شواہد اور مرجح و محقق مسلک کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

---

[1] ماتمس الیہ الحاجہ [2] فیض الباری ج ۱۔

ترجیح کے دلائل و وجوہ بھی نقل کئے گئے ہیں اور ثبوت و تائید میں کتاب و سنت، صحابہ و تابعین کے آثار اور اجماع وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے[1]۔

امام طحاوی نے اس کتاب میں مختلف حیثیتوں سے احادیث کا تضاد و اختلاف دور کیا ہے اور ان کے محمل کی ایسی تعیین کی ہے جو روایات و قیاس کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے۔ طریقہ تصنیف یہ ہے کہ پہلے اختلافی امور و مسائل میں مرجوح مسلک کی موید روایات نقل کی ہیں، اس کے بعد اس سے مختلف اور راجح مسلک کی حدیثیں اور ان کے مویدات ذکر کر کے دونوں میں محاکمہ اور ہر مذہب کے دلائل و شواہد اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ روایات کا ظاہری اختلاف بھی رفع ہو گیا ہے اور ان میں مکمل تطبیق بھی ہو گئی ہے انہوں نے توجیہ و توفیق کے مندرجہ ذیل اصول اختیار کئے ہیں:

(۱) دو قسم کی متضاد سمجھی جانے والی حدیثوں میں ایک قسم کو اولویت پر اور دوسری قسم کو غیر اولویت پر محمول کر کے فرق و تضاد کی نفی کی گئی ہے۔

(۲) احادیث مختلفہ کو مطلق و مقید، مجمل و مفصل اور خاص و عام وغیرہ پر محمول کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں۔

(۳) ناسخ و منسوخ روایات کی تعیین اور ان میں امتیاز کر کے تعارض کو دفع کیا گیا ہے۔

(۴) اگر صحیح الاسناد اور قوی روایات ضعیف اور کمزور حدیثوں کے معارض ہوں تو پہلی قسم کی حدیثوں کو قابل اختیار سمجھا جائے گا اور دوسری قسم کی حدیثوں کی یا تو توجیہ کی جائے گی یا مناسب توجیہ نہ ہونے کے وقت ان کو رد کر دیا جائے گا۔

(۵) اگر کوئی روایت کسی متواتر حدیث کے خلاف ہو تو متواتر کے مقابلہ میں غیر متواتر روایت کو ساقط قرار دیا جائے گا۔

(۶) اصول و کلیات شرع کے معیار پر حدیثوں کا جائزہ لے کر ان کی ایسی توجیہ کی گئی

---

[1] معانی الآثار ج ۱

کہ ظاہری اختلاف ختم ہو گیا ہے۔

معانی الآثار میں اکابر ائمہ احناف یعنی امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے آراء و مسالک کو نقل کرنے کا زیادہ التزام کیا گیا ہے اور ان بزرگوں کے اقوال کی حدیثوں سے مطابقت بھی دکھائی گئی ہے۔ تاہم دوسرے اکابر فقہاء امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری ابن ابی لیلیٰ اور فقہائے احناف میں امام زفر کے مذاہب کی بھی کہیں کہیں تصریح کی گئی ہے۔ اور فقہائے صحابہ و تابعین کے مذاہب بھی نقل کئے گئے ہیں۔

اس کتاب کی اہمیت کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو اس کی تحقیقی و استدلالی شان اور فقیہانہ و مجتہدانہ رنگ ہے۔ امام صاحب حنفی ہونے کے باوجود خود بھی مجتہد اور صاحب نظر تھے۔ اس لئے انہوں نے مختلف فیہ امور و مسائل میں محاکمہ کر کے مرجح و مختار مسلک کی نشاندہی کی ہے اور عموماً نہایت تنقیح اور پوری تحقیق کے بعد ہی کسی مسلک کو مرجح قرار دیا ہے یہاں تک کہ اپنے ائمہ سے بھی بعض مواقع پر اختلاف کیا ہے۔

روایات کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش میں بھی بڑی دیدہ ریزی اور دقت نظر سے کام لیا گیا ہے، ان کے متون و طرق کی معرفت، اسناد کا جائزہ، رجال و رواۃ کی تحقیق، رطب و یابس حدیثوں میں امتیاز، ارسال، انقطاع و وقف اور رفع و اتصال کی نشاندہی اور روایت کے علاوہ درایت کے لحاظ سے بھی حدیثوں کو پرکھا گیا ہے۔

معانی الآثار میں حدیث و فقہ کے علاوہ تفسیر و قرأت کی بعض لطیف بحثیں بھی ہیں مشہور مفسرین صحابہ و تابعین اور ائمہ تفسیر و قرأت کے اقوال، ممتاز و مرجح قرأت و تفسیر کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور سنت و حدیث کی طرح قرآنی آیات سے استنباط مسائل کیا گیا ہے۔ سیر انساب اور ایام و مشاہد کا بھی ایک حد تک حسب موقع ذکر ملتا ہے۔ ابواب کی ترتیب و مطالب کی افادیت اور انداز بیان کے لحاظ سے بھی یہ ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

خصوصیات (۱) اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احادیث و آثار کا تضاد

Marfat.com

ثابت کیا گیا ہے اور جو حدیثیں بظاہر باہم مختلف و متناقض معلوم ہوتی ہیں ان کی بنایت مناسب اور دلنشین توجیہہ و تطبیق بیان کی گئی ہے۔

(۲) گو اساطین احناف کے مسالک کے نقل کا زیادہ التزام کیا گیا ہے لیکن دوسرے فقہاء و مجتہدین کے اقوال اور خصوصاً صحابہ و تابعین کے آثار و فتاوے کی بھی صراحۃً نشاندہی کی گئی ہے۔

(۳) اقوال مختلفہ میں تطبیق اور ان کے دلائل کی تشریح کر کے مرجح مسلک کی تعیین کی گئی ہے۔

(۴) مختلف طرق، تعدد اسناد، روایت اور راوی کی قوت و ضعف کے اسباب و ناسخ و منسوخ مطلق و مقید اور خاص و عام کی وضاحت نیز علمائے جرح و تعدیل کے اقوال کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

(۵) معانی الآثار کی بعض حدیثوں سے دوسری کتب احادیث خالی ہیں۔

(۶) وضع و ترتیب کی خوبی، انداز بیان اور طرز ادا کا حسن و دلآویزی۔

معانی الآثار پر اعتراض اور اس کا جواب معانی الآثار کی ان خصوصیات اور اہمیتوں کے باوجود اس پر بعض اعتراضات بھی کئے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اعتراض امام بیہقیؒ کا ہے کہ امام طحاویؒ نے ان حدیثوں کی جو عام محدثین کے نزدیک صحیح ہیں مگر احناف کے مسلک کے خلاف ہیں. تضعیف اور ان روایتوں کی جو محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں مگر احناف کے مسلک کی موید ہیں تصویب کی ہے۔ لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں. اس کا جواب پہلے گذر چکا ہے کہ امام طحاویؒ حنفی ہونے کے باوجود مجتہد بھی تھے اور اپنی انصاف پسندی کی وجہ سے بعض مسائل میں احناف کے مسلک کے مخالف حدیث ہونے کی وجہ سے مرجوح سمجھتے ہیں اور اگر کہیں ایسا واقعی ہوا ہے تو اس کی مثالیں دوسرے مذاہب کے ائمہ کے یہاں بھی ملتی ہیں. اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے "امام بیہقی کی اس امام عظیم کی شان میں جس پر اکابر علما و مشائخ نے اعتماد کیا ہے یہ کھلی ہوئی زیادتی ہے۔" حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں "امام طحاوی کی شان سے یہ بعید اور ان کی عظمت کے منافی ہے۔ بخدا

Marfat.com

مجھ کو اس کتاب میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جو امام بیہقی نے اس کے بارے میں کہی ہے"۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ "کسی عاقل و منصف مزاج شخص کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امام طحاوی نے قرآن و احادیث نبویہ سے استنباط احکام کیا ہے[1]"۔

امام بیہقی کی تردید میں علاؤ الدین ترکمانی نے الجواہر النقی والرد علی البیہقی کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے[2]۔

معانی الآثار پر اعتراض کرنے والوں میں ایک ممتاز نام شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کا ہے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صحاح کے مقابلہ میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالحیٔ لکھنوی کی یہ رائے نقل کر دینا کافی ہے کہ "میں ابن تیمیہ کے متعلق وہی بات عرض کروں گا جو شیخ صالح نے حافظ ابن حجرؒ کے بارے میں کہی ہے کہ" ان کا موطا اور صحیح میں تفریق اور موطا کی صحت سے انکار صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے موطا میں اس امعان نظر سے کام نہیں لیا ہے جس امعان نظر سے بخاری میں کام لیا ہے ورنہ ان کو موطا کی اہمیت سے انکار نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر امام ابن تیمیہؒ نے بھی صحاح ستہ کی طرح معانی الآثار پر گہری نظر ڈالی ہوتی تو وہ طحاوی اور دیگر صحاح کے درمیان اس طرح تفریق روا نہ رکھتے، بلکہ ابن حزم کی طرح جو اگرچہ اپنے تعنت کے لئے مشہور ہیں اس کی عظمت کا اعتراف کرتے[3]"۔

معانی الآثار کی صحت اور اس کے رجال وغیرہ کے بارے میں بعض لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے شارح ہدایہ امیر اتقانی لکھتے ہیں:

میرے نزدیک امام طحاوی پر ان لوگوں کے اعتراض و انکار کے کوئی معنی نہیں ہیں اس لئے کہ وہ معتمد و ثقہ ہیں اور متہم نہیں ہیں اس کے علاوہ ان کا علمی پایہ بلند اور مرتبہ اجتہاد مسلم ہے۔ ورع و تقویٰ کے لحاظ سے بھی وہ فائق تھے اور مذاہب فقہ سے واقفیت میں بھی شرف و تقدم رکھتے تھے.... اگر تم کو ابو جعفر کے فضل و کمال میں شک ہو تو ان کی کتاب شرح معانی الآثار

---

[1] کشف الظنون ج ۲ و ماتمس الیہ الحاجہ [2] تقریبا [3] معانی الآثار ج ۲ [4] ماتمس الیہ الحاجہ

کا مطالعہ کرو، اس کی حنفی مذہب تو کجا کسی مذہب میں بھی کوئی نظیر اور مثال تم کو نظر نہ آئے گی[1]۔

شروح تلخیصات معانی الآثار کی اہمیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علماء نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے وہ نصاب درس میں شامل کی گئی ہے اس کے شروح وحواشی لکھے گئے اور تلخیص بھی کی گئی۔ ذیل میں اس کی شرحوں اور تلخیصات کی فہرست درج کی جاتی ہے:

(۱) علامہ بدرالدین عینی (م ۸۵۵ھ) کو اس کتاب سے بڑا شغف تھا۔ انہوں نے ایک عرصہ تک اس کا درس بھی دیا اور اس کی دو شرحیں مبانی الاخبار اور نخب الافکار کے نام سے لکھیں دونوں کے نسخے دارالکتب المصریہ میں موجود ہیں۔ پہلی کتاب آٹھ جلدوں میں اور دوسری چھ جلدوں میں ہے۔ ان کے علاوہ انہوں نے طحاوی کے رجال پر بھی ایک مستقل کتاب معانی الاخبار فی رجال معانی الآثار دو جلدوں میں لکھی اس کا ناقص نسخہ بھی دارالکتب المصریہ میں پایا جاتا ہے[2]۔ زاہدی کا بیان ہے کہ عینی نے طحاوی پر بخاری سے کم کام نہیں کیا ہے[3]۔

(۲) شیخ قاسم بن قطلوبغا حنفی (م ۸۷۹ھ) نے الایثار برجال معانی الآثار لکھی جو طحاوی کے رجال پر نہایت مفید کتاب ہے[4]۔

(۳) ابوالحسین محمد بن محمد باہلی مالکی (م ۳۲۱ھ) نے شرح تصحیح معانی الآثار جس کے متعلق بروکلمان نے لکھا ہے کہ بنکاک میں محفوظ ہے[5]۔

(۴) حافظ ابومحمد علی بن زکریا منبجی مولف لباب (م ۶۹۸ھ) بھی اس کے مشہور شارحین میں ہیں ان کی شرح کا ایک جزء آستانہ کے مکتبہ ایاصوفیا میں موجود ہے[6]۔

(۵) حافظ عبدالقادر قرشی (م ۷۷۵ھ) نے الحاوی فی تخریج احادیث معانی الآثار لکھی جو بڑی عمدہ اور مفید شرح ہے۔ اس میں مصنف نے طحاوی کی حدیثوں اور سندوں کا صحاح مشہور مسانید اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ سے تعلق اور نسبت ظاہر کی ہے اس کا ایک جزء دارالکتب

---

[1] مقدمہ تحفۃ الاحوذی [2] الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی وفہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ [3] الحاوی

[4] کشف الظنون ج ۲ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی [5] ایضاً [6] الحاوی۔

المصریہ میں موجود ہے[1]۔

(۶) حافظ ابو عمر بن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) نے جو طحاوی کے بڑے عظمت شناس اور اکثر اپنی کتابوں میں ان کا حوالہ دیتے ہیں تلخیص کی ہے[2]۔

(۷) حافظ ابو محمد عبداللہ بن یوسف زیلعی صاحب نصب الرایہ (م ۷۶۲ھ) کی تلخیص مکتبہ رواق اتراک اور مکتبہ کوبریلی میں محفوظ ہے[3]۔

(۸) شیخ الاسلام حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) نے اتحاف المہرہ میں اس کے اطراف کو جمع کیا ہے[4]۔

(۹) شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسفؒ صاحب دہلوی نے عربی میں شرح امانی الاخبار فی شرح معانی الآثار لکھی ہے۔ اس کی دو جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں۔

معانی الآثار کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ ۱۳۰۲ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے اس کو لمبی تقطیع کی دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ دونوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد نو سو ہے۔ مولانا وصی احمد دہلوی نے اس پر مختصر حواشی تحریر کئے ہیں۔ ان میں الفاظ و لغات کی تحقیق، اسماء و اعلام کی مختصر تشریح اور دوسرے نسخوں کے اختلاف کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] الحاوی و فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ا [2] الحاوی [3] ایضاً [4] ماتمس الیہ الحاجہ

Marfat.com

تذکرۃ المحدّثین

جلد اوّل

مُرتّبہ

مولوی ضیاء الدین اصلاحی

نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد

لاہور - راولپنڈی - ملتان - کراچی - سکھر - پشاور - کوئٹہ

Marfat.com